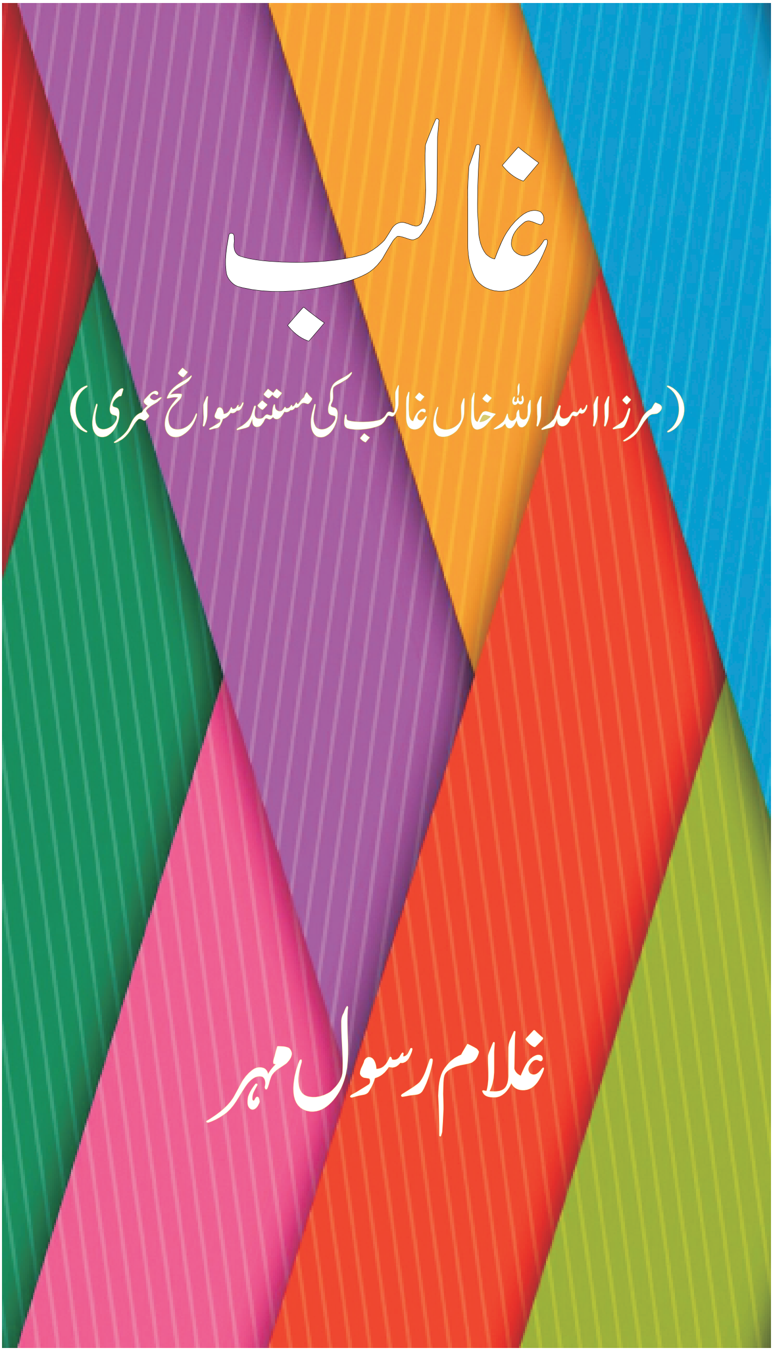

# غالب

## (مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مستند سوانح عمری)

غلام رسول مہر

جملہ حقوق محفوظ

# غالب

یعنی

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؒ کی
ایک مستند سوانح عمری جو خود میرزائے ممدوح کے
کلام نظم و نثر سے ماخوذ ہے

از

## غلام رسول مہر بی۔ اے

مدیر روزنامہ انقلاب لاہور

مسلم پرنٹنگ پریس۔ لاہور

# فہرست مضامین

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | پہلا باب | پیدایش، نام و نسب، خاندان اور تعلیم | ۱ |
| ۲ | دوسرا باب | شادی، اور خانگی زندگی اور متعلقین | ۲۶ |
| ۳ | تیسرا باب | دہلی میں سکونت اور مکان | ۵۰ |
| ۴ | چوتھا باب | سفر کلکتہ | ۵۸ |
| ۵ | پانچواں باب | رام پور اور میرٹھ کے سفر | ۸۴ |
| ۶ | چھٹا باب | پنشن کا مقدمہ | ۹۸ |
| ۷ | ساتواں باب | ابتلا و اسیری | ۱۲۴ |
| ۸ | آٹھواں باب | مالی حالات۔ مدح گوئی اور صلہ یابی | ۱۳۴ |
| ۹ | نواں باب | داستان غدر | ۱۷۰ |
| ۱۰ | دسواں باب | پنشن کے حصول کے لئے سعی و سفارش | ۲۲۷ |
| ۱۱ | گیارھواں باب | عوارض اور وفات | ۲۴۳ |
| ۱۲ | بارھواں باب | اخلاق و عادات اور متفرق حالات | ۲۵۸ |
| ۱۳ | تیرھواں باب | تصانیف | ۲۹۳ |
| ۱۴ | چودھواں باب | کلام، طریق اصلاح اور مشاعرے | ۳۵۱ |

CHECKED-2002

## تصاویر

(۱) غالب
(۲) غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط
(۳) مزار غالب
(۴) نواب علاؤالدین احمد خان کے نام وثیقہ جانشینی

# تقریب

آج سے بیس سال پیشتر ایک مجلس عزا میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جناب امام اور ان کے رفقا کے عالی مقام کے مناقب بیان کیے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک گوشے سے کوئی خوش عقیدہ مسلمان پکار اٹھا یلیتنی کنت معہم۔ معاً خیال آیا نفس بشری کا یہ لازمی خاصہ ہے۔ بڑے آدمیوں کے محاسن اور ان کے کارناموں کا حال سن کر بے اختیار تمنا پیدا ہوتی ہے۔ کاش ہم ان کے زمانے میں ہوتے!

انسان دوسرے انسان کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مرعوب و متاثر ہوتا ہے لیکن چونکہ انسان ہے۔ اس لئے "مس انسانی" چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ کہ وہ بڑا آدمی کہاں رہتا تھا کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اس کے عام مشاغل کیا تھے طبیعت کی کیفیت کیا تھی۔ زندگی کے واقعات سے کیوں کر متاثر ہوتا تھا۔ کیا کھاتا تھا۔ کیا پیتا تھا۔ کیا پہنتا تھا۔ اس کی شکل و صورت کیسی تھی۔ قد و قامت کا کیا حال تھا۔

نفس بشری کا یہ تقاضا اس قدر قدیم ہے۔ کہ اس کا سراغ آدم اول تک لگایا جا سکتا ہے جب حضرت ابوالبشر کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ان کے پوتوں پڑپوتوں کے سامنے بڑے باوا کے حالات بیان کرتے ہوں گے۔ کہ بڑے میاں کس طرح جنت الفردوس سے زمین پر گرائے گئے۔ پھر انہوں نے کس طرح حوا کی رفاقت و اعانت سے اس زمین کو رہنے کے قابل بنایا۔ کیوں کر اس سے خوراک حاصل کی کیوں کر درندوں کا مقابلہ کیا۔ اور ایک ہزار برس تک اس خاکدان تیرہ پر کیوں کر تمدن انسانی کی بنیادیں استوار کرتے رہے۔ تو یقیناً وہ بچے بڑے باوا کے حالات اور کارنامے سن کر پکار اٹھتے ہوں گے کہ کاش ہم بڑے میاں کے زمانے میں ہوتے۔

اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سرکار دو عالمؐ کی حیات طیبہ پر غور کرو۔ دنیا میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی معیت کی خواہش کروڑوں انسانوں کے قلوب میں حضورؐ سے زیادہ تو درکنار حضورؐ کے برابر ہی پیدا ہوئی ہو۔ اور جس کے اعمال و اقوال کی جمع آوری میں اس قدر عظیم الشان اہتمام کیا گیا ہو۔

ساتویں صدی کے آغاز سے آج تک پدموں اور سنکھوں مسلمان اس دنیا میں آباد رہ چکے ہیں۔ اور ایک ایک کے

قلب کی سب سے بڑی تمنا یہی رہی ہے۔ کہ اے کاش میں سرکارِ دو عالم کے زمانے میں ہوتا۔ حضورؐ کے ارشادات اپنے کانوں سے سنتا۔ حضورؐ کی طلعتِ مقدس کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا۔ حضورؐ کی محفل میں بیٹھتا۔ حضورؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتا۔

یہی عالمگیر تمنا تھی جس نے لاکھوں تابعی پیدا کر دیئے۔ جو رات دن صحابہؓ کرام سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایک ایک تفصیل کرید کرید کر پوچھتے رہتے تھے! اور ان کے بعد لاکھوں تبع تابعین پیدا ہو گئے۔ جو تابعیوں سے استفسار کر کے اسی جذبہ کی تسکین کا اہتمام کرتے تھے۔

یہی عالمگیر تمنائے معیتِ رسولؐ تھی جس نے حدیث و سنّت کے بے پناہ ذخائر و سفائن فراہم کرا دیئے! اور حضورِ سرورِ کائناتؐ کے حالات و خیالات کی تدوین اس طرح کر دی۔ کہ پڑھنے والا محسوس کرنے لگا۔ کہ وہ حضورؐ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ چونکہ قرآن مجید نے حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ کو ہر مسلمان کے لئے اُسوۂ حسنہ بھی قرار دے دیا تھا اس لئے یہ چیز مسلمان کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کا سب سے بڑا سرمایہ بن گئی۔ لیکن یقین جانیئے۔ فراہمی احادیث و سنن کی "نفسیاتی وجہ" محض یہ ہے۔ کہ مسلمان کا قلب اپنے آقا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متعارف ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ تفصیل مہیا کی گئی۔ اور ایک عظیم الشان انسان کے افعال و اقوال کا وہ "عظیم الشان ریکارڈ" فراہم ہو گیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

(سوانح نگاری اسی تمنائے معیت کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے معیت کی خواہش کا پورا ہونا تو محالِ عقلی ہے۔ اس لئے کہ جو پانی دریا میں بہہ چکا۔ وہ واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اور جو انسان موت کے گھاٹ اتر چکا۔ وہ دوبارہ نہیں آ سکتا۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ "رفتگان" کے حالات مختلف ماخذوں سے اس طرح فراہم کئے جائیں۔ کہ پڑھنے والے اُن سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں۔ اور ان کی واقفیت اس درجے تک پہنچ جاتے۔ کہ اگر وہ سچ مچ صاحبِ سوانح کی زندگی میں موجود ہوتے۔ تو اس سے بہتر واقفیت نہ حاصل کر سکتے۔ اس لئے سوانح عمری کی عمدگی کا معیار یہ قرار پایا۔ کہ وہ پڑھنے والوں سے صاحبِ سوانح کا تعارف مکمل کر دے۔ اور انہیں محسوس ہو۔ کہ گویا وہ صاحبِ سوانح کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سوانح عمری کی دو قسمیں قرار پائیں۔ اوّل سوانح عمری۔ دوم خود نوشت سوانح عمری۔ سوانح عمری تو وہ ہے جسے صاحبِ سوانح کا کوئی دوست آشنا یا عقیدت مند لکھے! اور "خود نوشت سوانح عمری" وہ ہے جسے صاحبِ سوانح خود ہی لکھتا چلا جائے

استناد کے اعتبار سے دوسری قسم زیادہ بہتر سمجھی جاتی ہے لیکن ماہر نفسیات اس پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ممکن ہے صاحب سوانح بعض مصالح سے بعض ایسے واقعات حذف کر گیا ہو جن کا جمہور کے سامنے آ جانا بے حد ضروری تھا۔ اپنی ذاتی کمزوریوں کو من و عن بیان کر دینا بے حد دشوار ہے۔ اور ”پیپیز“ اور ٹالسٹائی اور گاندھی نے اپنی خود نوشت سوانح عمریوں میں اپنی کمزوریوں کا جو حال لکھا ہے، اس پر بھی نقادِ نفسیات کو پورا اطمینان نہیں ہوتا۔

مہر صاحب نے سوانح عمری کی ایک تیسری قسم ایجاد کی ہے۔ کہ صاحب سوانح کے کلام نظم و نثر اور اس کی نجی تحریروں سے اس کے حالات زندگی فراہم کئے ہیں جن کی صداقت سے کوئی دوسرا شخص تو درکنار۔ خود صاحب سوانح بھی انکار نہیں کر سکتا اور یہ ایک ایسا درجۂ استناد ہے جس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آ سکتا۔ اب اس کا فیصلہ خود کر لیجئے۔ کہ یہ مہر صاحب کا کمال ہے یا مرزا غالب کا۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اگر مرزا غالب ایسے اچھے اور جامع رقعات نہ لکھ جاتے۔ تو مہر صاحب سوانح نگاری میں اتنے زیادہ کامیاب نہ ہوتے لیکن مہر صاحب کا شرف یہ ہے۔ کہ انہوں نے اس مواد سے وہ فائدہ اٹھایا جس کی توفیق مرزا کے عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی نہ ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ خواجہ حالی مرحوم بھی معیت اور واقفیت کے باوجود اس سے پورا استفادہ نہ کر سکے مہر صاحب کی یہ کتاب پڑھنے سے وہ تمنا کہ کاش ہم مرزا غالب کے عہد میں ہوتے بہت بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں غالب (رقعہ نگار اور شاعر اور انسان غالب) کے متعلق اتنی باتیں تحقیقی طور پر معلوم ہو گئی ہیں۔ کہ شاید غالب کی معیت معاصرت کی حالت میں بھی معلوم نہ ہو سکتیں

مہر صاحب میں دو خوبیاں بیک وقت مجتمع ہو گئی ہیں۔ کہ وہ ادب کا نہایت بلند اور سلجھا ہوا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اور تحقیق و تفتیش کے معاملے میں بھی انتہا درجے کے محتاط ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس کتاب کا انداز تحریر بے تکلف اور بے تکان اور دلنشیں بھی ہے۔ اور واقعات کی صحت بھی مواد حاصلہ کے اعتبار سے کالاً مستند ہے۔

بہرحال میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو بہت زیادہ منتظر رکھنا ظلم سمجھتا ہوں۔ خدا کرے مہر صاحب کے اس قابل رشک ادبی کارنامے کو حسن قبول حاصل ہو اور ابنائے زمانہ مرزا کے فارسی و اردو کلام نظم کے ساتھ ساتھ ان کے رقعات کا مطالعہ بھی فرض قرار دیں۔ میری تمنا ہے۔ کہ مرزا کے رقعات نئے سرے سے مرتب کئے جائیں۔ اور اگر یہ کام بھی مہر صاحب کے ہاتھوں انجام پائے تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے۔

یکم جون ۱۹۳۶ء

عبدالمجید سالک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تمہید

در بزم غالب آئے و بہ شعر و سخن گرائے
خواہی کہ بشنوی سخن نا شنودنی

کم و بیش (۲۵) پچیس برس ہوئے جب غالب سے شناسائی کی ابتدا ہوئی تھی۔ اور شناسائی کا ذریعہ اردو کا وہ مختصر سا دیوان تھا جو تین چار آنے میں بازار سے ملتا تھا۔ شاید اب بھی ملتا ہو۔ جبکہ دیوان غالب پانچ پانچ دس دس، پندرہ پندرہ بلکہ دو دو سو روپے کے ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو رہے ہیں۔ میں سکول میں پڑھتا تھا شعر گوئی کا شوق تھا اور ہم چند دوست جن میں سے ایک مولانا عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری ہیں۔ کوئی ایک طرح تجویز کر کے غزلیں لکھا کرتے تھے۔ غالب کا دیوان پڑھنا شروع کیا تو اس کے بعض اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس زمانے میں میرے ایک شفیق استاد مولانا حکیم محمد سلیم صاحب سلیم مرحوم (بستی نندان، جالندھر) تھے۔ جو عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے اجل عالم تھے۔ چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے بہت بڑے فاضل تھے۔ جفر اور نجوم میں بھی نہایت عمدہ دستگاہ رکھتے تھے۔ خطاطی و خوشنویسی کے مختلف اصناف پر حاوی تھے۔ تمام علوم و فنون متداولہ شرقیہ میں مہارت تامہ کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے طبیب تھے لیکن ان کا علم و فضل صرف اس وجہ سے ظاہر نہ ہو سکا کہ وہ نا و نوش کے بہت عادی ہو گئے تھے۔ اور ان کا زیادہ وقت سرخوشی کے عالم میں گزرتا تھا۔ وہ خود بھی تنہائی، علیحدگی، اور خلوت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور عام لوگوں سے ملنا یا علمی مجالس میں جانا انہیں مرغوب نہ تھا۔ جب بھی علمی باتیں سنانے بیٹھ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضائل متنوعہ کا دریا موجزن ہے۔ اس قسم کی صحبتوں میں خود ہی کبھی کبھی بے اختیار پکار اٹھتے تھے۔ ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ان سے دیوانِ غالب پڑھا تو دل میں وہ جذبۂ عقیدت و نیاز پیدا ہوا جسے اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ اب بھی میں اپنے ذوقِ ادب کے کلبۂ تاریک کی شمعِ فروزاں سمجھتا ہوں میں سکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر اعلٰے تعلیم کے لئے لاہور چلا آیا۔ مولانا تسلیم تھوڑی مدت کے بعد وفات پا گئے۔ اللہ تعالےٰ کی رحمتِ لایزال کے دروازے ان پر کھلے رہیں۔ انہی کی آغوشِ علم و فضل میں میرے دل و دماغ نے ہوش کی آنکھ کھولی اور انہی کے دبستانِ لطف و نوازش میں میں نے عشقِ غالب کا پہلا سبق پڑھا۔

کالج میں پہنچ کر میں نے مولانا حسرت موہانی کی شرحِ غالب دیکھی جس نے غالب کی ذات کے ساتھ حُسنِ عقیدت اور جوشِ نیاز کے اس جذبہ کو زیادہ مستحکم و پختہ کر دیا جو مولانا تسلیم مرحوم کی فیض بار صحبت میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں حالات نے مجھے اخبار نویسی کے دائرے میں پہنچا دیا۔ جہاں ذوقِ علم و ادب کے اس نادر الوجود پیکر کے ساتھ رابطۂ محبت و مودت استوار ہوا جس کی رفاقت و معیت میری حیاتِ مستعار کا عزیز ترین سرمایہ بننے والی تھی۔ میرا اشارہ برادرِ مکرم مولانا عبدالمجید خاں صاحب سالک کی طرف ہے۔ جو چودہ برس سے میرے حقیقی بھائی کے برابر عزیز، میرے ہر رنج و راحت کے رفیق، خدمتِ عامہ کے میدان میں میرے ہر قابلِ توجہ اندوختۂ عمل کے لئے عند الخلق مجھ سے بڑھ کر مستحقِ تحسین اور عند اللہ مجھ سے بڑھ کر مستحقِ اجر ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہر حال میں ان کا حامی و ناصر ہو۔

میں ہوش سنبھالتے ہی کسی دوسرے شاعر کی عقیدت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے بغیر غالب کا معتقد بن گیا تھا لیکن سالک صاحب اپنے ذوقِ صحیح کی رہنمائی میں مختلف مراحل سے گزر کر غالب کے آستانہ پر پہنچے تھے۔ میری عقیدت اجتہاد و تحقیق کے جوہر سے معرا تھی۔ میں نے صرف غالب کو دیکھا تھا اور کسی دوسرے سے شناسائی و معرفت حاصل نہیں کی تھی لیکن سالک صاحب کی عقیدتِ غالب ادبِ اردو کے سارے اندوختہ کی اچھائیوں اور برائیوں کے ہمہ گیر و ہمہ رس اندازہ کے بعد صورت پذیر ہوئی تھی۔ شرعی اصطلاح میں میری حیثیت "عامی مقلد" کی تھی لیکن سالک صاحب "محقق و مجتہد" کے مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے یا تصوف کی زبان میں، میں "مجذوب" تھا اور وہ "سالک" تھے۔ اس "محقق" رفیقِ عزیز کی مستقل صحبت نے غالب کے متعلق میرے معتقدات میں بصیرت کی روشنی پیدا کی اور مولانا تسلیم کے دستِ فیض سے

جس عقیدت کا سنگ بنیاد رکھا تھا اسے سالک صاحب کی مجتہدانہ تلقینات نے سربفلک عمارت بنا دیا۔

آج سے چند سال پیشتر تک ہمارا عام شیوہ تھا کہ سیاسیات کے خشک اور بے کیف اشغال سے تھوڑی دیر کے لیے الگ ہو کر غالب یا عرفی یا نظیری کے دواوین لے کر بیٹھ جاتے تھے اور گھنٹوں پڑھتے رہتے تھے۔ تنہائی کی ان پرلطف صحبتوں میں ہم یہ بھی سوچتے رہتے تھے کہ غالب کے کلام بالخصوص فارسی نظم کو زیادہ فروغ دینے اور زیادہ ہر دلعزیز بنانے کی کیا کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں اور عقیدت کی جس دولت سے ہمارے سینے معمور رہتے اسے ہر پڑھے لکھے آدمی کے دامان ذوق میں پہنچانے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ مختلف اوقات میں ہم نے مختلف سکیمیں بنائیں مختلف نقشہ ہائے عمل تیار کئے جن پر کاربند ہونے کے لئے تھوڑی سی فرصت و مہلت کے آرزومند تھے لیکن اس نوعیت کی کوئی کتاب ہمارے ذہن میں نہیں آئی تھی جیسی اس وقت ارباب علم کے روبرو پیش کی جا رہی ہے۔

میں نے غالب کے "اردوئے معلّٰی" اور "عود ہندی" کو جستہ جستہ کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن میری نظروں میں ان کی حیثیت معمولی خطوط سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس قسم کے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں ان کی بلندی پایہ اور علو مرتبت کا مدار محض یہ تھا کہ یہ غالب کے خطوط تھے مئی ۱۹۳۵ء میں آنکھوں کی تکلیف سے مجبور ہو کر میں پہاڑ پر گیا۔ تو غالب کی چند کتابیں اس خیال سے اپنے ہمراہ لیتا گیا۔ کہ جب اللہ تعالےٰ آشوب کی بلا سے نجات دے گا تو ان کتابوں سے دل بہلایا کروں گا۔ میری آنکھوں میں آشوب کے دورے ہوتے تھے یعنی دفعۃً آنکھیں سرخ اور متورم ہو جاتی تھیں اور ان میں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ دس بارہ دن کے بعد آرام ہو جاتا تھا (آرام کے معدودے دنوں میں، میں "اردوئے معلّٰی" اور "عود ہندی" کا باقاعدہ مطالعہ کرنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں غالب کے سوانح حیات کا کافی سرمایہ موجود ہے میں نے اپنے ذہن میں چند عنوانات قائم کر لیے اور دوران مطالعہ میں کتابوں کے حاشیے پر جا بجا نشانات لگاتا رہا۔ بعد ازاں غالب کی فارسی تصانیف نظم و نثر پر نظر ڈالی تو مزید حالات ملے نشان کردہ حصوں کو پیش نظر ترتیب کے مطابق جمع کرنا شروع کیا تو خیال تھا کہ "غالب کے خود نوشتہ سوانح حیات" کے نام سے متوسط حجم کا ایک رسالہ مرتب ہو جائے گا لیکن سارے نشان کردہ حصے جمع ہو گئے تو ایک اچھی خاصی کتاب بن گئی لاہور

پہنچ کریں سے ان اشخاص کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں جن کا ذکر غالب کی تصانیف میں آیا ہے تو کتاب میں مزید اضافوں کی ضرورت پیش آئی۔ جسے اب میں اپنی ادبی بے مائگی کے اعتراف کے ساتھ عاجزانہ و نیازمندانہ ارباب علم و ذوق کے روبرو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں خدا کرے یہ ناچیز ہدیہ غالب کی بارگاہ عظمت و جلال کے شایاں سمجھا جاسکے۔

تالیف کتاب کی اس مختصر سی سرگزشت کے بعد نفس کتاب کی نسبت کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ "یادگار غالب" جیسی بلند پایہ کتاب کے بعد سوانح غالب کی ترتیب کیوں ضروری سمجھی گئی؟ مجھے "یادگار" کی بلندی پایہ کے اعتراف میں نہ پہلے کبھی تامل ہوا ہے اور نہ اب تامل ہے۔ اور میں خواجہ حالی مرحوم کے ادنےٰ نیازمندوں میں سے ہوں۔ (یہ بھی واقعہ ہے کہ غالب کو آج ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں "یادگار" کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن "یادگار" اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں ہے۔ اصل کتاب کم و بیش چارسو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن ان چارسو صفحات میں سے غالب کے سوانح حیات کے لئے صرف چھیانوے صفحے نکل سکتے ہیں اور ان چھیانوے صفحوں میں غالب کے سوانح حیات بھی ہیں ان کے کلام کے اقتباسات بھی ہیں۔ لطائف بھی ہیں۔ حالی اور غالب کا باہمی معاملہ بھی ہے۔ اور غالب کے شاگردوں میں سے نواب ضیاءالدین احمد خاں اور نواب مصطفےٰ خاں کے حالات بھی ہیں۔

غالب کی زندگی کے حالات کی تحقیق و فراہمی کے لئے خواجہ حالی کو جو مواقع حاصل تھے۔ وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ خواجہ مرحوم غالب کے عزیز شاگرد تھے۔ تمام شاگردوں میں علم و فضل کے اعتبار سے افضل تھے۔ غالب کے نہایت ہی عزیز اور دیرینہ دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے رفیق تھے۔ اکثر غالب سے ملتے رہتے تھے۔ اور ان کے تمام حالات پوچھتے اور سنتے رہے ہوں گے۔ انہوں نے غالب کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف (بہ استثنائے مکاتیب اردو) پڑھ لی ہوں گی اور جو تحریرات غالب کی زندگی کے واقعات و حالات کا مرقع تھیں ان کے غیر واضح یا کم واضح حصوں کو خود غالب سے واضح کرا لیا ہوگا یا واضح کرا لینا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ "یادگار" ان توقعات کو پورا

نہیں کرائی جو حالی اور غالب کے گہرے تعلقات کی بنا پر اس کتاب سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اگر شاعر و ادیب کے سوانح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصانیف کے فہم میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے جس میں صاحب سوانح نے زندگی گزاری جس کی آغوش میں اس کے خیالات و افکار نے قالب حیات اختیار کیا۔ اور نشو و نما پا کر حروف و الفاظ کا لباس پہنا تو میری ناچیز رائے میں ”یادگار“ کی بلندی پایہ کے اعتراف کے باوجود کہنا چاہیے کہ وہ اس مدعا کی تکمیل کا مرقع نہیں بن سکتی۔ غالب کی تصانیف کے مطالعہ کے دوران میں جابجا جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب کے لیے مشتاق نگاہیں ”یادگار“ کے صفحات کی طرف بے اختیار اٹھتی ہیں تو زیادہ تر ناکام واپس لوٹتی ہیں بلکہ غالب کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد ”یادگار“ کا مطالعہ کیا جائے تو کئی مقامات پر دل یہ اثر قبول کرتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت غالب کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیش نظر نہ تھیں۔ لہٰذا ان سے بعض حیرت انگیز سہو سرزد ہوئے جن کی تفصیل آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔

میں نے کوشش کی ہے کہ غالب کے زیادہ سے زیادہ حالات یکجا ہو جائیں اس کی زندگی کے مختلف حصوں کے متعلق اتنی تفصیلات فراہم ہو جائیں کہ کسی صاحب ذوق کو کسی حصے کے متعلق کوئی تشنگی محسوس نہ ہو۔ اس بات کا فیصلہ قارئین کرام پر ہے کہ میری یہ ناچیز سعی جس کا دائرہ بہ ہر حال بہت ہی محدود تھا کس حد تک مشکور ہوئی (میرے بیانات زیادہ تر خود غالب کی تحریرات پر مبنی ہیں۔ اس لئے اس کتاب کو ایک لحاظ سے غالب کی تزک کہا جا سکتا ہے البتہ تشریحات میری ہیں جن کے لئے مجھے سینکڑوں غیر معروف اور بے حد کمیاب کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ جہاں جہاں غالب کے بیانات محل نظر معلوم ہوئے ہیں میں نے ان کے عدم قبول کے وجوہ ظاہر کر دیے ہیں۔)

میرزا محمد عسکری صاحب کی کتاب ”ادبی خطوط غالب“ میں نے برس ڈیڑھ برس پہلے دیکھی تھی۔ یہ کتاب مختلف معلومات کے اعتبار سے بڑی قابل قدر ہے۔ اپنی کتاب کی ترتیب سے فارغ ہو کر میں نے سرسری طور پر اسے دوبارہ دیکھا تو اس میں بھی جابجا سہو نظر آئے۔ جن کا تفصیلی ذکر آپ کو باب تصانیف میں ملے گا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بڑی محققانہ کتاب ہے لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ مثلاً اس میں مرقوم ہے کہ غالب نے اپنے فارسی دیوان میں جابجا اسد تخلص استعمال کیا ہے[1]۔ حالانکہ غالب کی کچھ اوپر تین سو غزلیات فارسی میں ایک جگہ بھی اسد تخلص نہیں آیا۔ پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا[2]۔ حالانکہ غالب کا مستقل وظیفہ یا خاندانی پنشن نہ شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپے ماہانہ تھی۔ پنشن سرکار انگریزی نے مقرر کی تھی۔ اور فیروز پور جھرکہ کی بقا تک اس سے متعلق رہی۔ بعد ازاں براہ راست انگریزی خزانہ سے متعلق ہو گئی اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپے سال تھی۔ شاہ دہلی سے تاریخ نگاری کے صلے میں جو پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتدا جون ۱۸۵۰ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات کو چالیس برس گزر چکے تھے۔

ان لغزشوں کے اظہار سے میرا مقصود خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ان ارباب علم و فضل کی مساعی مشکور کی قدر و منزلت گھٹاؤں حاشا و کلا مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان بلند پایہ کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی غالب کے متعلق تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔ شاید میری یہ ناچیز کوشش ارباب علم و ذوق کے سامنے تحقیق کے نئے راستے پیش کر سکے۔

غالب کے خطوط اور دوسری تصانیف سے ان حالات کو جمع کرنا آسان نہ تھا میری مشکلات کا صحیح اندازہ وہی صاحب فرما سکتے ہیں جنہیں اس نوعیت کے کاموں کا تھوڑا بہت تجربہ ہے۔ ایک ایک مطلب کے لئے ایک ایک صفحہ کو کھول کھول کر ایک ایک سطر کی تفتیش غیر ممکن ہونے کے علاوہ بقدر صرف وقت مفید بھی نہ تھی نیز میری صحت اس قدر دیدہ ریزی کے لئے مساعد نہ تھی۔ لہذا میں نے زیادہ تر حافظہ اور تحفظات پر اعتماد کیا۔ اور حافظہ ہی کی بنا پر مختلف اصحاب کے نام کے خطوں سے یا دوسری تصانیف سے مختلف مطالب جمع کرتا یا کراتا رہا بہت ممکن ہے بعض ضروری چیزیں نظر انداز ہو گئی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ حالات فراہم ہو گئے ہیں۔

بعض امور کے متعلق مجھے محض قیاسات سے کام لینا پڑا جن میں سے ممکن ہے بعض غلط ہوں یا پورے کے پورے صحیح نہ ہوں لیکن مستند معلومات سامنے نہ ہونے کی صورت میں قیاسات کے سوا چارہ نہ تھا۔

غالب کی تمام تصانیف کے پہلے ایڈیشن مجھے نہ مل سکے اس لئے میں نے مختلف تحریرات کو سامنے رکھ کر ان کی تاریخ ہائے اشاعت کے متعلق بھی قیاس سے کام لیا مجھے یقین ہے کہ یہ قیاسات اگر بالکل صحیح نہ ہوں گے تو صحت سے اقرب ضرور ہوں گے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۱۳۷

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۱۳۷

ابتدا میں میرا ارادہ تھا کہ غالب کے اس کمیاب کلام کو بھی کتاب میں شامل کر دوں جو اب غیر مطبوعہ کلام کی حیثیت اختیار کر چکا ہے نیز غالب کے ادبی و علمی نکات اور لطائف کا بھی ایک بڑا مجموعہ فراہم کر لیا تھا، جسے کتاب کے آخر میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی اور مجھے مجبوراً یہ حصے روکنے پڑے۔ حالات نے مساعدت کی تو انہیں علیحدہ شائع کر دوں گا۔ کتاب کی ضخامت کے بڑھنے ہی کا اندیشہ کلام کے باب میں بھی زیادہ تفصیلی مباحث کا عنان گیر رہا، یہ کمی ان شاء اللہ کسی دوسری شکل میں پوری ہو جائے گی۔

میرا ارادہ تھا کہ اس مرقع کی ترتیب میں جن جن کتابوں سے میں نے فائدہ اٹھایا ان سب کے نام درج کر دوں لیکن یہ فہرست بہت طویل تھی اس لئے اسے نظر انداز کرنا پڑا البتہ کتاب میں غالب کی جن تصانیف کے حوالے آئے ہیں ان کے ایڈیشنوں کی تصریح اس لئے ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عام قارئین کو حوالوں کی تلاش میں کوئی تشویش لاحق نہ ہو۔ ان ایڈیشنوں کی کیفیت درج ذیل ہے:

(۱) کلیات نظم فارسی مطبوعہ نولکشور طبع دوم سنہ ۱۸۹۳ء۔

(۲) کلیات نثر فارسی مطبوعہ نولکشور طبع سوم سنہ ۱۸۸۴ء

(۳) اردوئے معلّٰے مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی سنہ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸

(۴) عود ہندی مطبوعہ نولکشور، جولائی سنہ ۱۹ء

کتاب میں جہاں جہاں ان کتابوں کے حوالے آئے ہیں، ان صفحات کے لئے یہی ایڈیشن ملاحظہ فرمائے جائیں۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد تشکر و سپاس کا فرض ادا کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے مجھے نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنہوں نے باوجود کثرت مشاغل و ہجوم مصروفیات مجھے دو مرتبہ نواب زادہ خورشید علی خاں خلف نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم کے دولت کدہ پر شرف ملاقات بخشا اور گھنٹوں میرے استفسارات کے جواب مرحمت فرماتے رہے وہ اس خاندان کے جلیل القدر فرد ہیں جو شادی کے بعد غالب کا اپنا خاندان بن گیا تھا[1]۔ مسٹر گیرٹ آئی۔ ای۔ ایس سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اور برادرم سالک صاحب کو نہ صرف پرانے ریکارڈ دیکھنے کی اجازت دی بلکہ خود تکلیف فرما کر ہمارے مطلوبہ کاغذات پر نشان رکھ دئیے۔ مسٹر رام لبھایا صاحب لائبریرین پنجاب پبلک لائبریری کا ممنون ہوں جن کی برادرانہ اعانت سے مجھے بعض بے حد کمیاب کتابیں میسر آئیں۔ اور جنہوں نے میرے لاہور آ جانے کے بعد لائبریری کی کتابوں سے

---

[1] نواب علاء الدین احمد خاں کے نام وثیقہ جانشینی بھی حضرت ممدوح ہی کا [illegible] ہے۔

میری سہولت کے مطابق استفادہ کے مواقع بہم پہنچاتے۔ اپنے محترم و شفیق بھائی سید آغا حسین نائب تحصیلدار ساکن جگراؤں ضلع لدھیانہ کا ممنون ہوں جو خان بہادر مولوی سید رجب علی صاحب مرحوم مخاطب بہ ارسطو جاہ کی اولاد میں سے ہیں انہوں نے میری کتاب کا اعلان دیکھ کر غالب کے ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کا عکس مرحمت فرمایا جو اس کتاب کی زینت بنا ہوا ہے۔ آغا حسین صاحب نے مولوی صاحب مرحوم کے مفصل حالات، ان کی دو تفسیریں اور فارسی کلام بھی میرے پاس بھیج دیا تھا۔ ان تفسیروں کا ذکر غالب کے فارسی رقعات موسومہ مولوی صاحب مرحوم میں آیا ہے۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں (لکھنؤ) کا ممنون ہوں جنہوں نے میری درخواست پر غالب کے بعض غیر مطبوعہ مکاتیب کے حصول کے لئے زحمت برداشت فرمائی۔ افسوس کہ ابھی تک یہ سعی کامیاب نہیں ہو سکی۔ مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اورینٹل کالج کا ممنون ہوں جن کے ذریعہ سے غالب کے متعلق بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی مالک "الامان" و "وحدت" دہلی کا ممنون ہوں جو دو روز میرے ساتھ "دیوان غالب" کے ایک نسخے کی تلاش میں پھرتے رہے۔ انہی کی وساطت سے میں خاندان لوہارو کے بعض افراد تک پہنچ سکا۔ اور غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے سکا۔ اپنے عزیز و محترم بھائی شیخ مبارک علی تاجر کتب کا ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کی طباعت کے سلسلے میں میرے لئے متعدد زحمتیں برداشت کیں۔ سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر اپنے عزیز و محترم بھائی مولانا سالک کا ممنون ہوں جنہوں نے ان اوراق پریشان کو شروع سے آخر تک پڑھا اور جن کا علم و ذوق کتاب کی موجودہ ترتیب میں میرا بہترین رفیق و رہنما رہا۔

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتاب کو کسی شخصیت کے انتساب سے مزین کرنے کے شیوہ عام کی پیروی سے طبیعت گریزاں نہ ہوتی تو میں اسے اپنے چھوٹے بھائی چودھری امیر احمد خاں علوی سناور (شملہ) کے نام سے منسوب کرتا۔ اول اس لئے کہ بیماری کے پُر آلام ایام میں سکون کے جتنے لمحے میسر آئے ان کے لئے میں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم کے بعد اپنے بھائی کی سعادت مندی اور خدمت گزاری کا ممنون ہوں۔ اگر مجھے یہ سکون حاصل نہ ہوتا تو میں کتاب مرتب نہ کر سکتا۔ دوم اس لئے کہ وہ مسلسل و متواتر مجھے اس کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ میری تندرستی کے اوقات میں وہ روزانہ اس کا کوئی نیا حصہ سننے کے آرزومند رہتے تھے۔ اس وجہ سے میرے دل میں تکمیل ترتیب کا جذبہ تازہ رہا۔ سوم اس لئے کہ غالب کے ساتھ

گہرے روابط نیاز ہیں بھی وہ میرے شریک ہیں لیکن میں انتسابات کے عام شیوہ کو پسند نہیں کرتا ۔

میں ادیب نہیں ہوں، شاعر نہیں ہوں، نقاد نہیں ہوں، سوانح نگار نہیں ہوں ۔ تمام آپ کی ذات کے ساتھ دیرینہ عقیدت کے جذبۂ مخلصانہ کی سرخوشی میں قلم کے مسافر نے مہینوں کاغذات کے مراحل میں تگ و دو
لطف
کی ہے ۔ خدا کرے اس کی یہ زحمت کشی بالکل عبث نہ سمجھی جائے ۔ اور یہ سفینہ ارباب علم و ذوق کی بارگاہ نوازش سے خلعت قبول پائے آمین ۔

مسلم ٹاؤن ۔ لاہور
۱۰ مئی ۱۹۳۶ء

مہر

K. Rehman Zaki
Mohd Kureshi
16.4.11

مرزا غالب

( عبداللطیف خاں ) کی عنایت سے یہ فوٹو فراہم ہوا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پہلا باب

## پیدائش، نام و نسب، خاندان اور تعلیم

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

**تاریخ پیدائش** اسد اللہ بیگ خاں[1] نام، میرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب، ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ اواخر اکتوبر ۱۷۹۷ء) کو اکبر آباد (آگرہ) میں زینت آرائے عالم وجود ہوئے۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی رئیس لوہارو کو ایک خط میں جو غالباً ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:-

"میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں، اب کے رجب کے مہینے سے اُنہترواں برس شروع ہوا ہے۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب ممدوح ہی کو لکھتے ہیں:-

"قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھے روبکاری کے واسطے یہاں (یعنی دنیا میں) بھیجا۔" (مرقومہ ماہ ذیحجہ ۱۲۷۷ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ

منشی حبیب اللہ خاں صاحب ذکا حیدر آبادی (میر منشی دفتر نواب مختار الملک سر سالار جنگ مرحوم) کو لکھتے ہیں:-

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہترواں برس شروع ہوا ہے (مرقومہ ۲۵ رجب ۱۲۸۱ھ)

نواب میر ابراہیم علی خاں کو ۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہترواں برس شروع ہو گیا۔

---

[1] مرزا کے نام کے اجزاء میں "بیگ" یہاں پہلی مرتبہ چھاپا ہے۔ مقالہ موصوف نے مرزا (عبداللہ بیگ خاں) کی رعایت سے یہ لفظ بڑھا دیا ہے۔

خواجہ غلام غوث خاں صاحب بیخبر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

حضرت میں اب چراغ سحری ہوں رجب ۱۲۸۴ھ کی آٹھویں تاریخ سے اکہتروں برس شروع ہوگیا۔

طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔

دیوان فارسی کے خاتمہ کی نثر میں غالب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک دلچسپ بائی لکھی ہے جس میں دو مادّے نظم کئے ہیں اور دونوں اس نادر روزگار ہستی کی شاعرانہ زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب ہم خوف عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم "شورش شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"

"شورش شوق" اور "غریب" دونوں سے ۱۲۱۲ھ تاریخ نکلتی ہے اور دونوں مادّے غالب کی زندگی کا نہایت ہی صحیح مرقع ہیں۔

نام

نام، عرف اور خطاب کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں جابجا تصریحات ملتی ہیں۔ غالب کی مشہور کتاب "دستنبو" پہلی مرتبہ آگرہ میں منشی شیو نرائن آرام کے مطبع مفید خلائق میں چھپی تھی، اور چھپائی کا سارا انتظام منشی ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے سپرد ہوا تھا۔ غالب ایک خط میں تفتہ کو "دستنبو" کے سرورق کی عبارت کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے رقم فرماتے ہیں :۔

> منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار (سرورق "دستنبو" پر) عرف نہ لکھیں.... اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ ہاں نام کے بعد لفظ بہادر کا اور بہادر کے بعد تخلص، اسد اللہ خاں بہادر غالب

پھر منشی شیو نرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> سنو میری جان، نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی، چنانچہ صاحب بہادر نے جو ان دنوں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے، یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اللازم ہے۔

معلوم ہوتا ہے تفتہ نے پوچھا تھا کہ "اسد اللہ خاں" کے بجائے "محمد اسد اللہ خاں" کیوں نہ لکھا جائے نیز نام سے پہلے "میرزا" لکھا جائے یا "مولانا" یا "نواب"۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

سنو صاحب لفظ مبارک م، ح، م، د (یعنی محمد) کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی محمد اسد اللہ خاں نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزا و مولانا و نواب اس میں سے تم کو اور بھائی (منشی نبی بخش حقیر) کو اختیار ہے جو چاہو لکھو۔

**عرف** عرف کا ذکر غالب نے اپنے اردو دیوان کے دیباچہ کی نثر کے آخر میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

یارب این بوئے ہستی ناشنیدہ، از خویشتن بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش ضمیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم، بہ میرزا نوشہ معروف، بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار بنجفی مدفن باد۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے عرف کے اظہار میں تکلف نہ تھا جس زمانے میں "دستنبو" چھپ رہی تھی منشی شیو نرائن صاحب آرام مالک مطبع مفید خلائق نے غالب کو ایک خط بھیجا تھا جس کے لفافے پر "میرزا نوشہ صاحب غالب" درج تھا۔ غالب کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں "دستنبو" کے سرورق پر بھی یہی عبارت درج نہ ہو جائے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:-

صاحب مطبع (منشی شیو نرائن) کے خط کے لفافہ پر لکھا ہے "میرزا نوشہ صاحب غالب" ذرا غور کرو کتنا بے جوڑ جملہ ہے؟ ڈرتا ہوں کہ صفحۂ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اردو کا یا پنج آہنگ یا مہر نیم روز چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر (آگرہ) میں نہیں پہنچی؟ جو وہ (منشی شیو نرائن) میرا نام دیکھ لیتے؟ تم نے بھی میرا نام انہیں نہ بتایا؟ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ دہلی کے عوام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا پس اگر صاحب مطبع نے میرزا نوشہ لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالب کو عرف پسند نہ تھا شاید شروع شروع میں عرف اس لئے اختیار

کر لیا تھا کہ اس زمانے میں عرف کا عام دستور تھا۔ اور "میرزا نوشہ" عرف اختیار کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ، کا عرف "میرزا دولھا" تھا لیکن جب رنگینیوں اور شباب کی عامیانہ آرائش جوئیوں کا دور گزر گیا اور طبیعت میں متانت و ثقاہت پیدا ہو گئی تو عرف سے عار آنے لگی۔

**مولد سے محبت** | غالب نے اگرچہ ابتدائے شباب ہی میں آگرہ کو چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی لیکن اپنے مولد کی محبت ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ایک دفعہ آگرہ تشریف لے گئے۔ غالب نے انہیں آگرہ خط بھیجا۔ دیکھئے اس میں اپنے مولد کے ساتھ والہیت کا کس طریق پر اظہار کرتے ہیں:—

جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد یعنی آب و ہوائے اکبرآباد بہ شما سازگار باد........

گرفتم کہ خود را بہ سفر گرفتہ و نزدیک خود از من دورتر رفتہ اید اما چوں ہنوزم در وطن اید بہانا کہ نزدیک با من اید۔ شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر بہ شما فرستاد تا ہم دریں نزہت داد شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد۔ زینہار اکبرآباد را بہ چشم کم ننگرند۔ و از رہ گذرہائے آں دیار الحفیظ گوئے و الامان سرائے گزرند کہ آں آبادی چہ ویران و آں ویرانہ آباد یاد زیگاہ ہم چو من مجنونے و ہنوز آں بقعہ را در ہر کف خاک چشمہ خونے ہست۔ روزگارے بود کہ در آں سرزمیں جز مہر گیاہ نہ رستے و ہیچ نہال جز دل یار نیا؟ و رشتے نسیم بہیچ در آں گلکدہ بہ مستانہ وزیدن داہا را آنمایہ از جا بر انگیختے کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر و پارسایاں را نیت نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند بخوردہ خار آں گل زمین را از تن بہ پا مے بود دل نشیں و ہر رگ آں گلستاں را از جان درود مے بود خاطر نشاں اما تازگی وقت شما را در نظر داشتہ چشم براہ آں داشت کہ کسے نویسند و دریغ کہ ہیچ گاہ ننوشتند کہ رخش سخن دعائے مرا بہ کدام وادی در رفت و دریا بہ پاسخ سپاس من از زبان موج چہ گفت۔

**خطاب** | نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب دودمان تیموریہ کے آخری بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف سے ۴ر جون ۱۸۵۰ء کو ملا تھا جبکہ خاندان شاہی کی تاریخ نگاری کا منصب

غالبؔ کے حوالے کیا گیا تھا چنانچہ خود "مہر نیم روز" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

بہ پنجشنبہ بست و سوم شعبان سال یک ہزار و دو صد و شصت و شش ہجری با چہارم جون سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ عیسوی برابر . . . . شہنشاہ بہ شکوہے کہ پنداری آفتاب است در بیت الشرف براورنگ نشستہ و من بہ نشاطے کہ گوئی عطارد است در تقہیم بہ روبرو ایستادہ کارپردازان شاہی بہ فرمان حضرت ظل الہٰی بہ خلعت خانہ تاچشم بروند و خاتمم را بہ خلعت شش پارچہ آراستہ بہ سلام گاہم آوردند خداوند دنیا و دین بداں دست بخشش آئیں کہ کف آں دست دریائے است کہ ہفت دریا کف اوست جابجا گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ و سرپیچ بہ سرم بست و رگ جان ازیں ساں یعنی حمائل مروارید بہ گردنم آویخت چاوش فرخ سروش گہرہائے تراویدہ رگ ابر خامہ شاہ پرویں سپاہ بر گوشہ بساط بارگاہ افشاندند غالبؔ سخن سرائے را نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ خوانند۔

**تخلص** | غالبؔ نے ابتدا میں اردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ تو اسدؔ تخلص رکھا تھا جب فارسی میں شعر کہنے شروع کئے تو غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ بعد ازاں اردو میں بھی غالب ہی تخلص رہا لیکن جب انہیں کسی مقطع میں غالبؔ تخلص لانے میں تکلف ہوتا تھا تو بلا تکلف اسدؔ رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ پچیس برس کی عمر کے بعد غالبؔ نے جو اردو غزلیں کہیں ان میں سے دس بارہ میں تخلص اسدؔ ہے بعض اوقات تخلص کی جگہ پورا نام رکھ دیتے تھے مثلاً ؎

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

یا ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

**تبدیل تخلص کی وجہ** | تخلص کو بدلنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگ جو ذوق سخن سے ناآشنا

تھے میر امانی اسد نامی ایک غیر معروف شاعر کے اشعار غالب سے منسوب کرنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے عزیز شاگرد منشی شیو نرائن آرام صاحب مطبع مفید خلائق نے بھی میر امانی اسد کے ایک شعر کو غالب کا شعر سمجھ کر پوری غزل مانگی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

بھائی حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو ع

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے خوب مطلع کہا ہے ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت، بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں تم طرز تحریر اور روشِ فکر پر بھی نظر نہیں کرتے میرا کلام اور ایسا مزخرف ہو؟

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے غالب بعد میں بھی کبھی کبھی اسد تخلص فرماتے رہے۔

مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ جھجر میں کوئی فرومایہ شخص اسد تخلص کرتا تھا ایک دن ان کا مقطع کسی نے پڑھا ؎

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ اور انہوں نے ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔[۱]

---

[۱] "آب حیات" صفحہ ۵۰۰۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد مرحوم نے اس بیان کو مبنے کیا ہے لیکن ۱۲۴۵ھ میں تخلص بدلنے والا بیان بداہتہً غلط ہے۔ غالب ۱۲۴۲ھ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے ؎

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔

**نسب و خاندان** غالب قوم کے ایبک ترک تھے ان کا سلسلۂ نسب توران ابن فریدوں تک منتہی ہوتا ہے جب تورانیوں کا جاہ و جلال کیانیوں کے عروج و اقبال کی آندھی میں غبار کی طرح اُڑ گیا تو حکمران خاندان کے تمام بقیۃ السیف افراد اپنے وطن کو چھوڑ کر جابجا منتشر ہو گئے۔ اسلامی عہد میں اس خاندان کے افراد نے پھر وہ عظیم الشان سلطنت قائم کی جو تاریخ کے اوراق پر سلجوقی سلطنت کے نام سے مشہور ہے اور جس کے تاجداروں میں سے الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر شہرت عام اور بقائے دوام کے تاج پہن چکے ہیں جب یہ سلطنت بھی زائل ہو گئی تو پھر افراد خاندان غربت اولے کی طرح پریشان و منتشر ہو گئے انہی میں سے ایک کا نام شہزادہ ترسم خاں تھا جو سمرقند میں جا بسا۔ غالب اسی ترسم خاں کی اولاد میں سے تھے۔

**دادا ہندوستان آئے** غالب کے دادا غالباً محمد شاہ پادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور سب سے پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے جب معین الملک کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی امارت کی بساط اُلٹ گئی تو غالب کے دادا لاہور سے دہلی چلے گئے جب شاہ عالم پادشاہ ہوئے اور ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں مختار کل بن گئے تو نواب موصوف کی سرپرستی میں غالب کے دادا کو اچھی ملازمت مل گئی۔ اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہو گیا۔ اس وقت سے غالب کے دادا نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اور غالب کے والد میرزا عبد اللہ بیگ خاں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔
منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:۔

> میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماورالنہر سے شاہ عالم[1] کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔

---

[1] غالب کے اس دعوے کے متعلق میری تحقیق آگے چل کر درج ہو گی۔

سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔

مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :۔

ترک نژادم و نسبم بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد، بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم گہری داشتند بعہد دولت ایناں رایت سروری و سپہبدی افراشتند بعد سپری شدن روزگار جاہ مندی آں گروہ چو ناروائی و بے نوائی روے آورد جمعے را ذوق رہزنی و غارت گری از جائے بُرد۔ و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت نیاگان مرا بہ توران زمین شہر سمرقند آرامشگاہ شد از اں میانہ نیائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور رہی معین الملک گزید، چوں بساط معین الملک درنوشتند بہ دلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست، از اں پس پدرم عبد اللہ بیگ خاں بہ شاہ جہان آباد بوجود آمد و من بہ اکبرآباد۔

نور الدولہ نواب محمد سعد الدین خان بہادر شفق رئیس کدورا کالپی کو لکھتے ہیں :۔

نیاے نامہ نگار ترکی بود از نژاد افراسیاب و پشنگ از ترکستان بہ ہند روے آورد، در لاہور درعہد معین الملک تکیہ گاہ و آرامش جاے ساخت۔

مہر نیم روز کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

نیاگان نامہ نگار از تخمہ افراسیاب و پشنگ بودہ اند فرماندہان با فرّہ و فرہنگ۔ فرہ مردی چراغ ہستی نوردیدہ تور (افراسیاب) بہ باد آستین کینہ کیخسرو پشنگیاں را روز سیاہ پیش آورد خداوندان اورنگ تو پیہم را از اں برگ و ساز جز تیغ گند ناگوں بہ کف نماند، بہ مرز و بوم بیگانہ روے آوردند و بہ دست مزد تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں تیتاں ایوانان کہ سالشیں سلجوقیاں دگر بارہ سر بہ افسر و افسر بہ گوہر آراستند چرخ گردندہ چنانچہ خوے اوست ایں نامداران کاؤس کوس را نیز از پاے فگندہ

در مشربِ ما خواہشِ فردوس نہ جوئی — در مجمعِ ما طالعِ مسعود نہ یابی،
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی — در آتشِ ہنگامۂ ما دود نہ یابی،

از دو اسپیان این قافلۂ بیاتے من کہ در قلمرو ماوراءالنہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد و در دفتر سپہ بد شاہ، ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیع نوکری شاہش نوشتند و پرگنہ پہاسو برات روزی وے و سپاہش نوشتند۔

**غالب کے دادا** غالب کے دادا کا نام معلوم نہیں ہو سکا نہ یہ معلوم ہے کہ انہوں نے کب انتقال کیا خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ ان کی زبان ترکی تھی نیز ان کے متعدد بیٹے تھے جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں ایک میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا (غالب کے پدر بزرگوار) دوسرے میرزا نصراللہ بیگ خاں (غالب کے عم محترم)۔

غالب کا یہ دعوےٰ محلِ نظر ہے کہ ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اس لیے کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوتے تھے ۱۷۵۱ء میں انتقال کر گئے تھے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ غالب کے دادا محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔

**نسب پر فخر** غالب نے اپنے نسب پر جا بجا فخر کیا ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو افراسیابی اور پشنگی[1] کہتے ہیں کبھی "دودۂ زادشم"[2] میں سے ہونے پر اتراتے ہیں کبھی اپنے آپ کو سلجوقی اور تورانی بتاتے ہیں کبھی ایبک ہونے پر فخر کرتے ہیں مثلاً

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم[3] از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

---

[1] پشنگ افراسیاب کا باپ [2] زادشم افراسیاب کا دادا۔ [3] ایبک مرکب ہے اے اور بک سے بمعنی ماہ کامل ۱۲

"ایبک" غلام [illegible]

فن آبائے ما کشاورزی است
مرزبان زادۂ سمرقندیم

پھر فرماتے ہیں :-

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم   دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار   زاں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

"نیمروز" کے دیباچہ میں اپنے نسب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم   زاں رو بصفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر   شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

بہادر شاہ کے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں :-

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن
توقیع من بہ سنجر و خاقاں برابر است

آغا بزرگ شیرازی متخلص بہ وفا کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

خلیجم و لے نور چشم محیطم   غریبم و لے روشناسِ جہانم
بہ مضمار دعوئے خداوند رخشم   در اقلیم معنی جہاں پہلوانم
گرفتم کہ از تخمۂ افراسیابم   گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم   رہ و رسمِ کشور کشائی ندانم
چہل سال توقیعِ معنی نبشتم   سزد گر نویسند صاحب قرانم

سہرون کے قضیہ میں ذوق کی تنگ حوصلگی، سخن نافہمی اور ادا ناشناسی سے جو ناگوار صورت حالات پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالہ کے لئے غالب نے اُردو میں ایک قطعہ لکھا تھا جو زبان زد عوام ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب کے اجداد کی جو کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ دعوے حرفاً حرفاً درست ہے اور اسے عام شاعرانہ مبالغہ یا خالی سخن گستری پر محمول نہیں ہونا چاہئے۔

اپنے ہم قوموں کے متعلق نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو لکھتے ہیں:۔

> سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی میرا ہم قوم تو سرا سر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار اور دشت قفچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے سببی ہیں۔

**غالب کے والد ماجد** غالب کے دادا کی وفات کے بعد ان کے والد عبد اللہ بیگ خاں اور چچا نصر اللہ بیگ خاں اپنے آبائی پیشے یعنی سپہگری میں مصروف رہے۔ دونوں میں سے کسی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمریں کیا تھیں لیکن چونکہ دونو غالب کی کم سنی میں فوت ہوئے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ ان کی عمریں تیس پینتیس برس سے متجاوز نہ ہوں گی۔

غالب کے والد پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس نوکر ہوئے پھر حیدر آباد چلے گئے اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے۔ یہ ملازمت جاتی رہی تو آگرہ چلے آئے جہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین کمیدان کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ آگرہ سے راجہ بختاور سنگھ والی الور کے پاس بغرض ملازمت پہنچے لیکن کوئی صورت مدعا براری پیدا نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ الور کا ایک زمیندار راجہ سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی اس میں میرزا عبد اللہ بیگ خاں کا دستہ بھی شامل کر دیا گیا راج گڑھ کے مقام پر سرکش زمیندار کے ساتھ چپقلش ہوئی جس میں میرزا عبد اللہ بیگ خاں گولی کھا کر شہید ہو گئے۔ اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔ یہ غالباً سنہ ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف پانچ برس کی تھی۔ راجا شیو دھیان سنگھ والی الور کی مدح میں غالب نے جو قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں ؎

زاں پس کہ گشت گوہر من در جہاں یتیم
زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بہ کارزار

در پنج سالگی شدہ ام چاکرِ حضور — رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
دارم بہ گوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال — اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال است در شمار
باید شنیدہ راز زباں عیانِ بارگاہ — باید شنفت قصہ ز پیرانِ آں دیار
کانی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست — در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:-

> باپ میرا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چندے روز حیدر آباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

عبداللہ بیگ خاں نے دو لڑکے چھوڑے، ایک اسد اللہ خاں غالب دوسرے یوسف خاں جو غالب سے دو برس چھوٹے تھے۔ غالب نے ایک موقع پر بہن کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حقیقتاً ان کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو۔

**غالب کے عم محترم** عبداللہ بیگ خاں کی دردناک موت کے بعد ان کے بچوں کی کفالت نصر اللہ بیگ خاں سے متعلق ہوگئی۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے لیکن جب آگرہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو صوبیداری کمشنری بن گئی اور کمشنر ایک انگریز مقرر ہوگیا۔ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش بہادر رستم جنگ رئیس فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کو انگریزوں کے ہاں بڑا اعتماد حاصل تھا۔ ان کی ہمشیرہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں سے منسوب تھیں۔ انہوں نے لارڈ لیک سے کہہ کر نصر اللہ بیگ خاں کو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب دلا دیا۔ اور ان کی ذات اور رسالے کے لئے نواحی آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سونسا مقرر کرا دیئے سنہ ۱۸۰۶ء میں دفعتہً ان کا بھی انتقال ہوگیا[1]۔ اس وقت غالب کی عمر صرف نو برس کی تھی منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو غالب لکھتے ہیں:

---

[1] صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی لیکن سال وفات یقیناً ۱۸۰۶ء ہے۔ نواب احمد بخش [illegible] صفحہ ۱۱۳

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک کا عمل ہوا۔ صوبیداری کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر جین حیات علاوہ مرزبانی کے تھی۔ کہ بہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی وہ اب تک پاتا ہوں۔

چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :۔

میں پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال۔

مولوی سراج الدین احمد خاں کو ایک فارسی مکتوب میں رقم فرماتے ہیں :۔

پنج سال از عمر من گزشت، پدر از سرم سایہ برگرفت عم من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد گاہ مرگش فراز آمد کما بیش پنج سال بعد گزشتن برادر پے چنیں برادر برداشت و مرا دریں خرابہ تنہا گزاشت و ایں حادثہ کہ مرا نشان جاں گدازی و گردوں را کینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی (۱۸۰۶ء) بہ ہنگام لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر بر دستے کار آمد چوں عم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ بود۔ و با

---

(بقیہ صفحہ ۱۲) کو سرکار انگریزی سے لارڈ لیک نے جاگیر کی دو سندیں دلائی تھیں پہلی ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۰۴ء کو دوسری ۴ مارچ سنہ ۱۸۰۶ء کو ۴ مئی سنہ ۱۸۰۶ء کو حکومت کی تجویز کے مطابق ایک شقہ نواب احمد بخش خاں کو لکھا گیا تھا۔ جس میں نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا گیا تھا کہ کمپنی بہادر کو ان کے متعلقین کی پرورش منظور ہے اور اس سلسلے میں نواب صاحب کی جاگیر پر پچیس ہزار روپے کی جو رقم مقرر کی تھی اس میں سے دس ہزار کی رقم نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے سلسلے میں معاف کر دی تھی پندرہ ہزار کی رقم پچاس سواروں کے سلسلے میں معاف کر دی تھی جو نصر اللہ بیگ خاں نے مقرر کر رکھے تھے اس سے ظاہر ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ۴ مارچ سنہ ۱۸۰۶ء اور ۴ مئی سنہ ۱۸۰۶ء کے درمیان ہوا

> انبوہے چار صد سوار بہ رکاب صمصام الدولہ (لارڈ لیک) با سرکشان سرگرم جنگ۔ وہم از بخششہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبرآباد در جاگیر داشت سرکار انگلشیہ بخوں بہائے آفتاب کلبۂ تار گدایان را چراغ و ما بے نوایان را بہ عوض جاگیر بہ مشاہرہ از خار خار جستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید و ما امروز کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ چہل و چار رسید براں راتبہ خرسندیم و براں مایہ قانع۔

غالب نے کسی جگہ بھی صراحتہً نہیں لکھا کہ چچا کی موت کس طرح واقع ہوئی محولہ بالا تحریر سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول موت ناگاہ ہوئی دوم اس حالت میں ہوئی جبکہ میرزا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کے ہم رکاب سرکشوں سے سرگرم جنگ تھے۔ لفظ "خوں بہا" سے یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید نصراللہ بیگ خاں بھی شہید ہوئے لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں اس کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکی۔ بہرحال غالب کے والد اور چچا چار سال کے اندر اندر یکے بعد دیگرے رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ اور لارڈ لیک نے ان کے چچا کی وفات کے بعد دس ہزار روپے سالانہ کی نقد معاش شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم و مغفور خاندان کے پس ماندوں کے لئے مقرر کرا دی لیکن نواب احمد بخش خاں نے تین ہزار روپے سال سے زیادہ نہ دیئے جن میں سے غالب کے حصے کی رقم ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھی۔ اس پنشن کا تفصیلی ذکر دوسری جگہ آئے گا۔

**غالب کے نانا** غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان تھے جو خواجہ حالی مرحوم کے بیان کے مطابق سرکار میرٹھ کے معزز فوجی افسر اور آگرہ کے عمائد میں سے تھے۔ ان کی دولت اور وسعت جائداد کا اندازہ اُردوئے معلّٰی کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو غالب نے منشی شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق کو لکھا تھا فرماتے ہیں :-

> تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں ایرانی میں میرے نانا صاحب خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر

کہیں نوکری نہ کی یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر (منشی شیونرائن کے دادا) خاں صاحب (خواجہ غلام حسین خاں) کے ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے جو کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعوے کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں میں اور وہ (منشی بنسی دھر) ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھمی چند نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی۔ اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی۔ اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا وہ کٹڑوں کا کرایہ اُگاہ کر ان کے پاس جمع کراتا تھا۔ سنو تو سہی تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لیتے تھے۔ اور زمینداره اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگذاری ادا کرتا تھا۔

خواجہ حالی مرحوم نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ جس سرکار (خواجہ غلام حسین خاں) کے متوسلین دس دس ہزار روپے کے مالگزار بن گئے تھے اس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے والد بزرگوار آگرہ میں بہ طور خانہ داماد کے رہتے تھے۔ اس لئے کہ غالب نے اپنے ناناہی کے املاک کو اپنے املاک ظاہر کیا ہے یا اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ والد اور چچا کی وفات کے بعد غالب اپنے ناناہی کے ہاں رہتے تھے۔ خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب غالب نے دہلی میں سکونت اختیار کی تھی تو ان کے نانا کے بعض املاک فروخت ہو گئے

تھے۔ یا خود غالب نے وہ املاک فروخت کر دیئے تھے۔ جو ننہال کی طرف سے انہیں ملے تھے۔

**خاندانی عظمت**

یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب کا خاندان بہت اونچا تھا۔ ان کے چچا کی تنخواہ بارہ ہزار سالانہ تھی۔ جاگیر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ ان کے والد کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے چچا نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ہمشیر سے منسوب تھے۔ غالباً اس آخری رشتے ہی کی وجہ سے غالب کی شادی نواب احمد بخش خاں کے برادر کوچک نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔

**یتیمی اور حکمت الٰہی**

میرا خیال ہے کہ اگر غالب کے باپ اور چچا کا سایہ کمسنی اور کم عمری میں سر سے نہ اٹھ جاتا تو بظاہر کوئی امکان نہ تھا کہ انہیں سپہگری کے آبائی پیشہ کو چھوڑ کر پوری زندگی ادب و شعر کی خدمت میں وقف کرنے کا موقع ملتا۔ اگر باپ یا چچا زیادہ دیر تک زندہ رہتے تو اغلب یہی ہے کہ شاعری کا یہ گنج گرانمایہ سپہگری کی نذر ہو جاتا لیکن قدرت اس نادر روزگار وجود سے دوسرا کام لینا چاہتی تھی۔ لہذا جو ہستیاں غالب کو آبائی پیشہ میں لگانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتی تھیں وہ غالب کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ سپہگری میں غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالدار یا اپنے نانا کی طرح کمیدان بن جاتے لیکن ادب و شعر میں انہیں وہ پایہ حاصل ہوا جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب، طغرل، سنجر، الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا۔ آج رستم خاں، عبداللہ بیگ خاں، نصر اللہ بیگ خاں اور خواجہ غلام حسین خاں کے ناموں سے ہم صرف اس لئے روشناس ہیں کہ وہ غالب کے بزرگ تھے۔ ورنہ ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہر عہد میں ہو گزرے ہیں جن کے نام بھی دواوین سیر و سوانح میں اندراج کے شایاں نہیں سمجھے گئے۔

**اہل خاندان**

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کے اور کون کون سے رشتہ دار موجود تھے؟ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ چچا کی وفات کے بعد غالب کے خاندان کے لئے دس ہزار روپے کی معاش مقرر ہوئی تھی جس میں سے نواب احمد بخش مرحوم نے

صرف تین ہزار سالانہ کی رقم دی اس میں سے غالب کا حصہ ساڑھے سات سو تھا ساڑھے سات سو ان کے بھائی یوسف خاں کو ملتے تھے۔ دہلی ریذیڈنسی کے جو پرانے ریکارڈ حکومت پنجاب کے ریکارڈ آفس میں محفوظ ہیں ان میں غالب کی پنشن کے متعلق بھی بعض کاغذات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ پندرہ سو روپے نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ یعنی غالب کی دادی اور نصر اللہ بیگ خاں کی تین بہنوں یعنی غالب کی پھوپھیوں کو ملتے تھے دوسرے رشتہ داروں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ جب غالب دہلی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے تو ان کی والدہ اس وقت بھی زندہ تھیں اور وقتاً فوقتاً مالی امداد فرماتی رہتی تھیں چنانچہ نواب علاء الدین خاں والی لوہارو کو ایک خط میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> با ایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا۔

**تعلیم** غالب کے عہد طفلی کے حالات تفصیلاً معلوم نہیں ہو سکے لیکن اتنا ظاہر ہے کہ اس عہد کے عام امیر بچوں کی طرح ان کی زندگی بالکل لاابالی تھی۔ وہ شطرنج اور چوسر کھیلتے تھے۔ پتنگ اڑاتے تھے، یاروں اور دوستوں کے جمگھٹوں میں بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ وہ شیخ معظم سے پڑھتے تھے جو اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلموں میں سے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی۔ چودہ[1] برس کی عمر تھی جب ایک نومسلم پارسی سیاحت کرتا ہوا آگرہ پہنچا اور دو برس غالب کے مکان میں مقیم رہا۔ اس کا ابتدائی نام ہرمزد تھا۔ اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا۔ یہ فارسی اور عربی کا متبحر عالم تھا۔ زمانہ قیام آگرہ میں اس نے غالب کی تعلیم پر خاص توجہ صرف کی۔ فارسی کے تمام اصول و قواعد پوری طرح ذہن نشین کرائے۔ ملا عبدالصمد کے دل پر غالب کی جودت طبع، ذکاوت اور بالغ نظری کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ مرحوم کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ ملا صاحب نے غالب کو لکھا تھا:

> اے عزیز چہ کسی کہ باوجود آزادیہا گاہ گاہ بخاطر مے گزری۔

---

[1] ملاحظہ ہو "قاطع برہان" صفحہ، غالب نے خود لکھا ہے کہ ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ میں آگرہ آئے اور دو برس تک میرے پاس رہے ۱۲

غالب کی فارسی دانی کی بنیاد و اساس ملا عبد الصمد کی تعلیم ہی تھی۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ غالب مکتبی فارسی کے جوہڑ میں ڈبکیاں لگانے کے بجائے اہل زبان کی فارسی کے دریا کے شناور بن گئے۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" بابت جنوری ۱۹۳۴ء میں غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام مولوی ضیاء الدین صاحب ضیا دہلوی نبیرہ نواب صاحب لسبتی دارا پور چھپا تھا اس کے آغاز میں غالب اپنی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :-

> میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مأتہ عامل تک پڑھا بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے معہد المنطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص فارسی بے آمیزش عربی) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوتے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشاں ہو گئی۔

شاعری میں غالب کو کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ملا عبد الصمد سے فارسی※ پڑھی اور اس کے اصول و قواعد سیکھے۔ لیکن شعر گوئی میں مبدأ فیاض کے سوا وہ کسی کے منت پذیر نہ ہوئے۔

غالب کی مختلف تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کی صرف و نحو اور تاریخ پر کامل عبور تھا۔ وہ عربی سے اچھی طرح واقف تھے۔ نجوم جانتے تھے۔ تصوف کی اکثر کتابیں دیکھ چکے تھے۔ طب سے بھی واقف تھے۔ جناب محمد عبد الرزاق صاحب راشد مددگار معتمد فینانس دولت آصفیہ نے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو غالب کے حالات کے متعلق جو تقریر لاسلکی کے ذریعہ سے نشر کی اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (متھرگھٹی حیدرآباد) کے کتب خانہ کی کتابیں دیکھتے وقت طب کی ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا نام "ذخیرہ دولت شاہی" ہے۔ اس کتاب کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۲ جمادی الاول ۱۲۳۷ھ کو مصنف نے احمد شاہ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی تھی اور رمضان کو اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرنے کا حکم ہوا لیکن کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب کے مطالعہ میں بھی رہی ہے۔ کتاب پر بادشاہ کی مہر کے علاوہ غالب کی بھی مہر ہے جس میں غالب کے نام کے علاوہ یہ شعر درج ہے

---

※ جدید تحقیق کے مطابق یہ بات پایۂ اعتبار سے گر چکی ہے ۔

رضینا قسمت الجبار فینا
لنا علم وللجہال مال

یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کتاب غالب کے پاس کیوں کر پہنچی لیکن اکثر صفحات کے حاشیوں پر غالب کی تحریریں موجود ہیں بعض میں مصنف سے اختلاف کیا ہے بعض میں اس کی معلومات پر اضافہ کیا ہے کہیں کسی مرض کا حال لکھا ہے کہیں دوا کے استعمال کے ساتھ پرہیز کے لئے اغذیہ کے نام لکھے ہیں۔ اگر حاشیوں کی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو فن طب کا ایک رسالہ ہو جائے۔ (روزنامہ صحیفہ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۳۶ء)

فن طب سے غالب کی واقفیت کے بعض شواہد ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں لیکن جناب عبدالرزاق صاحب کی تقریر میں احمد شاہ بادشاہ کا نام یا ۱۲۲۳ھ کی تاریخ میں سے کسی ایک کو غلط ماننا ضروری ہے۔ ۱۲۲۳ھ میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ تھے۔ احمد شاہ محمد شاہ کی وفات پر ۱۷۴۸ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ مطابق ۱۱۶۱ھ

اسراف اور قرض

مولوی ضیا دہلوی والے خط سے ظاہر ہے کہ درس تدریس ابتدائی حالت میں تھی۔ اسی اثنا میں غالب لہو و لعب فسق و فجور عیش و طرب میں منہمک ہو گئے۔ ملا عبدالصمد کی صحبت نے فارسی زبان کے فطری ذوق کو جلا دے دی۔ اس کے قواعد و اساسات ذہن نشین ہو گئے۔ رندی اسراف پر منتج ہوئی اور اسراف نے انہیں قرض کا عادی بنا دیا۔ نواب علاءالدین احمد خاں کے نام کے ایک خط سے مترشح ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ ہی سے قرض لینا شروع کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں :-

> بھائی (نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو) کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود شہد لگاؤ چاٹو نہ مول نہ سود

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رشتہ دار بہت کافی مالی امداد دیتے تھے مثلاً وہ خود لکھتے ہیں

> اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر ہاں ہم کبھی خاں نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا اب میں اور باسٹھ روپے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔

میرزا یوسف خاں

غالب کے دہلی چلے آنے کے بعد ان کے بھائی میرزا یوسف خاں نے بھی دہلی میں مستقل

سکونت اختیار کر لی تھی۔ میرزا یوسف خاں غالبؔ سے دو برس چھوٹے تھے۔ تیس برس کی عمر میں دیوانگی عارضہ ہوا جس سے تادمِ مرگ کامل افاقہ نہ ہوا۔

دہلی میں وہ غالبؔ سے علیحدہ رہتے تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی غالبؔ نسبتی بھائی میرزا علی بخش خاں رنجورؔ (ابن نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ) کے صاحبزادے غلام فخرالدین خاں ساتھ ہوئی تھی۔ غدر میں میرزا یوسف خاں کی بیوی اور لڑکی بچوں سمیت دہلی سے جے پور چلے گئے تھے اور میرزا موصوف کے پاس ایک سن رسیدہ ملازم اور ایک بڑھیا خادمہ کو چھوڑ گئے تھے۔ غالبؔ نے انہیں اپنے مکان پر کی کوشش کی مگر نہ لا سکے۔ وہ "دستنبو" میں لکھتے ہیں:-

> برادرم کہ دو سال از من کوچک است در سی سالگی خرد بہ باد داد و دیوانگی و کالیوگی گزید۔ سی سال است کہ آں دیوانہ کم آزار ہست و بے ہوش مے زید۔ خانہ وے از خانۂ من جداست و کما بیش دوری دو ہزار گام در میان۔ زن و دختر با فرزندان و کنیزان زندگی در گریختن پنداشتند و خانہ خداوند دیوانہ را با خانہ و کالا چال (اسباب خانہ) و دربان کہن سال و کنیز پیرزال بجا گذاشتند۔ کس فرستادن و آں سہ تن و کالا را بدیں جا آوردن از جادو دانستیم نتوانستیم۔ ایں خود گراں اندوہے دیگر و از بار ایں اندوہ بر دل کوہے دیگر است۔

**میرزا یوسف خاں کی وفات**

غدر کے دوران ہی میں میرزا یوسف کو پانچ روز بخار آیا اور یہی بخار ان کی موت کا بہانہ بن گیا۔ بڈھے دربان نے غالبؔ کو یہ خبر پہنچائی۔ غالبؔ "دستنبو" میں ۱۹ اکتوبر کے حالات میں یہ زہرہ گداز واقعہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اب یہ تشویش ہوئی کہ کفن دفن کا کیا انتظام کیا جا نہ مردہ شو کا پتہ، نہ گورکن کی خبر نہ بازار کھلے تھے کہ کفن کے لئے کپڑا خرید کیا جائے۔

> ہندو ہمے تواند کہ مردہ را بہ دریا برد و بر لب آب در آتش سوزاند۔ مسلمانان را چہ زہرہ کہ دو دو کس ہمپائے یک دگر دوشادوش بر رستہ گذرند چہ جائے آنکہ مردہ را از شہر بروں برند۔ ہمسایگان بر تنہائی من بخشودند۔ و بہ سرانجام کار کمر بستند۔ یکے را از سپاہیان پٹیالہ پیشاپیش و دو تن را از چاکران من با خویش گرفتند و رفتند و تن مردہ را شستند و در دو سہ چادر کہ زیں جا بردہ بودہ پیچیدند و بہ نمازگاہے مسجد کہ بہ پہلوے آں کاشانہ بود زمین کندند و مردہ را در آنجا نہادند و مغاک بہ خاک انباشتند و برگشتند۔

دریغ آں کہ نازردہ رنگ بزیست — سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
نہ خاک بالیں زخشتش نہ بود — بجز خاک در سرنوشتش نہ بود
خدایا بر ایں مردہ بخشائشے — کہ نادیدہ در زیست آسائشے
سروشے بہ دلجوئی او فرست — روانش بہ جاوید مینو فرست

**تاریخ وفات یوسف خاں** یعنی ساٹھ برس (بہ حساب سنین قمری) کی زندگی ہوئی جس میں سے تیس سال شادمانی میں گزرے اور تیس سال ناشادمانی و ناخوشی میں بسر ہوئے۔ میرزا یوسف کا انتقال ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو ہوا۔ غالب نے تاریخ وفات لکھی:۔

زِ سالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بہ جہاں از خویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمے پژوہش کرد — کشیدم آہے و گفتم "دریغ دیوانہ"

"دریغ دیوانہ" کے اعداد میں سے "آہے" کے اعداد کا تخرجہ کرنے سے تاریخ نکلتی ہے۔

**یوسف خاں کی اولاد** میرزا یوسف خاں کی صاحبزادی کے چار بچے تھے ان کے شوہر غلام فخر الدین خاں (ابن میرزا علی بخش خاں رنجور) غدر سے قبل بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے اور بادشاہ کی ہدایات کے مطابق غدر کے دنوں میں بھی روپیہ دیتے رہے تھے۔ غدر کے بعد ان پر بھی مقدمہ بنا لیکن انجام کار وہ بری ہو گئے۔ بعد ازاں حیدرآباد چلے گئے وہاں دو سو روپے بطور منصب مقرر ہو گئے۔ غلام فخر الدین خاں کے صاحبزادے میرزا محمد سعید خاں تھے جنہوں نے ابتدا میں ملازمت اختیار کی مگر بعد ازاں درویش بن گئے اور بائیس برس گوشہ نشینی اور یاد الٰہی میں بسر کر دیے۔ وہ بعد وفات محلہ سنتعد پورہ حیدرآباد میں دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مسٹر نصر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لا اس وقت حیدرآباد میں صدر محاسبی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔

**بھتیجی کی پرورش کا اضطراب** غالب کو اپنی بھتیجی اور اس کے بچوں کی پرورش کا بڑا خیال تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے۔ اس کی ماں میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں اس تین برس میں (یعنی غدر کے بعد) ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی چچا ہے۔

غلام فخر الدین کے مقدمے کے دوران میں بھی غالب بڑے مضطرب تھے اور جب انہوں نے رہائی پائی تو غالب اتنے خوش ہوئے کہ اسے غلام فخر الدین کی نئی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں (اردوئے معلی صفحہ ۱۸۳)

# دوسرا باب

## شادی، خانگی زندگی اور متعلقین

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر          دریں جنت از آں ویرانہ یاد آر
وریغا در وطن وا ماندہ چند،          بخونِ دیدہ زورق راندہ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ          بامیدِ تو چشم از خویش بستہ

**شادی** غالب کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو ٹھیک تیرہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ نواب علاء الدین احمد خاں کے جس مکتوب میں وہ اپنی حیات مستعار ک عالم ارواح کی گناہ کاری کی سزا قرار دیتے ہیں اس میں فرماتے ہیں:-

> ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا (یعنی کتم عدم سے معرض وجود میں آیا) تیرہ برس حوالات میں رہا، ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا

ظاہر ہے کہ اس خط میں "حکم دوام حبس" سے مراد شادی اور "بیڑی" سے مراد بیوی ہے۔

ہرگوپال تفتہ نے اپنے اور غالب کے مشترک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی اطلا دی تھی۔ اس کے جواب میں غالب ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

> امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

سن قمری کے حساب سے یہ خط ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا تھا اب ۱۲۷۶ھ میں سے اکاون نکال دیے جائیں تو ۱۲۲۵ھ رہ جاتے ہیں گویا اس مکتوب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی شادی ۱۲۲۵ھ میں ہوئی تھی۔

**غالب کے خسر** غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف تھے جو فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر

डा० रिहाना जाफरी

رستم جنگ والی فیروزپور جھرکہ و رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر گوشہ نشینی اور عبادت گزاری میں بسر کی۔ نواب احمد بخش خاں اگرچہ عمر میں بڑے تھے مگر چھوٹے بھائی کے زہد و اتقا کے باعث ان کی بڑی عزت اور بڑا احترام کرتے تھے۔ معروف اچھے شاعر تھے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان حال ہی میں شاہ عبدالحامد قادری بدایونی کی کوشش سے شائع ہوا ہے ۱۲۴۲ھ (مطابق ۱۸۲۶ء) میں رہگراے عالم بقا ہوئے۔ اور خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے پاس اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں بعد ازاں غالب سپرد خاک ہوئے۔ مولانا آزاد نے اُستاد پرستی کے جوش میں معروف کے کمالات کو بھی ذوق کی تراوش طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

**معروف کی اولاد** نواب الٰہی بخش خاں معروف کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ہمیں صرف ایک بیٹے میرزا علی بخش خاں رنجور کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے بیٹے میرزا الٰہی نواز خاں کا صرف نام معلوم ہے۔ ان کی نسبت اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا جو نواب غلام حسین صاحب مسرور سے بیاہی گئی تھیں چھوٹی بیٹی کا نام اُمراؤ بیگم تھا۔ جو غالب کی رفیقہ حیات تھیں۔

**اُمراؤ بیگم کی عمر** اُمراؤ بیگم غالب سے دو برس چھوٹی تھیں جیسا کہ خود غالب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے غدر سے دو تین برس بعد دہلی میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی تھی۔ میر مہدی مجروح نے جو اس زمانے میں غالباً الور میں تھے۔ غالب سے وبا کی کیفیت پوچھی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

> وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد (غالب) اور ایک چونسٹھ برس کی عورت (بیگم صاحبہ غالب) ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ وبا تھی تُف بریں وبا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت اُمراؤ بیگم کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ اور ان کا سن ولادت ۱۲۱۴ھ تھا۔

**علی بخش خاں رنجور** علی بخش خاں رنجور ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف غالب سے چار برس چھوٹے تھے۔ غالب خود نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

> علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اُس کے رجب کے مہینے سے اُنہتروا

برس شروع ہو گیا۔ اس نے (علی بخش خاں نے) چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔

غالب کے ساتھ علی بخش خاں کے تعلقات و روابط ہمیشہ بہت اچھے اور خوشگوار رہے۔ غالب نے کلکتہ جا کر اپنی پنشن کے سلسلے میں جو چارہ جوئی کی تھی اس میں بھی علی بخش خاں ان کے خاص ہمراز و معاون تھے۔ اس باب میں غالب نے انہیں کلکتہ سے جو خط لکھے ان کا مفصل ذکر پنشن کے سلسلے میں آئے گا۔ غالب کی فارسی نثر کی مشہور کتاب "پنج آہنگ" علی بخش خاں ہی کے ایما پر لکھی گئی تھی جیسا کہ وہ خود "پنج آہنگ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ ہم تفصیلات غالب کی تصانیف کے باب میں پیش کریں گے۔

کلکتہ جاتے ہوئے غالب کو راستے میں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی اطلاع ملی تھی، اور سب سے پہلے علی بخش خاں ہی کا خیال پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کلکتہ سے نواب احمد بخش خاں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں:۔

> از جانب شما اندیشہ ناکم و دانم کہ آنچہ شما را پیش آید دلخواہ نباشد ناکساں را روز بازار خواہد بود...
>
> ہوشمندی را کار باید بست ہموارہ بہ خود نگراں باید بود۔

علی بخش خاں کو فیروز پور جھرکہ سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا[لہ] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ جب نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے الزام میں پھانسی پا گئے اور ان کی ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی نے سو روپے کے بجائے علی بخش خاں کے لئے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کی وفات تک ملتا رہا۔ وظیفہ کی بندش کے زمانے میں وہ دہلی سے نکل کر پہلے لکھنؤ میں رہے پھر جے پور چلے گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد پہنچ گئے۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو انہوں نے دہلی میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ غالب یکم جنوری کے خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

> بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ بجے پر دو بجے مر گئے انا للہ و انا الیہ راجعون
>
> تمہارے عم نامدار (نواب ضیاء الدین احمد خاں) آج دن کے بارہ بجے تدفین کے لئے سلطان جی

---

[لہ] پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز متعلقہ دہلی ریذیڈنسی ۱۲

گئے ہیں میں نہ جا سکا۔ تجہیز و تکفین ان کی طرف سے (نواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے) عمل میں آئے گی۔

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بخش خاں کو سخن طرازی کا بہت شوق تھا۔ اور بعض اوقات وہ اپنے متعلق غلط انتسابات میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

> اکبر آباد میں (علی بخش خاں) میور صاحب سے ملے اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان (نواب احمد بخش خاں) کے ساتھ جرنیل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا۔ اور ہلکر سے جو محاربات ہوئے ہیں ان میں شامل رہا ہوں بے ادبی ہوتی ہے ورنہ قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ (میور صاحب) ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی تھے ان کو (علی بخش خاں کو) دیکھ کر کہنے لگے نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل کے وقت میں چار پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سن کر آپ نے (علی بخش خاں نے) کہا کہ درست و بجا ارشاد ہوتا ہے۔
>
> خدایش بیامرزاد و بہ ایں دروغہائے بے نمک نگیراد۔

نواب علی بخش خاں کی اولاد کا ذکر ہم پہلے باب کے آخر میں کر چکے ہیں۔

**خاندان لوہارو** لوہارو کا خاندان چونکہ قرابت قریبہ اور روابط خصوصی کی وجہ سے غالب کا اپنا خاندان بن گیا تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصراً اس خاندان کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ خاندان لوہارو کے آبا و اجداد بھی غالب کے آبا کی طرح ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ تین بھائی تھے قاسم جان۔ عارف جان اور عالم جان۔ عارف جان کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو بہت مشہور ہیں، اول نواب احمد بخش خاں دوم نواب الٰہی بخش خاں معروف۔ نواب احمد بخش خاں دور آخر کے نہایت جلیل القدر فرد تھے۔ بڑے اعلیٰ درجے کے جرنیل تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ ریاست الور کی تاسیس احمد بخش خاں ہی کی مساعی کا نتیجہ تھی تو یہ مبالغہ نہ ہو گا۔ نواب صاحب نے لارڈ لیک کی معیت میں بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں جن کی بنا پر انہیں علاقہ میوات میں فیروز پور جھرکہ کی ریاست مل گئی تھی۔ نیز بعد ازاں لوہارو کا پرگنہ عطا ہوا تھا۔ خواصیوں کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں

ایک میواتی الاصل تھی جس کے بطن سے نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں تھے ان کے ایک اور بھائی اور بہنیں بھی تھیں۔ دوسری بیگم نواب صاحب کی ہم قوم تھیں جن کے بطن سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۲ء میں اپنے بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین قرار دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ شمس الدین خاں چونکہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے اس لیے خاندان کے دوسرے افراد جن میں خود غالب بھی شامل تھے انہیں نسباً اپنا ہم پایہ نہیں سمجھتے تھے اور اس وجہ سے خاندان میں کشیدگی رونما ہو چکی تھی شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔ نواب احمد بخش خاں نے اسی کشیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے دونوں چھوٹے صاحبزادوں لوہارو کی جاگیر مستقل طور پر دے دیں۔ اور بقیہ افراد خاندان کی پنشنیں فیروز پور جھرکہ سے متعلق کر دیں اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے نواب شمس الدین احمد خاں سے ایک اقرار نامہ لیا جو لوہارو کی جاگیر سے دست برداری پر مشتمل تھا۔ اور ۱۸۲۶ء میں لوہارو اپنے چھوٹے صاحبزادوں کو دے کر اور فیروز پور جھرکہ کی مسند پر نواب شمس الدین احمد خاں کو بٹھا کر وہ خود اپنی خاندانی حویلی واقع قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے۔ نواب صاحب نے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں وفات پائی اور اپنے پیر و مرشد مولانا فخر الدینؒ اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔[1]

### نواب احمد بخش خاں کے صاحبزادوں میں کشمکش

غالب کی پنشن کا جھگڑا نواب احمد بخش خاں کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن بقیہ خاندانی تنازعات ان کی وفات کے بعد شروع ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعوے کر دیا کہ لوہارو کا پرگنہ انہیں ملنا چاہئے اور ان کے بھائیوں کی پنشنیں مقرر ہونی چاہئیں۔ بھائیوں نے یہ دعوے کر دیا کہ نواب صاحب مرحوم کے جمع کیے ہوئے نقد روپے، بیش بہا جواہرات اور دوسری چیزوں میں سے بھی انہیں حصہ ملنا چاہئے۔

---

[1] مولانا فخر الدین متبحر عالم و سر آمد کے اجل اہل اللہ سے تھے۔ خواجہ سلیمان تونسویؒ کا سلسلۂ فیض انہی سے آتا ہے بہادر شاہ کے پیر شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں انہی کے پوتے تھے ۱۲

آخر یہ جھگڑا دہلی کے برطانوی ریزیڈنٹ کے پاس پہنچا جس نے گورنر جنرل کے پاس رپورٹ پیش کی وہاں سے ریزیڈنٹ کو فیصلے کا مختار بنا دیا گیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو مل جائے اور شمس الدین احمد خاں کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہ رہے۔ ضیاء الدین احمد خاں کی نابالغی کے زمانے میں لوہارو کی آمدنی میں سے بعد وضع مصارف انتظام جو کچھ بچے اس کا نصف حصہ بنام ضیاء الدین احمد خاں سرکاری خزانہ میں جمع ہوتا رہے اور جب ضیاء الدین احمد خاں بالغ ہو جائیں تو لوہارو کی جاگیر دونوں بھائیوں میں بہ حصہ برابر تقسیم ہو جائے۔

یہ فیصلہ طرفین کو سنا دیا گیا اور منظوری کے لئے اوپر بھیج دیا گیا۔ حکومت ہند نے فیصلے سے اتفاق کیا لیکن اپنی طرف سے تجویز پیش کر دی کہ اگر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں راضی ہو جائیں تو انہیں جاگیر کی آمدنی کے برابر (بعد وضع مصارف انتظام و تحصیل) نقد روپیہ سالانہ ملتا جائے اور جاگیر شمس الدین احمد خاں کی تحویل میں رہے۔

ابھی یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ ریزیڈنٹ صاحب بدل گئے نئے ریزیڈنٹ نے حکومت ہند کی تجویز کے مطابق فیصلہ کر دیا کہ لوہارو کی جاگیر شمس الدین احمد خاں کی نگرانی میں رہے۔ اس فیصلے کی وجہ یہ قرار دی گئی کہ امین الدین احمد خاں نے ضیاء الدین احمد خاں کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانے میں داخل نہیں کیا۔ جاگیر کی آمدنی کا اندازہ پچیس ہزار روپیہ کیا گیا تھا جس میں سے پندرہ ہزار روپے انتظام پر صرف ہوتے تھے اور دس ہزار روپے کی رقم خالص بچت تھی۔ امین الدین احمد خاں نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ لوگوں کی سرکشی کے باعث پورا روپیہ وصول نہیں ہو سکا۔ اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ مالگزاری کے واجبات کی ادائی سے مزارعین کا انکار شمس الدین احمد خاں کی انگیخت کا نتیجہ تھا۔

امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں دونوں نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ اگر جاگیر لوہارو کو ہم سے چھیننا ہی منظور ہے تو اسے شمس الدین خاں کے حوالے کرنے کے بجائے سرکار انگریزی خود اس پر قابض ہو جائے۔ ریزیڈنٹ کو اوپر سے حکم ملا کہ اصل فیصلے کو نافذ کر دیا جائے لیکن اس نے تامل کیا۔ اور اس امر کا انتظار کرتا رہا کہ شاید حالات بہتر ہو جائیں اور

بھائیوں کے مابین مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

شمس الدین احمد خاں نے مسلسل اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ لوہارو کی جاگیر ان کے حوالے کی جائے آخر ریذیڈنٹ کو یہ مطالبہ قبول کرنا پڑا اور لوہارو کو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے چھین کر شمس الدین احمد خاں کے قبضے میں دے دیا گیا۔

**مسٹر ولیم فریزر کا زمانہ**

۱۸۳۰ء میں مسٹر ولیم فریزر دہلی کے ریذیڈنٹ مقرر ہو کر آئے۔ فریزر صاحب نواب احمد بخش خاں مرحوم کے نہایت گہرے دوست تھے ۱۸۰۵ء میں دہلی میں ڈیوڈ آکٹرلونی کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ نواب احمد بخش خاں کے تمام صاحبزادے انہیں "چچا" کہتے تھے انہوں نے ریذیڈنٹ ہوتے ہی پھر اس سلسلے کو اٹھایا اور تجویز پیش کی کہ لوہارو کا علاقہ نواب احمد بخش خاں کی تقسیم کے مطابق امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملنا چاہیئے۔ اگر امین الدین احمد خاں نے ضیاء الدین احمد خاں کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانے میں جمع نہیں کرایا تو اس پر اعتراض کا حق شمس الدین احمد خاں کو نہیں پہنچتا۔ بلکہ صرف ضیاء الدین احمد خاں یہ اعتراض پیش کرنے کے حقدار ہیں، جب اصل حقدار اس صورت حالات پر مطمئن ہے اور اس کے خلاف شاکی نہیں تو پھر دوسروں کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ مسٹر فریزر نے یہ بھی کہا کہ لوہارو کی آمدنی چالیس ہزار ہے۔ اور مزید اصلاح کے بعد توقع ہے کہ آمدنی ساٹھ ہزار ہو جائے گی۔ لہذا جاگیر کو ایک مقرر رقم پر شمس الدین احمد خاں کے حوالے کرنے سے چھوٹے بھائیوں کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے لیکن مسٹر فریزر کی تجویز کی شنوائی نہ ہوئی اور غالباً انہی کے مشورے کے مطابق امین الدین احمد خاں اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے خود کلکتہ گئے۔

**شمس الدین احمد خاں کے خلاف فیصلہ**

کلکتہ پہنچ کر انہوں نے تمام معاملات حکام والا کے گوش گزار کیئے تو فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ اور لوہارو کو نواب شمس الدین احمد خاں سے واپس لے کر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے حوالے کر دینے کا حکم مل گیا۔ شمس الدین احمد خاں کے وکیل نے فوراً کلکتہ سے یہ رپورٹ بصیغہ راز اپنے آقا کے پاس بھیجی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ رپورٹ پہنچی تو

شمس الدین احمد خاں اپنے رفقا اور مصاحبوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی انہوں نے دفعتہً کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔ کریم خاں نامی ایک دہیلا سوار بہت منہ لگا ہوا تھا۔ اس نے بلا تکلف کہا کہ ”سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو اور کھانا کس لئے ٹھنڈا کر رہے ہو“ شمس الدین احمد خاں نے اس پر خلاف معمول خفگی کا اظہار کیا۔ کریم خاں نے حالات معلوم کئے بغیر کہہ دیا کہ ”اگر دشمن سے آزار پہنچا ہے تو میں اس کا خاتمہ کر دوں گا“ شمس الدین احمد خاں نے کہا کہ ”شکم پرست لوگ یونہی باتیں بنایا کرتے ہیں“ کریم خاں نے فوراً جواب دیا کہ ”نواب صاحب! میں پٹھان ہوں میرے ساتھ دوسروں کی طرح طعن آمیز گفتگو نہ کیجئے“۔ نواب صاحب خاموش رہے۔ کریم خاں وہاں سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا تو وہاں نواب کا دیوان اور ایک خدمت گزار انیا میو بیٹھے تھے۔ ان سے نواب صاحب کی پریشانی کی حقیقی علت معلوم ہوئی۔

**فریزر کا قتل** اسی وقت کریم خاں انیا میو کو ساتھ لے کر فیروز پور جھرکہ سے دہلی روانہ ہو گیا تاکہ مسٹر ولیم فریزر کا خاتمہ کر دے جس نے لوہارو کی جاگیر شمس الدین احمد خاں سے چھنوائی تھی[۱]۔ بعض لوگوں کا بیان ہے۔ کہ کلکتہ سے فیصلے کی اطلاع پاتے ہی نواب نے خود فریزر کے قتل کی سکیم تیار کی۔ کریم خاں اور انیا کو دہلی بھیجا گیا تاکہ فریزر کو تنہا پا کر قتل کر ڈالیں۔ وہ دونوں دہلی آئے تین ماہ تک فریزر کے پیچھے لگے رہے لیکن وار کا موقع نہ مل سکا۔ ناچار وہ ناکام واپس چلے گئے۔ شمس الدین احمد خاں ان کی ناکامی پر بہت خفا ہوئے۔ دوسری مرتبہ پھر وہ دونوں دہلی آئے۔ ایک بندوق خرید کر اس کی نالی کٹوا کر چھوٹی کرائی تاکہ اسے بہ آسانی کپڑوں میں چھپایا جا سکے۔ دو ماہ تک انہیں باوجود تلاش مناسب موقع نہ مل سکا ایک روز معلوم ہوا کہ فریزر صاحب ایک جگہ دعوت میں بلائے گئے ہیں۔ کریم خاں راستے پر گھات میں بیٹھ گیا لیکن فریزر صاحب دعوت سے فارغ ہو کر کسی دوسرے راستے سے مکان پر پہنچ گئے۔ یہ موقع بھی جاتا رہا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو پھر ایک جگہ فریزر صاحب کی دعوت تھی۔ جب وہ رات کے وقت دعوت سے فارغ ہو کر واپس جا رہے

---

[۱] یہ واقعات مجھے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے معلوم ہوئے ۱۲

تھے تو ان کے مکان کے قریب کریم خاں نے انہیں گولی سے ہلاک کر ڈالا۔ اور خود بچ نکلا۔ لیکن شہر سے باہر نہ جا سکا قتل کی اطلاع ملتے ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ کریم خاں اور انیا نے مشورہ کر کے بندوق ایک کنوئیں میں پھینک دی۔ باقی سارے نشانات بھی زائل کر دیئے۔ نواب صاحب کی طرف سے اس دوران میں جتنے خط آئے تھے وہ سب جلا ڈالے چند روز کے بعد کریم خاں نے انیا کو تمام حالات کے متعلق ایک خط دے کر نواب صاحب کے پاس بھیجا۔ نواب صاحب قتل کی تفصیل سن کر بہت خوش ہوئے۔ انیا نواب صاحب سے مل کر باہر نکل رہا تھا کہ کریم خاں کے ایک قریبی رشتہ دار نے بہ نظر احتیاط نواب سے کہا کہ انیا جیسے آدمی کو جو تمام رازوں سے آگاہ ہے زندہ چھوڑنا خالی از خطرہ نہیں۔ اس کا بھی خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ انیا نے یہ بات سن لی۔ وہ فیروز پور سے نکل کر اپنے گھر پہنچا اور وہاں چھپا رہا۔ نواب کے آدمی اس کے پیچھے لگ گئے۔ انیا گھر سے نکل کر مختلف جگہوں میں چھپتا چھپاتا اور اپنی جان بچاتا ہوا پہلے آگرہ پھر بریلی پہنچ گیا۔ اس اثنا میں کریم خاں بعض شبہات کی بنا پر پکڑا گیا۔ کریم خاں کا سراغ مل جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شمس الدین احمد خاں اور مسٹر فریزر کی عداوت کا ہر شخص کو علم تھا اور عام رائے یہی تھی کہ فریزر کا قتل شمس الدین احمد خاں کی انگیخت پر ہوا ہے۔ اور اس کا ذمہ دار نواب ہی کا کوئی ملازم ہو گا۔ بدقسمتی یہ کہ جس کنوئیں میں بندوق پھینکی گئی تھی اسی میں ایک شخص کا لوٹا گر گیا اس نے سقوں سے کہہ کر لوٹا نکلوانا چاہا تو بندوق نکل آئی اور کریم خاں پر قتل کا جرم ثابت ہو گیا۔

**نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی کا حکم**

انیا کو بریلی میں یہ اطلاع ملی تو وہ سلطانی گواہ بن گیا۔ اور اس نے نواب کی شرکت و انگیخت کے متعلق گواہی دی۔ کریم خاں کو پہلے پھانسی مل گئی۔ بعد ازاں نواب کے لئے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا۔ ان کی ریاست ضبط کر لی گئی۔ اور اکتوبر ۱۸۳۵ء میں انہیں کشمیری دروازہ کے باہر نو سو فوجیوں کے پہرے میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ میت ان کے خسر مرزا مغل بیگ کے حوالے ہوئی جس نے نواب کو قدم شریف میں دفن کیا۔[۱۵]

---

[۱۵] یہ حالات کرنیل سلیمن نے اپنی کتاب "ریمبلس اینڈ ریکولکشنس" کی دوسری جلد میں لکھے ہیں (بقیہ بر صفحہ ۳۱)

کہتے ہیں نواب نے بڑی مردانگی سے جان دی۔ پہلے سبز لباس زیب بدن کیا لیکن وہ لباس اُتروا دیا گیا تو سفید لباس پہن لیا۔ پھانسی پر لٹکنے کے بعد ان کی لاش قبلہ رُخ ہوگئی۔ عام لوگوں نے اسے نواب کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر مدت تک زیارت گاہ عوام بنی رہی۔

شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد کوئی نہ تھی صرف لڑکیاں تھیں جن کی شادیاں بعد میں ہوئیں۔

نواب احمد بخش خاں کے دوسرے لڑکے نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو قرار پائے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب علاء الدین احمد خاں والی لوہارو بنے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کے بعد نواب سر امیر الدین احمد خاں مسند نشین ہوئے۔ وہ خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ پچھتر برس کا سن ہے۔ کئی سال سے ریاست کے کام سے علیحدہ ہیں۔ پہلے انہوں نے اپنے فرزند دلبند کو مسند نشین کر دیا تھا ان کے انتقال کے بعد نواب سر امین الدین احمد خاں کا نبیرہ مسند نشین ہو گیا۔

**صاحبزادوں کی اولاد**

نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادوں میں سے شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب کے متعلق زیادہ حالات معلوم ہیں۔ شہاب الدین احمد خاں کے دو صاحبزادے مشہور ہوئے شجاع الدین احمد خاں تاباں۔ اور سراج الدین احمد خاں سائل۔ سراج الدین احمد خاں زندہ ہیں اور شاعری میں کافی شہرت کے مالک ہیں۔ سعید الدین احمد خاں طالب وفات پا چکے ہیں۔

امین الدین احمد خاں۔ ضیاء الدین احمد خاں، علاء الدین احمد خاں اور شہاب الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ اور آخر وقت تک خوشگوار رہے۔ یہ لوگ بھی اس تاجدار اقلیم

---

(بقیہ صفحہ ۳۰) پنجاب گورنمنٹ کے پرانے ریکارڈ میں مسٹر فریزر کے قتل کے متعلق بھی بہت سے کاغذات موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیا میو کے بھائی اور ایک دوست نے خود دہلی پہنچ کر افسروں سے کہا تھا کہ اگر انیا کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا جائے تو وہ سارے حالات بتانے کے لئے تیار ہے۔ انہیں حفاظت کا تحریری یقین دلایا گیا تھا لیکن انیا اس وقت نہ آیا اس لئے کہ اسے نواب شمس الدین احمد خاں کی طرف سے گرانقدر انعام کا انتظار تھا۔

ممکن ہے نواب نے یا ان کے آدمیوں نے انیا کی اس بدعہدی کی اطلاع پا کر اسے قتل کرڈالنے کی کوشش کی ہو۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ نواب کی شرکت قتل کی بنیاد یا تو انیا کا بیان تھا۔ یا نواب اور مسٹر فریزر کی باہمی کشیدگی ۱۲

سخنوری کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ سارے اعلیٰ درجے کے فاضل اور ارباب علم و ذوق تھے سب کے نام غالب کے مکاتیب موجود ہیں۔ ایک مکتوب نواب سرامین الدین احمد خاں کے نام بھی ہے جو غالب کی وفات کے وقت غالباً آٹھ برس کے تھے۔ ضیاء الدین احمد خاں اور علاء الدین احمد خاں دونوں فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اول الذکر فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص فرماتے تھے۔ آخر الذکر کا تخلص پہلے تسنیمی تھا بعد ازاں علائی ہو گیا غالب نے عارف کے مرثیہ میں فرمایا ہے ؎

ہم سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

یہاں نیّر سے مراد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر ہیں۔ ایک اور غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

ہم سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

علائی سے مراد نواب علاء الدین احمد خاں ہیں۔ غالب نے نیّر اور علائی کو اردو اور فارسی میں اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ اور انہیں جانشینی کی سند عطا کی تھی۔ فارسی کلیات میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے لئے ایک قصیدہ موجود ہے جس میں لکھتے ہیں ؎

من آں سپہر کہ دانم چنانکہ مہر بہ ماہ — بہ مہر نور دہد نیّر منوّر من،
منم خزینہ رازنا و درخزینہ راز — ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق — بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ بہتر من
بہ مہر دل بہ برادر ہم نہ یعقوبم، — کہ پور خویش بود دلستان دلبر من

**خاندان لوہارو کی عقیدت** ان لوگوں کو غالب سے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے جو نواب سرامیر الدین احمد خاں کی زبان مبارک سے سنا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت اس وقت شرفا کا دستور کیا تھا۔ اور کس طرح ہر شخص تدریس و تعلیم کو خاندان کے اعظم و افضل کا حق جانتا تھا۔ نواب سرامیر الدین احمد خاں فرماتے ہیں کہ میں سات آٹھ برس کا تھا اس زمانے میں ایک مشاعرہ ہوا

جس میں نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب علاء الدین احمد خاں اور نواب شہاب الدین احمد خاں شریک ہوتے میں بھی ساتھ گیا۔ مشاعرہ کی غزلوں میں "بسمل" کا لفظ کئی مرتبہ سنا تو میں نے نواب شہاب الدین احمد خاں سے "بسمل" کے معنی پوچھے انہوں نے ادب کے ساتھ نواب علاء الدین احمد خاں کی خدمت میں عرض کیا کہ امیر الدین "بسمل" کے معنی پوچھتا ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے ادب کے ساتھ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی خدمت میں عرض کیا کہ "بسمل" کے معنی میں بتاؤں یا آپ بتائیں گے؟ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے فرمایا کہ جب مرزا غالبؔ زندہ ہیں۔ تو ہمیں "خود بسمل" کے معنی بیان کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مشاعرہ سے فارغ ہو کر اسی روز یا دوسرے روز سب غالبؔ کے پاس پہنچے اور یہ واقعہ عرض کیا۔ نواب امیر الدین احمد خاں فرماتے ہیں کہ غالبؔ ایک گاؤ تکیہ پر سر رکھے اور ٹانگیں اکٹھے کئے ہوئے کسی حد تک اوندھے لیٹے پڑے تھے۔ فرمانے لگے کہ جس حالت میں اس وقت میں ہوں سمجھ لو کہ اس حالت والے کو "بسمل" کہتے ہیں

### غالب پر مخبری کا شبہ

خاندان لوہارو کا صرف ایک فرد ہے جس کے متعلق غالبؔ کی تحریرات میں کسی مقام پر بھی کوئی کلمہ خیر نہیں ملتا۔ اور وہ نواب شمس الدین احمد خاں ہیں۔ اوپر تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں سے تنہا غالبؔ ہی آزردہ نہ تھے بلکہ سارا خاندان ناراض تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری کے سلسلے میں غالبؔ بھی متہم ہوئے یعنی دلی میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ غالبؔ نے مخبری کر کے نواب کو پکڑوایا ہے شمس الدین احمد خاں کے ساتھ دیرینہ نزاع اور عداوت کے علاوہ اس شبہ کی دو وجہیں اور ہوئیں۔ اول یہ کہ فریزر صاحب غالبؔ کے نہایت عزیز دوست تھے۔ دوسرے اس وقت شہر کے مجسٹریٹ فریسکاٹ (Frescot) صاحب تھے وہ بھی غالبؔ کے شناسا تھے۔ انہی دنوں میں غالبؔ کے خلاف دو ساہوکاروں نے زر قرض کی ڈگریاں لے رکھی تھیں اس زمانے میں اونچے طبقے کے آدمیوں کے خلاف ڈگریوں کے ضمن میں یہ دستور تھا کہ انہیں گھر کے اندر سے کوئی گرفتار نہیں کرتا تھا۔ البتہ باہر نکلنے پر گرفتار کر لیا جاتا تھا اس وجہ سے غالبؔ گرفتاری سے بچنے کے لئے سارا دن گھر کے اندر گزارتے تھے۔ اور گھڑی دو گھڑی رات گئے پر باہر نکلا کرتے تھے ان شبینہ سیروں میں وہ مجسٹریٹ صاحب سے بھی ملتے تھے۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ خفیہ خفیہ نواب شمس الدین احمد

خاں کی جاسوسی کرتے ہیں۔ اور تمام خبریں[۴۹] سے جاکر مجسٹریٹ کو پہنچاتے ہیں۔ غالب نے خود یہ سارے حالات شیخ امام بخش ناسخ کو لکھتے ہیں :۔

> مجسٹریٹ بہادر شہر کہ با من سابقہ معرفتے و علاقہ مودتے داشت و وے آں انزوا کہ گفتہ شدم (یعنی مقروضیت کے سلسلے میں گرفتاری کے خوف سے)..... گاہ گاہ بہ نزد وے رفتے و نفسے چند خوشگوار زدمے چوں ایں واقعہ رو داد (فریزر کا قتل) مرا در پژوہش کار رو دخل اسرار با خود انباز ساخت۔ تا آں شد کہ والی فیروزپور جھرکہ مجرم قرار یافت و بہ حکم سرکار باتنے چند از خاصان خود اسیر شد۔... چوں میانہ من و وے (شمس الدین احمد خاں) ناسازگاری بود و مردم شہر آں رائے دانستند ہمگی در من افتادند و گرفتاری آں کافر نعمت دادگرکش بہ گردن من بستند۔

یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مخبری کی ہو اور اوپر کی تحریر کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا میلان طبع شمس الدین احمد خاں کے حق میں نہ تھا بلکہ ان کے خلاف تھا۔ اور وہ نواب کی گرفتاری کے پورے ذمہ دار ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا دامن اس باب میں بالکل پاک نہ تھا۔ خود واقعہ قتل کی نسبت لکھتے ہیں :۔

> یکے از ستمگران ناخدا ترس کہ بہ عذاب ابدی گرفتار باد۔ ولیم فریزر بہادر را کہ ریزیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود در شب تاریک بہ ضرب تفنگ کشت و مراغم مرگ پدر تازہ گشت۔

اسی زمانے کی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزرے
زینساں بہ تیرہ دستی اعدا شود ہلاک

نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر سن کر نواب شمس الدین احمد خاں کی متوقع روش کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں :۔

> آوخ کہ چراغ روشن ایں دودمان مرد و شبستان آرزو ہا تیرہ و تار شد۔... ناکساں را روز بازار خواہد بود و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ، زود کہ انجمن از ہم پاشد، و پراگندہ چند گرد آیند و دولت روے

گرداند و آسودگی برخیزد۔

یہ ۱۸۲۷ء کی تحریر ہے جو ۱۸۳۵ء میں حرفاً حرفاً پوری ہوئی۔

ولیم فریزر نے ۱۸۳۴ء میں نواب امین الدین احمد خاں کو کلکتہ بھیجا تھا تو غالب نے اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے سفارشی خطوط لکھے جو ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں۔

نواب احمد بخش خاں مرحوم کے ایک عم زاد بھائی میرزا قدرت اللہ بیگ تھے۔ ان کے ساتھ بھی غالب کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ میرزا قدرت اللہ بیگ کے دو بیٹے تھے۔ میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں، سیف الحق سیاح کے نام کے دو خطوں میں ان کا بھی ذکر آیا ہے ایک خط میں فرماتے ہیں :۔

> ہاں صاحب برادر بہ جان برادر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

> میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب احمد بخش خاں کے، اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین احمد خاں سے۔

میرزا معین الدین حسین خاں کا مرتب کیا ہوا ایک روزنامچہ غدر خواجہ حسن نظامی صاحب کی مہربانی سے شائع ہو چکا ہے۔

تاہل کی زندگی کے متعلق غالب کے بعض بیانات

غالب کی تحریرات میں تاہل کی زندگی کے متعلق بعض ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیگم صاحبہ سے خوش نہ تھے یا تاہل کو ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر انہوں نے شادی کو "حکم حبس دوام" سے تعبیر کیا ہے اور بیوی کو "بیڑی" قرار دیا ہے۔ میر مہدی مجروح نے وبا کے متعلق

چھا تو جواب دیا کہ جب ایک چھیاسٹھ برس کا بڈھا اور چونسٹھ برس کی بڑھیا نہ مری تو کیوں کر سمجھا جائے کہ وبا تھی۔ "تف بریں وبا"۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال پر تفتہ کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کی قید سے نجات پانے کے بڑے آرزومند تھے، اس خط کے آخر میں حکیم سنائی کے حدیقہ میں سے بھی بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

"سبدچیں" میں ان کا ایک قطعہ ہے ؎

گیر کہ در روزِ حشر چوں تو بفسقی
برسرِ دوزخ نہند تیرہ نہنبن
سرپوش
لیک نہ باشد دراں مضیق مصیبت
در طلب نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقام صعوبت
شور تقاضائے ناروائے مہاجن

ان کی ایک رباعی ہے ؎

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری
دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند مے خرامی دانم
در خانہ زنے ستیزہ خوئے داری

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت
سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

ایک اور رباعی میں لکھتے ہیں ؎

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو
نازم بخدا چہرا توانا نبود

یہ تمام چیزیں اس خیال کے لئے تقویت کا باعث سمجھی جا سکتی ہیں کہ غالب تاہل کی زندگی سے نفور تھے۔ یا بیگم صاحبہ کے ساتھ عدم مطابقت کی وجہ سے تاہل ان کے لئے مصیبت بن گیا تھا اور

اس مصیبت کا اظہار مختلف صورتوں میں کرتے ہیں لیکن یہ خیال حقیقت کے بالکل خلاف ہے نظم ونثر کے تمام مندرجہ بالا کرشمے غالب کی طبعی شوخی فطری بے مبالی اور پیدائشی ظرافت کا نتیجہ ہیں۔ جو کچھ ان کے جی میں آتا تھا بلا تکلف کہہ دیتے تھے بعض مذہبی امور کے متعلق بھی ان کے لطیفے مشہور ہیں حالانکہ ان کے دل میں مذہب کا انتہائی احترام تھا۔

**بیگم صاحبہ سے محبت**

واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں۔ اگرچہ اعمال کے لحاظ سے دونوں میں نمایاں فرق تھا۔ غالب فطرتاً رند تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ بے حد پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ بیگم نے ازرہ کمال اتقا اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لیے تھے۔ اس لئے کہ غالب کم از کم شرب و نوش کے باب میں متقی نہ تھے لیکن اس کے باوجود طرفین میں گہری محبت آخری دم تک قائم رہی۔

**فرائض تاہل کی محبت آمیز بجاآوری**

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھر جاتے تھے اس کی تصدیق غالب کی مختلف تحریروں سے ہوتی ہے مثلاً میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا کیا صحبت رہے گی۔

نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانہ میں آکر ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب ہی کو لکھتے ہیں:۔

> آج جس وقت روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا شہاب الدین خاں تمہارا خط اور مصری کی ٹھلیا لے کر آیا

اس کو لوا کر گھر گیا۔

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔

> لو بھئی اب تم جاہو جاؤ میں اپنے گھر میں روٹی کھانے کو جاتا ہوں۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا قاطع ثبوت ہیں کہ وہ دن کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے تھے۔ اور یہ دستور اس وقت بھی قائم رہا جبکہ ان کے لیے چلنا پھرنا اچھا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اور بقول ان کے گھر پہنچ کر پالکی سے واپس آکر ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا تھا۔

غالب کی تحریرات میں کوئی مواد ایسا نہیں ہے جس سے تاہل کی زندگی پر پوری روشنی پڑ سکے۔ غالباً اس لئے کہ شرفا اس قسم کے تذکروں کو عام طور پر پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے فارسی اور اردو مکاتیب میں چند ایسے خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب دہلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کا پورا خیال رکھتے۔ اور متواتر خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے کلکتہ سے راستے جھجل کو خط بھیجے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> سہ قطعہ مکتوب ملفوف است یکے بہ جناب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں و یکے بہ خدمت جناب مولوی فضل حق صاحب و یکے بہ غم خانہ بدتر از ویرانہ غالب ناکام رسانند۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> اینک مکتوبے بے لفافہ درلف خط غم خانہ مے رسد۔

غالب سنہ ۱۸۶۰ء میں نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے پاس رام پور گئے تھے تو اس زمانے میں خاندانی پنشن بند تھی۔ وہ حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ گورنر جنرل کے چیف سکریٹری نے ان کے کسی خط کا جواب بھیجا جسے بیگم صاحبہ نے حکیم غلام نجف خاں سے کہہ کر بند کا بند رام پور بھجوا دیا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی لکھا کہ گھر خط جلد جلد لکھتے رہا کریں۔ جواب میں لکھتے ہیں:۔

> یہ تم کیا لکھتے ہو گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری استانی کو لکھتا ہوں (یعنی بیگم صاحبہ غالب) کیا تم سے نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سنا دو؟ اب ان کو (یعنی بیگم صاحبہ کو) خیال

ہوگا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لیے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ۔

انگریزی خط میں گورنر جنرل کے چیف سکریٹری نے یہ لکھا تھا کہ:۔

> حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔

غالب کو تشویش ہوئی کہ شاید بیگم صاحبہ پریشان ہوں کہ انگریزی خط کا مضمون کیا ہے حکیم غلام نجف خاں کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ لفافہ کھول کر پڑھ کیوں نہیں لیا تھا تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب بیگم صاحبہ کی ہلکی سی تشویش کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

رام پور ہی سے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :۔

> ظہیر الدین (ابن حکیم غلام نجف خاں) کی دادی (بیگم صاحبہ غالب) کا یہ عارضہ سرفہ و سعال رنجور ہونا، کلو کا مجھ سے خفا ہونا ...... مطالب معلوم ہوئے ...... اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماء اللحم کا ہے وہ کھنچوا دو اور روز خبر لیتے رہو

نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے انتقال اور نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے سلسلے میں غالب اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے تو حکیم غلام نجف خاں نے غالباً بیگم صاحبہ کے ارشاد کے مطابق ایک خط میں تشویش ظاہر کی تھی کہ شاید کھانے پینے کی چیزیں مزاج کے مطابق نہ ملتی ہوں۔ اس کے جواب میں رقم فرماتے ہیں:۔

> تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں بہت خوش اور تندرست ہوں ..... یہ خط لے کر تم اپنی دادی (بیگم صاحبہ) کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے۔ بے اصل ہے۔

ایک اور مکتوب میں جو رام پور کے سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:

> لڑکوں (باقر علی اور حسین علی ابنائے نواب زین العابدین خاں عارف) کے ہاتھ کے دو خط اکٹھے

ہوتے ان کی دادی کو بھجوا دیتے ہیں تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور استانی جی کو سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔

حکیم ظہیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور لڑکوں کی خیر و عافیت کہو، اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو دیر نہ کیجو۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا ثبوت ہیں کہ غالب نہ محض فرائض تاہل کی بجا آوری ہی میں مشغول تھے بلکہ ان فرائض کو دلی لگاؤ اور تعلق سے ادا کرتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ مالی مشکلات کے ہجوم میں وہ بعض اوقات بہت تنگ دل ہو جاتے تھے۔ اس حالت میں گھبرا کر ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے جن سے ان کے دلی خیالات و احساسات کو کوئی تعلق نہ تھا بلکہ انہیں وقتی پریشان خاطری کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے یا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے طبعی شوخی کا کرشمہ قرار دینا چاہیئے ایسی ہی ان کی تحریر بھی ہ

> بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے ایک تنہائی سے نفور ہر ایک کو تنہائی منظور ہے تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں میری سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آ جاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی۔ خدا نے لاولد رکھا تھا۔ شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق (بیگم صاحبہ) اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں (یعنی زین العابدین خاں کے بچے)

**اولاد** غالب کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ سات بچے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زن نہ رہا۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں :۔

> تمہارے لڑکا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ بہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے

زیادہ نہ ہوئی۔

جب اپنے ہاں اولاد کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو غالب نے اپنی بیگم صاحبہ کے بھانجے (یعنی بنیادی بیگم کے صاحبزادے) میرزا زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا۔ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ رشتے میں عارف بہت قریبی تھے۔ اور اس لئے بھی کہ بڑے خوش فکر شاعر تھے لیکن عارف بھی جوانی کے عالم میں دائمی مفارقت کا داغ دے گئے[1]۔ غالب نے ان کی وفات پر حد درجہ درد بھرا نوحہ لکھا جو ان کی بہترین اردو نظموں میں سے ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں　　مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہ شب چاردہم تھے مرے گھر کے　　پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی　　بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش　　کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غالب نے فارسی میں بھی عارف کی خوش فکری اور گہری الفت و محبت کے اظہار کے لئے ایک قطعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

آں پسندیدہ خوئے عارف نام　　کہ رخش شمع دودمان من است
آنکہ در بزم قرب خلوت انس　　غمگسار و مزاجدان من است

اس میں عارف کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

---

[1] میری تحقیق کے مطابق ان کی وفات ۱۸۴۸ء میں ہوئی ۱۲

ہم زکلکت خوش و دلم خوش دل — کاں نہال ثمر فشان من است
سود سرمایہ کمال منی — سخنت گنج شائگان من است
جائے دارد کہ خویش را نازی — کہ ظہور تو در زمان من است
جائے دارد کہ خویش را نازم — کہ فلانے ز پیروان من است
جاوداں باش اے کہ در گیتی — سخنت عمر جاودان من است
اے کہ میراث خوار من باشی — اندر آرد کہ آں زبان من است
از معانی ز مبدأ فیاض، — یاد آں تو ہرچہ آں من است

یہاں اتنا اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ عارف کی والدہ ماجدہ یعنی بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر نواب غلام حسین خاں سے اچھے نہیں رہے تھے اور نواب نے بیگم کو سات ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان دے کر علیحدہ کر دیا تھا فیروز پور جھرکہ سے بیگم کو سو روپے پنشن ملتی تھی۔ عارف کی شادی شمس الدین احمد خاں کی حقیقی بہن سے ہوئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں ان کے ساتھ اپنے بیٹوں کا سا سلوک کرتے تھے۔[1]

**عارف کے بچے**

عارف کے دو بچے تھے باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال کے بعد غالب اور ان کی بیگم صاحبہ حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر لے آئے۔ جب عارف کی والدہ یعنی بیگم صاحبہ غالب کی بڑی بہن کا انتقال ہو گیا۔ تو باقر علی خاں بھی غالب ہی کے پاس چلے آئے۔ غالب کو ان دونوں سے غایت درجہ محبت تھی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ان کو کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگرچہ خود بہت تنک مزاج تھے لیکن حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے سارے ناز اٹھاتے تھے۔ اور ان کی کسی بات پر بھی خفا نہیں ہوتے تھے۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

> سنو صاحب یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں۔ اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں میں تحمل کرتا ہوں

---

[1] یہ حالات میں نے پنجاب گورنمنٹ کے ان پرانے کاغذات سے معلوم کئے جو ریکارڈ آفس میں موجود ہیں اور جو ریاست لوہارو سے تعلق رکھتے ہیں۔

خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے جیسے اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں کہیں پانی لڑھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں کیوں گھبراؤں گا۔

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

اندر باہر سب روزہ دار ہیں، یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی، ہاں میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ خور ہیں وہی حسین علی خاں جس کا روز مرہ ہے “کھلونے منگا دو میں بھی بجار جاؤں گا”۔

رام پور کے دونوں سفروں میں دونوں صاحبزادے ساتھ تھے رام پور سے بھیجے ہوئے مکاتیب میں جابجا ان کا ذکر ہے، مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست ہے۔ فروری کے مہینے میں دس دس روپے دیے، دس دن میں اٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے (حسین علی خاں) کہ دادا جی کچھ ہم کو قرض حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے۔ مہینا دور ہے۔ دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔

ایک اور خط میں جو راستے سے لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :-

دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے میں چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا، دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا، میں نے پیٹھا تاس بھر کھچڑی آغاز کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہوگئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھا لیے۔ لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی، خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی ..... بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کچھ کھلونے خرید لاتا ہے، وہ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔

ہاپوڑ سے آگے کے سفر کی کیفیت کے سلسلے میں فرماتے ہیں :-

دونو گھوڑے کوتل آتے۔ دونو لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں، اب وہ آتے کھانا کھا لیا اور چلیے تم اپنی اُستانی (بیگم صاحبہ) کے پاس یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔

ایک اور خط میں رام پور ہی سے نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے دو آدمی میرے ان کے ساتھ تھے۔

**باقر علی خاں کی ملازمت** معلوم ہوتا ہے کہ باقر علی خاں غالب کی زندگی ہی میں اور غالباً غالب کی سفارش سے الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ اُردوئے معلّٰی میں ان کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط میں ان کے روزگار کی درستی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تسلی دی ہے کہ تمہاری ترقی جلد ہو گی۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

تمہاری دادی اچھی طرح ہے۔ تمہارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آ جاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی اور ملازمت کے بعد باقر علی خاں علیحدہ مکان میں چلے گئے تھے۔

"سبد چیں" میں ایک قطعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا باقر علی کے بچہ پیدا ہونے پر لکھا گیا تھا[۵۰]

بہ من ز مقدم فرزند میرزا باقر    سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت
چو قصد شد متعلق بہ گفتن تاریخ    طریق تعمیہ ورزیدہ جان غالب گفت

"جان غالب" کے اعداد میں "قصد" کے اعداد شامل کئے جائیں تو ۱۲۸۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔

باقر علی خاں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ اُردوئے معلّٰی میں ان کا تخلص کامل ظاہر کیا گیا ہے لیکن فارسی کے ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے[۵۱] کہ ان کا تخلص باقر تھا ممکن ہے اُردو میں کامل اور فارسی میں باقر تخلص کرتے ہوں حسین علی خاں بھی شاعر تھے۔ "اخبار الصنادید" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تخلص شاداں تھا[۵۲]۔ اور وہ نواب کلب علی خاں مرحوم کی سرکار سے وابستہ تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کی وفات کے بعد دونوں کا تھوڑی مدت میں انتقال ہو گیا۔

---

[۵۱] شمشیر تیز تر مطبوعہ ۱۸۶۸ء ص ۱۲ [۵۲] اخبار الصنادید جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔

**متعلقین کا خیال** غالب کو آخری ایام میں اپنے متعلقین کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا۔ کوئی جائداد نہ تھی۔ آمدنی کے تمام وسائل صرف ان کی زندگی تک کھلے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نہ خاندانی پنشن کے جاری رہنے کا کوئی امکان تھا نہ رامپور والا وظیفہ قائم رہ سکتا تھا نہ دوسری فتوحات مل سکتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں بہ اصرار لوہارو بلوا رہے تھے انہیں لکھتے ہیں:-

> واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونو بھائی (نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیا الدین احمد خاں) اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے (اس لئے کہ بھتیجی کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف برادر کوچک نواب احمد بخش خاں کے پوتے سے ہوئی تھی) نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالےٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونو کے سامنے مرجاؤں "تاکہ اگر اس خاندان کو روٹی نہ دوگے تو جینے تو دوگے اگر جینے بھی نہ دوگے اور بات نہ پوچھوگے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرنے کے وقت ان غمزدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔

**بیگم صاحبہ کی وفات** تحقیقی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب کی بیگم صاحبہ کا انتقال کب ہوا۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو فرماتے تھے کہ غالباً غالب کے پانچ برس بعد انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے بیگم صاحبہ کی تاریخ وفات سنہ ۱۸۷۴ء سمجھنی چاہئے[1]۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ غالب کی وفات کے وقت بیگم صاحبہ زندہ تھیں۔ لوہارو والوں کی طرف سے انہیں مستقل امداد ملتی رہی۔ بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ رامپور سے بھی وقتاً فوقتاً ان کے لئے کچھ رقم آتی تھی۔

**غالب کے ملازم** اس ضمن میں غالب کے ملازموں کا ذکر بھی مناسب ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور کو چھوڑ کر غالب کی مالی

---

[1] خاندان لوہارو کی بعض خواتین سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کا انتقال چھ ماہ بعد ہوا تھا۔

حالت کبھی بھی اطمینان بخش اور غیر مستقیم نہیں رہی لیکن ان کا نوابانہ اور امیرانہ ٹھاٹھ آخر دم تک قائم رہا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ہر دور میں کم از کم تین چار ملازم ضرور رہے۔ ان کے خطوں میں کلیان نامی ایک ملازم کا ذکر بار بار آتا ہے جو کہار تھا خط ڈاک میں ڈالنا ہو پارسل بھیجنا ہو چیزیں لانی ہوں یا کسی کے پاس پیغام بھجوانا ہو کلیان ہی ان تمام کاموں کا مہتمم نظر آتا ہے بعض خطوں میں ایاز نامی ایک ملازم کا ذکر آیا ہے۔ چند خطوں میں کلو داروغہ کا نام دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں "کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے" کلو رام پور کے سفر میں بھی ساتھ تھا چنانچہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

> میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش، کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہیں حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے نام کے خط میں جعفر بیگ اور وفادار کے نام آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

> کدار ناتھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا ہے یا نہیں۔

عنایت اللہ نامی ایک ملازم کا تذکرہ حکیم غلام نجف خاں کے نام کے خطوں میں آیا ہے مثلاً:-

> لڑکے بھی درست، آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت دو دن سے کچھ بیمار ہے خیر اچھا ہو جائے گا۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

> میں نے لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھیں اب عنایت اللہ کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں اور پچھوا منگاتا ہوں کہ تپا وہاں کیا لکھا جاتا ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط میں نیاز علی ملازم کا نام آیا ہے فرماتے ہیں۔

> باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع ۱۴ مرغ چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور ایک نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔

وفادار جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ملازمہ تھی۔ ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں

> بی بی وفادار جس کو تم بچے اور بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) نواب آپا کہتے ہیں، اب تمہاری پھپھی

(بیگم صاحبہ) نے انہیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کاٹی کے ہیں (یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

غدر میں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی۔ قلعہ کی تنخواہ بند تھی۔ خاندانی پنشن مسدود تھی، کوئی ذریعہ معاش باقی نہ تھا۔ زیور لُٹ چکا تھا۔ کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے ہیں، چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز باہر مداری کے جورو بچے بہ دستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے مہینے بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسہ کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔

مداری کا ذکر ایک فارسی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب رامپور گئے تھے۔ وہاں کچھ سامان چھوڑ آئے تھے۔ دہلی سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :۔

مداری خاں مے رسد و نامہ رامے رساند آنچہ از کالائے ناروائے من در آنجا باشد بہ وے بسپارند۔

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں ایک دُعا و دو آداب ملتوی۔ دوا، کلو اور کلیان کی بندگیاں پہنچیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

قرض دینے والا میرا ایک، مختار وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔

اِس خط سے بھی ظاہر ہے کہ نوکروں کی اچھی خاصی فراوانی تھی۔

غالب باوجود قلتِ آمد و فراوانیٔ مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ رامپور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کدارناتھ نے فلاں فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

ہاں بھائی گھر میں پوچھ لینا کہ کدارناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

**جوانی کی زندگی**

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ غالب متقی، پرہیزگار اور تہجد گزار نہ تھے علی الخصوص ان کی جوانی طرح طرح کی رنگینیوں اور آزادمشربیوں میں گزری تھی۔ بعض واقعات کے اشارے ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں۔

میرزا مہر نے اپنی محبوبہ کی وفات کو بہت محسوس کیا تھا۔ انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنا مشرب بھی بیان کرتے ہیں :-

ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے . . . . . . کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ۔

# استدراک

۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کے ٹائمز آف انڈیا میں "بمبئی کوریر" ۲۱ مئی ۱۸۳۶ء کی اشاعت سے بعض اقتباسات شائع ہوئے تھے۔ جن میں ایک اقتباس خاندان لوہارو کے متعلق تھا۔ یہ اقتباس میری کتاب کے باب دوم سے متعلق ہے۔ افسوس کہ کتاب اس سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اُسے بطور استدراک یہاں درج کیا جائے۔

"سننے میں آیا ہے کہ سوال اُٹھایا گیا ہے آیا حکومت فیروزپور جھرکہ کی جاگیر کو ضبط کرنے کی مجاز ہے؟ یعنی آیا شمس الدین کی سزائے موت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کی جاگیر بھی ضبط کر لینی چاہیے؟ اگر اس کے متعلق قانون دان اصحاب سے رائیں لی جائینگی تو ہمیں یقین ہے (اس تحقیقات میں) ان کا کافی وقت صرف ہوگا یہ ایک اہم قانونی مسئلہ ہے۔

"بیان کیا جاتا ہے کہ شمس الدین کا بھائی امین الدین خاں جو جائداد کا قانونی وارث ہے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اپنا حق قائم کرنے کے لئے آرا جمع کر رہا ہے۔

"فیروزپور جھرکہ کی جاگیر شمس الدین خاں کے والد نواب احمد بخش خاں کو دوامی طور پر دی گئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں نے حکومت کو بتا کر اور اس کے اتفاق رائے سے شمس الدین کی وفات پر یا دوسرے اسباب پیش آنے پر امین الدین خاں کو اس کا جانشین مقرر کیا۔

"جس جرم کے اثبات پر شمس الدین کو سزائے موت ملی وہ محض ارتکاب قتل تھا۔ حکومت سے بغاوت نہ تھی اور ضبطی جاگیر کا حکم صرف بغاوت کی بنا پر جائز سمجھا جا سکتا ہے۔

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ محولہ بالا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ اس کا فیصلہ ہم اُن اصحاب پر چھوڑتے ہیں جو قانون کی باریکیوں سے آگاہ ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر امین الدین کو ہندوستان میں کامیابی نہ ہوگی تو ان کا ارادہ ہے کہ مقدمہ انگلستان لے جائیں۔"

* * *

# تیسرا باب

## دہلی میں سکونت اور مکان

دم از ریاست دہلی نمی زنم غالب
منم ز خاک نشینانِ آں دیار یکے

**غالب دہلی میں کب آئے**

دہلی میں غالب کی آمد و رفت سات برس کی عمر سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے، وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دہلی میں آکر ابتدا میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہے تھے۔ جہاں نواب علاءالدین احمد خاں ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ اگر اکیاون برس کی مدت کو درست مانا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب نے ۱۸۱۱ء کے قریب جبکہ ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی دہلی میں سکونت اختیار کی۔

لیکن وہ منشی شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق (آگرہ) کو ان کے دادا منشی بنسی دھر کے حالات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس بیس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔

> (بیگم صاحبہ) نے انہیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کلائی کے ہیں (یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

غدر میں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی۔ قلعہ کی تنخواہ بند تھی۔ خاندانی پنشن مسدود تھی، کوئی ذریعہ معاش باقی نہ تھا۔ زیور لُٹ چکا تھا۔ کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

> اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے ہیں، چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز باہر مداری کے جورو بچے بہ دستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے مہینے پھر سے آگئے، کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔

مداری کا ذکر ایک فارسی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب لوہارو گئے تھے۔ وہاں کچھ سامان چھوڑ آئے تھے۔ دہلی سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :۔

> مداری خاں مے رسد و نامہ را مے رساند آنچہ از کالائے ناروائے من در آنجا باشد بہ وے سپارند۔

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

> باقر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں ایک دُعا اور دو آداب ملتوی۔ دعا، کلو اور کلیان کی بندگیاں پہنچیں۔

اب اور خط میں لکھتے ہیں :-

قرض دینے والا میرا ایک مختار وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہیے مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، بچے جُدا، شاگرد پیشہ جُدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔

اِس خط سے بھی ظاہر ہے کہ نوکروں کی اچھی خاصی فراوانی تھی۔

غالب باوجود قلت آمد و فراوانی مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ رام پور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کدارناتھ نے فلاں فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

ہاں بھائی گھر میں پوچھ لینا کہ کدارناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی ؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیجدی ہے۔

**جوانی کی زندگی** یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ غالب متقی، پرہیزگار اور تہجد گزار نہ تھے۔ علی الخصوص ان کی جوانی طرح طرح کی رنگینیوں اور آزاد مشربیوں میں گزری تھی۔ بعض واقعات کے اشارے ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں۔

میرزا مہر نے اپنی محبوبہ کی وفات کو بہت محسوس کیا تھا۔ انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنا مشرب بھی بیان کرتے ہیں :-

ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے . . . . . . کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔

* * *

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے انیس بیس برس کی عمر تک آگرہ کی سکونت ترک نہیں کی تھی۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو دہلی میں ان کی مستقل سکونت ۱۸۱۵ء کے بعد ہوئی اغلب ہے کہ ۱۸۱۷ء یا ۱۸۱۸ء میں ہوئی ہو۔

میر اعظم علی صاحب مدرس مدرسہ اکبر آباد کے نام فارسی خطوط میں ایک خط ہے جس میں اپنی مالی پریشانیوں اور پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کے لئے سفر کلکتہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> روزگار برگشت، کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ بہ کنج نشستہ ام و در آمیزش بروئے بیگانہ و آشنا بستہ۔

غالب ۱۸۳ء میں کلکتہ سے واپس آئے۔ لہٰذا مندرجہ بالا خط ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں اپنے زمانہ مفارقت کی نسبت لکھتے ہیں:-

> درازی زمان فراق کہ بہ گمان مخدومم شانزدہ سال است و بہ دانست نامہ نگار کم از بست سال نیست۔

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۶ء میں غالب کو آگرہ چھوڑے ہوئے قریباً بیس برس گزر چکے تھے۔ اس حساب سے دہلی میں مستقل سکونت ۱۸۱۶ء یا ۱۸۱۷ء میں اختیار کی گئی۔

کالے میاں کی حویلی

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے دہلی میں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا تھا:-

> ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ کے رہے تھے جب ایک مکان سے جی اُکتایا اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قرب و جوار کے سوا کسی اور محلے میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں بڑے خدا پرست اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کے والد شیخ قطب الدین اور دادا شیخ فخر الدین تھے۔ جن کا سلسلۂ فیض شیخ کلیم اللہ جہان آبادی تک پہنچتا ہے۔ شیخ

نصیر الدین بہادر شاہ کے پیر تھے۔ غالب کے ساتھ آپ کو بہت محبت تھی۔ اپنی ایک حویلی غالب کو رہنے کے لئے مفت عطا کر دی تھی۔ اور دربار شاہی میں غالب کی ملازمت بھی آپ ہی کے وسیلہ سے ہوئی شعبان بیگ کی حویلی کے بعد سب سے پہلا مکان جس میں غالب کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ کالے میاں کی حویلی ہی تھی۔ یہ حویلی اب بھی گلی قاسم جان میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی قید کے بعد تک اسی حویلی میں رہتے تھے۔ قید کا واقعہ سنہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی مشہور ہے کہ قید سے رہا ہونے پر کسی دوست نے مبارکباد دی تو فرمانے لگے کون کہتا ہے میں قید سے رہا ہوا ہوں پہلے "گورے" کی قید میں تھا اب "کالے" کی قید میں ہوں

**حکیم محمد حسن خاں کی حویلی**

کالے میاں کے مکان کو چھوڑ کر غالب نے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی کرایہ پر لی۔ وہ اس حویلی میں اپنی سکونت سنہ ۱۸۵۰ء سے بتاتے ہیں، غدر کے بعد دہلی میں جو حالات پیش آ رہے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ یہ لکھ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار سنہ ۱۸۵۰ء سے حکیم[۱] ٹپیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء والی تاریخ درست نہیں۔ وہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کے ایک مکتوب میں تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور بلی ماراں میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں۔

تفتہ غالب کے ساتھ مسلسل خط و کتابت رکھتے تھے۔ بہ ظاہر یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کو دو برس تک تبدیل مکان کی اطلاع نہ ملی ہو میرا خیال ہے کہ غالب اواخر سنہ ۱۸۵۱ء یا اوائل سنہ ۱۸۵۲ء میں کالے صاحب والا مکان چھوڑ کر حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں آئے اور جولائی سنہ ۱۸۶۰ء تک اس مکان میں رہے

---

[۱] حکیم محمود خاں کے بھائی مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم تھے وہ پٹیالہ والے حکیم مشہور تھے حکیم محمد حسن اسی خاندان میں سے تھے ۱۲

وہ علاءالدین خاں کو تحریر فرماتے ہیں :-

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمدگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرائے اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں ناچار یہ چاہا کہ بلی ماراں میں ایک مکان ایسا ملے جس میں جا رہوں نہ ملا۔ تمہاری چھوٹی پھوپھی نے بیکس نوازی کی کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرائے قریب ہو۔ مگر خیر بہت دور بھی نہیں کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا ایک پاؤں زمین پر ہے ایک پاؤں رکاب میں توشہ کا وہ حال گوشہ کی یہ صورت۔

اسی مکان کی نسبت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

دس گیارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپے کرایہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے (یعنی غلام اللہ خاں نے) پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کردو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے۔ اس میں پاڑ بندھ گئی رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت۔ پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹہرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزاریں دوشنبہ ۹ جولائی (سنہ ۱۸۶۰ء) دوپہر کے وقت مکان ہاتھ آگیا۔ وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔

حکیم محمد حسن والے مکان میں بہت آرام نہ تھا۔ غالب ایک خط میں جو پنشن کی بندش کے زمانے کا لکھا ہوا ہے یعنی (سنہ ۱۸۵۸ء یا سنہ ۱۸۵۹ء کا) میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری

ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔

لیکن غالب نے اسے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک نئے مالک مکان نے انہیں پے بہ پے تقاضوں سے نہ نکالا۔

حکیم صاحب والے مکان کا کرایہ چار روپے ماہانہ تھا جب تک پنشن کھلی تھی کرایہ ماہ بہ ماہ ادا کرتے تھے۔ غدر میں پنشن بند ہوگئی تو تین برس کا کرایہ چڑھ گیا مئی ۱۸۶۰ء میں چڑھی ہوئی پنشن یک مشت ملی تو چڑھا ہوا کرایہ یک مشت ادا کر دیا۔ کروڑال والی حویلی جس کا ذکر جولائی ۱۸۶۰ء کے مکتوب میں ہے غالباً کرایہ پر نہیں لی تھی بلکہ مفت رہنے کو مل گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس حویلی میں کب تک رہے۔

نیا مکان

میرا خیال ہے کہ بعد ازاں انہوں نے کرایہ پر ایک مکان لے لیا تھا۔ اس لئے کہ جولائی ۱۸۶۴ء کے ایک خط (موسومہ نواب علاء الدین احمد خاں) میں فرماتے ہیں کہ برسات کی شدت کے باعث مکان میں تکلیف ہے مینہ بند ہو تو مالک مکان مرمت کرا دے:۔

> میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں تمہاری پھوپھی (بیگم صاحبہ غالب) کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے۔ اپنی پھوپھی[لہ] کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب لوگ (غالب) اور میم (بیگم صاحبہ) اور بابا لوگ (باقر علی اور حسین علی خاں) اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد (امین الدین احمد خاں) کی ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر اور احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر اور سہی۔

---

[لہ] بیگم صاحبہ غالب جو علاء الدین احمد خاں کے والد کی عم زاد بہن تھیں ۱۲

اگر یہ مکان وہی ہوتا جو مفت رہنے کو ملا تھا تو مالک مکان سے مرمت کرانے کا سوال درمیان میں نہ آتا۔

نواب امین الدین احمد خاں نے غالب کی خواہش پوری کر دی یعنی مطلوبہ مکان ان کے حوالے کر دیے لیکن اس دوران میں مینہ کا زور ختم ہو گیا۔ اور جس فقدان راحت نے غالب کو تبدیل مسکن پر آمادہ کیا تھا وہ رخصت ہو گیا۔ لہٰذا وہ پہلے ہی مکان میں بیٹھے رہے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۴ء کے مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

> تم نے میانجی گری کی۔ بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو۔ وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تاقیامت رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اجمال کی تفصیل یہ کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا (حسین علی خاں) ڈرنے لگا اس کی دادی (بیگم صاحبہ) بھی گھبرائی مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے کا چھوٹا سا درہ یاد تھا جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو اسی دروازے سے تم دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنایا چاہتا تھا۔ کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل کا چھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنہاری ان فرقوں کا ممر (گذرگاہ) دروازہ رہے گا۔ میری اور بچوں کی آمد دیوان خانہ میں سے رہے گی عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت چھپا چھپایا نظر آئیں .... معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے لئے اور لڑکوں کے مکتب کے لئے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمہاری خاطر جمع رہے اسباب وحشت و خطرات نہ رہے مینہ کھل گیا ہے مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات، ہوا سرد تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا ادھر مشرق سے زہرہ نکلی، صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جانے کو بہت بار سمجھتے تھے حکیم محمد حسن صاحب والا مکان اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک نئے مالک نے انہیں زبردستی نہ اٹھایا

"پیاری کماری رحیانہ"

اور یہ مکان باوجود نئی قیامگاہیں مفت مل جانے کے نہ چھوڑا اگرچہ وہاں انہیں آرام نہ تھا۔

پھر مکان بدلا

ستمبر ۱۸۶۵ء میں پھر نئے مکان کی تجویز ہوئی۔ اور ساڑھے پانچ روپے کرایہ پر ایک مکان روک لیا گیا۔ ایک مہینے کا کرایہ ادا کر دیا گیا لیکن رام پور کے دوسرے سفر تک اس میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو رام پور سے ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

> مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں۔ شہاب الدین خاں کو لکھا، شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں ستمبر کے ساڑھے پانچ روپے دے آیا ہوں۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر یہ ساڑھے سولہ روپے آکر دوں گا بلکہ موقع بنے گا تو یہ سرمایہ یہاں سے بہ طریق ہنڈوی بھیج دوں گا۔ اسمٰعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور یہ کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں۔ اور حویلی کے پاخانہ کی صورت درست کرا دیں[۱]۔

غالباً یہ وہی مکان ہے جس میں غالب کا انتقال ہوا[۲]۔

برسات کی تکلیف اس مکان میں بھی باقی رہی اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالاخانہ کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے، جاگنے جینے مرنے کا محل ہے اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی کہیں لگن کہیں چلمچی۔

---

[۱] اردوئے معلّٰی میں اس مکتوب پر تاریخ ۱۸۶۵ء کے بجائے ۱۸۶۰ء درج ہے لیکن معلوم ہے کہ غالب صرف رام پور گئے پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۰ء میں گئے اور مارچ ۱۸۶۰ء میں واپس آئے۔ دوبارہ نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے اکتوبر ۱۸۶۵ء میں گئے اور جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس آئے لہٰذا اس خط کی صحیح تاریخ ۱۲ نومبر ۱۸۶۰ء نہیں بلکہ ہونی چاہیئے۔ اردوئے معلّٰی میں ایسی کئی غلطیاں ہیں ۱۲

[۲] کوچہ بلی ماراں کی طرف سے گلی قاسم جان میں مڑیں تو عین موڑ پر بائیں ہاتھ مسجد ہے اس مسجد کے ساتھ کا مکان جو دواخانہ کی موجودہ عمارت کے بالکل سامنے ہے۔ غالب کا مکان تھا بظاہر اس کی ہیئت اب بدل گئی ہے ۱۲

کہیں اُگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اُٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیئے۔ مالک مسرت کی طرف متوجہ نہیں کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔

مکان اگرچہ اپنا کبھی نہیں بنوایا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا لیکن مذاق اس باب میں بھی بے حد نفیس اور عمدہ تھا۔ حکیم غلام نجف خاں نے غالباً ایک مکان تجویز کیا تھا۔ اس کے ضمن میں حکیم صاحب کو لکھتے ہیں :۔

> حضرت غور کی جگہ ہے۔ ایک مکان دلکشا کوچے کی سیر۔ بازار کا تماشا۔ دو کمرے۔ دو کوٹھریاں آتش دان صحن وسیع، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے۔ دروازہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے۔ اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع۔ گوہ کے ڈھیر کہیں حلال خور کا بچہ ہگ رہا ہے کہیں بیل بندھا ہوا ہے کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں۔

---

Nihal Kureshi

◆

# چوتھا باب

## سفر کلکتہ

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

سیاحت کے متعلق غالب کی اُردو اور فارسی تحریرات میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں۔ فارسی کے ایک مکتوب میں رائے چھجمل کو لکھتے ہیں :-

جلا وطن، عزم سفر و آلام غربت مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد۔

اُردو کے ایک خط میں سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو تحریر فرماتے ہیں :-

میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہو گے میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں ؎

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

خیر اگر سیر و سیاحت میسر نہ سہی ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کی میاں داد خاں سیاح کی سرگزشت سیر و سفر ہی سہی۔

ان دونوں رایوں میں تطبیق مشکل نہیں صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ پہلی رائے حالت سف
میں ظاہر کی گئی دوسری رائے حالت حضر میں مرقوم ہوئی۔ غالب سیر و سیاحت کو واقعی دوست رکھتے تھے لیکن نازک مزاجی کے باعث ان شداید کے تحمل اور ان تکالیف کی برداشت کے اہل نہ تھے جو لازمۂ سفر ہیں اس لئے جب خود سفر میں تھے اور قدم قدم پر مختلف تکلیفیں پیش آ رہی تھیں یاد دلا

لی بے فکری اور فراغت بال میسر نہ تھی تو پکار اُٹھے کہ غربت کے آلام خدا کرے کسی کو نصیب نہ ہوں، لیکن جب حالت حضر میں دوسرے شخص کے سفر کے دلچسپ اور دلکش حالات پڑھے تو آرزو پیدا ہوئی کہ ایسے حالات مسلسل و متواتر ملتے جائیں تا کہ لطف اندوزی کے سلسلے میں انقطاع پیدا نہ ہو۔

**سفر کلکتہ کی تاریخ** غالب نے لمبا سفر صرف ایک کیا ہے یعنی کلکتہ کا سفر جس میں وہ کچھ کم تین برس دہلی سے باہر رہے۔ یہ سفر خاندانی پنشن کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اس کی تاریخ کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا ہوئی وہ فرماتے ہیں کہ سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا تھا[1]۔ تمام سوانح نگاروں نے بلا تحقیق اس بیان کو درست تسلیم کر لیا، اور نہیں سوچا کہ یہ بیان غالب کی بعض دوسری تحریرات سے مطابقت نہیں کھاتا۔ تاریخ کے متعلق غالب کا سہو محل استعجاب نہ تھا لیکن ان کے وہ مفصل بیانات اس سہو کی بنا پر غلط نہیں مانے جا سکتے تھے جو ان کی فارسی نثر میں جابجا موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غالب کے کسی سوانح نگار نے ان کی تصانیف بالاستیعاب نہیں پڑھی تھیں، یا ترتیب سوانح کے وقت ان تصانیف سے پوری مدد نہیں لی تھی۔ خواجہ حالی مرحوم بھی اس زمرہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

**سنہ ۱۸۳۰ء والے بیان کی تغلیط کے وجوہ** سنہ ۱۸۳۰ء والے بیان کی تغلیط کے وجوہ ذیل میں درج ہیں:۔

(۱) غالب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ زندہ تھے۔ کلکتہ کے راستے میں غالب کو نواب صاحب کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ وہ خود کلکتہ سے میرزا علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں:۔

> میر فضل مولے خاں نام یارے داشتم اورا ناگرفت در عرض راہ خبر شد در سواد گفتگو ما پرس وجوہا کہ رفت از جامہ گزشتن فخر الدولہ (نواب احمد بخش خاں) بہ من خبر داد۔ باز بہ کلکتہ میرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند آوخ کہ چراغ روشن ایں دودمان مُرد۔

نواب احمد بخش خاں کے متعلق معلوم ہے کہ ان کا انتقال اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء مطابق ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲ (خط بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی)

۱۸۳۰

میں ہوا ان کی تاریخ وفات "مینو مقام فخر الدولہ" ۱۲۴۳ھ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب اکتوبر ۱۸۲۷ء سے چند ماہ قبل[1] دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔

(۲) غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے تھے ان کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر اودھ کے نائب السلطنت اور وزیر اعظم تھے[2]۔ یہ معلوم ہے کہ معتمد الدولہ آغا میر غازی الدین حیدر کی وفات تک، جو ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو واقع ہوئی مختار کل رہے اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا۔ چند ماہ کے اندر اندر آغا میر برطرف ہو گئے۔ اور ان کی جگہ اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت بنے۔ غالب بہرحال آغا میر کے اقتدار کے زمانے میں لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اور یہ واقعہ ۱۸۲۷ء سے بعد کا نہیں مانا جا سکتا۔

(۳) غالب نے کلکتہ پہنچ کر اپنا مقدمہ کونسل میں پیش کیا تھا تو کونسل کے ممبروں میں ایک شخص ولیم بیلی تھے جن کے متعلق غالب ایک مکتوب[3] میں فرماتے ہیں کہ ولیم بیلی سیاحت کے لئے برما چلے گئے ہیں۔ مقدمہ کونسل میں پیش ہونے کے بعد غالب کم و بیش دو برس کلکتہ میں رہے۔ اور ولیم بیلی ۱۸۳ء میں پنشن لے کر تمام کاروبار سے سبکدوش ہو چکے تھے[4]۔ ظاہر ہے کہ غالب ولیم بیلی کے پنشن لینے سے کم از کم دو برس قبل ضرور کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے۔

(۴) غالب کا مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تھا تو اس وقت حکومت ہند کے چیف سکرٹری مسٹر اینڈریو سٹرلنگ تھے۔ وہ غالب کے خاص ہمدرد بن گئے تھے[5]۔ ان کی مدح میں غالب نے پچپن شعر کا ایک قصیدہ کہا جو ان کے فارسی کلیات نظم میں موجود ہے[6]۔ مسٹر اسٹرلنگ نے ۲۳ مئی ۱۸۳۳ء کو وفات پائی تو غالب نے ان کی وفات پر جو قطعہ لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں:-

بہ صد نشاط سی و پنج سالہ از دنیا　　جریدہ رفت جواناں چناں روند چنیں
بہ روز بست و سوم از مئی بہ ہنگامے　　کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور مکیں

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵ و صفحہ ۶۷۔ [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹۔ [3] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۳۱۔ [4] کلیات فارسی صفحہ ۱۶۷۔ [5] کلیات نظم فارسی صفحہ ۲۸۲۔ [6] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۴۱۵۔

ہزار وحشت صد سی زعہد عیسیٰ نو      کہ جست برق جہاں سوز ایں الم زکیں

غالب مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کی وفات کے وقت کلکتہ سے دہلی واپس آچکے تھے[۵۱]۔ لہٰذا ان کے سفر کلکتہ کی تاریخ اس واقعہ سے کم و بیش تین برس قبل ماننی چاہیئے۔

(۵) خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کے نام کے ایک خط سے مستفاد ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے۔ فرماتے ہیں:-

حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا جو سنہ ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں

صحیح یوں ہے ؎

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں

قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھاتے نہیں،

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ جانے کا بیان کسی حالت میں بھی قابل تسلیم نہیں میرا خیال ہے کہ یہ طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اگر طباعت کی غلطی نہیں ہے تو ماننا چاہیئے کہ غالب کو سہو ہوا اور چونکہ یہ خط سفر کلکتہ سے کم و بیش چالیس برس بعد لکھا گیا تھا۔ اس لئے تاریخ کے باب میں سہو مستبعد نہ تھا۔

**دہلی سے روانگی** اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کب دہلی سے روانہ ہوئے؟ اوپر جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔ ایک فارسی مکتوب میں وہ فرماتے ہیں کہ ۲۶ ذی قعدہ کو لکھنؤ سے چل کر ۲۹ ذی قعدہ کو کان پور پہنچا[۵۲]۔ اس میں سال درج نہیں لیکن اس کا فیصلہ مشکل نہیں نواب احمد بخش خاں کی وفات ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ میں ہوئی اور اس وقت غالب کلکتہ سے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ اس لئے ماننا چاہیئے کہ وہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ میں تھے اس زمانے میں غازی الدین حیدر پادشاہ اودھ تھے میرے نزدیک اغلب ہے کہ وہ سنہ ۱۲۴۲ھ کی عید شوال کے بعد دہلی سے روانہ ہوئے ہوں۔

**خواجہ حالی کا بیان** خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر فرمانروا

---

[۵۱] کلیات فارسی صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱ [۵۲] کلیات فارسی نثر صفحہ ۱۵۸ -

اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے[5]۔ خواجہ مرحوم کا یہ سہو حد درجہ تعجب انگیز ہے۔ غالب کی متعدد تحریرات میں صراحتہً مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے معتمد الدولہ کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت بنے۔ ان کے بعد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو نیابت کا منصب عطا ہوا۔ حکیم صاحب کے بعد نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت غالب کو سفر کلکتہ سے واپس آئے ہوئے کم و بیش دو برس گزر چکے تھے۔ خواجہ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس وجہ سے ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے قصیدہ میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔ اگر غالب کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیش نظر ہوتیں تو یہ سہو ان سے سرزد نہ ہوتا۔ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر "کچھ کم چالیس برس" کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت غالب کی عمر سنین قمری کے اعتبار سے چند ماہ اوپر تیس برس کی ہوگی۔ سنین شمسی کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس کی ہوگی۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق سنہ ۱۸۳۰ء والے بیان کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی ماننی چاہیے تھی۔ ادا وسوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو "کچھ کم چالیس برس" سے تعبیر کرنا مستحسن طریق بیان نہیں ہے۔

**سفر کلکتہ کی غرض**

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ سفر کلکتہ خاندانی پنشن کے مقدمہ میں قانونی چارہ جوئی کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ اس مقدمہ کے تفصیلی حالات ایک علیحدہ باب میں بیان ہوں گے۔ یہاں اختصاراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ غالب کے خیال کے مطابق انہیں جو پنشن فیروز پور جھرکہ سے ملتی تھی وہ مقررہ سے کم تھی۔ غالب کا دعوے یہ تھا کہ انہیں اور دوسرے اہل خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ ملنے چاہئیں۔ فیروز پور جھرکہ والے تین ہزار روپے سالانہ دیتے تھے۔ جب تک فیروز پور جھرکہ کی عنان نظم ونسق نواب احمد بخش خاں کے ہاتھ میں رہی۔ غالب خاموش بیٹھے رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب صاحب پنشن کے علاوہ بھی غالب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن جب نواب صاحب نے ۱۸۲۶ء میں اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو مسند نشین کر کے خود گوشہ نشینی اختیار فرما لی تو جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اور غالب

---

[5] یادگار غالب صفحہ ۲۵۔

پوری پنشن کے لئے چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نواب سرامیرالدین احمد خاں والی لوہارو فرماتے تھے کہ شمس الدین احمد خاں نے پنشن بالکل بند کر دی تھی۔ بہ ہر حال پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے سلسلے میں غالب کلکتہ گئے تھے۔

**منازل سفر** دہلی سے لے کر لکھنؤ تک کے منازل سفر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں لکھنؤ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا۔

> مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا (غالب) ایک بار لکھنؤ آئیں اس لئے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔

**قیام لکھنؤ** بہ ہر حال غالب ماہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ میں تھے۔ اکابر لکھنؤ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ غالب کو امید تھی کہ بادشاہ لکھنؤ سے انہیں اچھی رقم مل جائے گی۔ اس وجہ سے وہ کافی دن لکھنؤ میں ٹھہرے رہے۔ انہوں نے بادشاہ یا نائب السلطنت کے لئے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا۔ نائب السلطنت کے ساتھ ملاقات کی صورت سامنے آئی تو جلدی میں صنعت تعطیل میں ایک نثر لکھ لی۔ جو ان کے کلیات نثر میں موجود ہے[1]۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

> مہربانان گرد آمدند و بزرگان انجمن شدند و رفتہ رفتہ ذکر خاکسار ریماسے مرا بہ بزم آغا میر نامی از سادات عامہ آں دیار کہ در آں روزہا بہ آہنگ معتمد الدولگی بلند آوازہ بودہ بہ ترخانی فرمانروائے آں کشور و مدار المہامی آں سلطنت اشتہار داشت رسانیدند تا از آں جانب ایماء کششے رفت ازیں سو نیز آشوب ہوسے گل کرد۔ چوں ملازمت قرار یافت خواستم دستمایہ عقیدتے سرانجام دادن و رہ آورد عالم عبودیتے عرضہ داشتن طبع از فکر قصیدہ تنگی کرد و سینہ بریں آرزو تنگی جنون شوقم بہ پیدائے کنار ناپیدائے نثر انداخت و سواد عبارتے ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت۔

لیکن معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب خود لکھتے ہیں:۔

> اگرچہ وقت اقتضائے دیدن آں جاہ مند نہ دید و آں ہوس از سینہ بدر نشد اما آں سودہ و سفینہ ماند

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۵۵۔

غالب نے ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ محض یہ لکھی ہے :-

آنچہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود۔ تفصیل این اجمال و توضیح این ابہام جز بہ تقریر ادا نتواں کرد۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں جو منظور نہ ہوئیں۔ اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں، دوم نذر پیش کرنے سے انہیں معاف رکھا جائے۔

آغا میر کے متعلق غالب کی رائے

غالب رائے چھجمل کو معتمد الدولہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

ہر چہ در آں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانی این گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ می شد بخدا کہ حال برعکس است۔ در ابتدائے دولت ہر کہ دانا است حصول مدعائے خود در پیروئے بیچیدہ۔ لاجرم یک دو کس بہ ہر رنگ متمتع گشتند و اکنوں کہ از استحکام اساس دولت خود خاطرش جمع است۔ در بند جمع زر افتادہ است جملہ خاندانہائے قدیم لکھنؤ از بیداد ایں بے رحم بہ سیلاب فنا رسیدہ و ناز پروردگان ایں دیار آوارہ جہات گیتی گردیدہ و او خود از تنگ دستی و سر افتادگی پشیماں شدہ و ازیں شیوہ برگشتہ باکجایہ بازار بیداد گرم است مہاجناں و ساہوکاران و تاجران پنہاں پنہاں زر و مال خود بہ کانپور می رسانند۔ و امین نیند ہر کہ بود گریخت و ہر کہ ہست در بند گریختن است چوں حال ایں دیار بدیں رنگ است آں خوشتر کہ سخن از خود نگویم بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ روز جمعہ از آں ستم آباد برآمدم و بتاریخ بست و نہم در دار السرور کانپور رسیدم ایں جا دو سہ مقام گزیدہ رہگرائے باندہ می شوم۔

معتمد الدولہ آغا میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی ناکامی پر خفگی کا نتیجہ قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ یہ حرفاً حرفاً [illegible]

غالب کے اردو دیوان میں "و" کی تختی میں ایک غزل ہے جس کے آخر میں یہ قطعہ ہے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی　　ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر　　عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ　　جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

---

لہ آغا میر کا نام سید محمد اور خطاب معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ تھا۔ وہ اصلاً کشمیری تھا۔ اور غازی الدین حیدر کی [illegible]

# غالب کے ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کا عکس

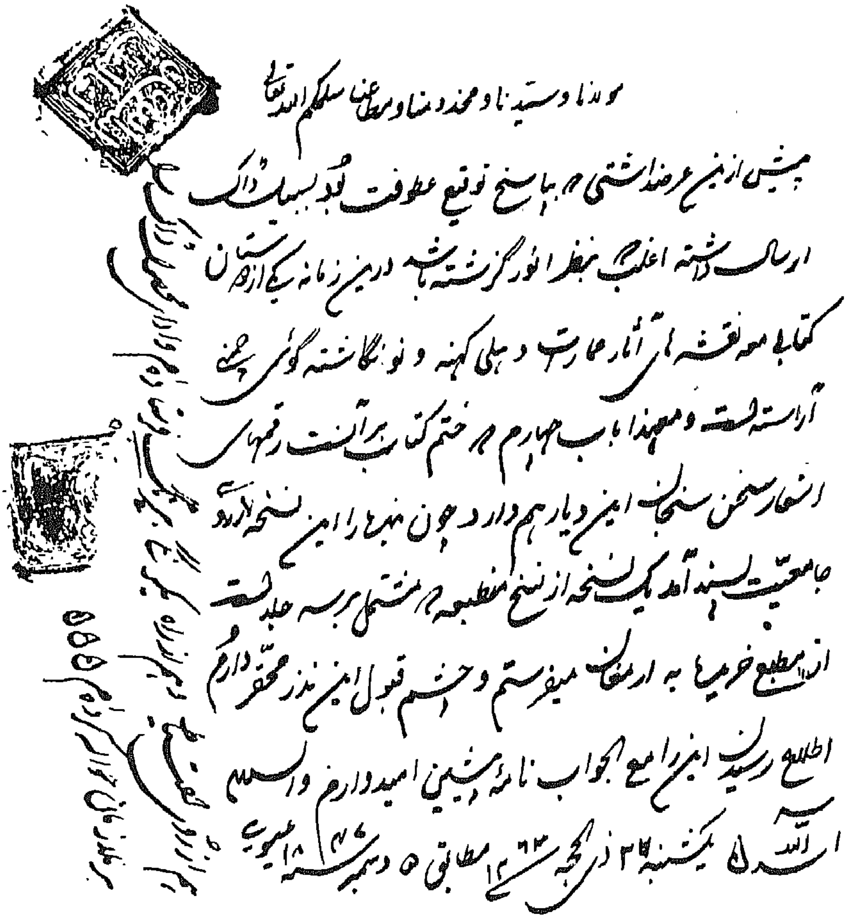

مولانا و سیدنا و مخدومنا و مطاعنا سلمکم اللہ تعالیٰ

پیش ازین عرضداشتی در پاسخ توقیع عطوفت بود بسبیل ڈاک
ارسال داشته اغلب که بنظر انور گزشته باشد درین زمانه یکے از دوستان
کتابی معه نقشه‌ہای آثار عمارت دہلی کہنه و نو نگاشته گوی چمنے
آراسته است و معہذا باب چہارم در ختم کتاب بر آنست رقمہای
اشعار سخن سنجان این دیار ہم دارد چون مہرہا را این نسخه از رو
جامعیت پسند آمد یک نسخه از نسخ مطبوعه مشتمل بر سه جلد است
از مطبع خریده به ارمغان میفرستم و چشم قبول این نذر محقر دارم
اطلاع رسیدن این را مع الجواب نامه مشکین امیدوارم والسلام
اسد اللہ یکشنبه ۲۱ ذی الحجه ۱۲۶۳ مطابق ۵ دسمبر ۱۸۴۷ عیسوی

هم از روی لطف [illegible] و هم از راه یکرنگی بجهت [illegible] فرستاده‌ام و ادای محصول ڈاک
برملازمان حواله کرده‌ام ۵۵۵

یہ خط مولوی سیّد رجب علی صاحب مرحوم مخاطب بہ ارسطو جاہ کے نام بھیجا گیا تھا۔ اور اسمیں سر سیّد مرحوم کی "آثار الصنادید" کی ترسیل کا ذکر ہے۔ غالب کے اندازِ تحریر کا یہ نہایت عمدہ نمونہ ہے

اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل لکھنؤ میں کہی گئی ہوگی ممکن ہے اس زمانے کے کسی مشاعرہ کی طرح ہو

---

(بقیہ صفحہ ۶۴) شہزادگی کے زمانے میں خان ساماں کے عہدے پر مامور تھا مسند نشینی کے سلسلے میں اس نے غازی الدین حیدر کی اعانت میں سرگرم حصہ لیا تھا انہی خدمات کے سلسلے میں وزارت کا خلعت پایا لیکن تین برس کے بعد وہ معزول ہوگیا جب انگریزی مصالح نے اودھ کو شاہان دہلی کے حلقۂ اطاعت سے آزاد کرنا چاہا تو آغا میر پھر برسرِ اقتدار آگیا۔ اسی کی تجویز کے مطابق غازی الدین حیدر بادشاہ بنے اور خود اسے نائب السلطنۃ کا عہدہ مل گیا۔ اس وقت سے لے کر غازی الدین حیدر کی وفات تک آغا میر خود مختار بادشاہ کی طرح کام کرتا رہا جسے چاہا آگے بڑھایا جسے چاہا پیچھے ہٹایا جسے چاہا نکالا جسے چاہا رکھا۔ غازی الدین حیدر کو مسکرات کا عادی بنا کر بالکل معطل و بے خبر بنا دیا تھا اس کے زمانہ اقتدار کے عجیب و غریب واقعات سُنے گئے ہیں مثلاً ایک ساہوکار سے لاکھ روپے کا گوٹا کناری خریدا تھا جب اس نے روپیہ مانگا تو اسے مشورہ دیا کہ تم بادشاہ سے ملاقات کر لو اقران و اماثل میں تمہارا اعتبار بڑھ جائے گا۔ وہ غریب راضی ہوگیا سوءِ اتفاق سے اس کا جسم بہت فربہ اور رنگ بہت سیاہ تھا۔ باریابی کے لئے شاہی محل میں گیا۔ بادشاہ باہر آئے تو دور ہی اسے دیکھ کر گھبرا گئے اور پکار اُٹھے "یہ کون ہے یہ کون ہے"؟ خدام نے آغا میر کی ہدایت کے مطابق عرض کیا کہ یہ دیو یا جن معلوم ہوتا ہے بادشاہ نے شور مچایا "اسے پکڑ لو اسے پکڑو" اور خود اندر چلے گئے۔ غریب ساہوکار پکڑا گیا جب اس نے دیکھا کہ ذلّت انتہا کو پہنچنے والی ہے تو آغا میر کے قدموں پر گر پڑا اور وہیں اس نے لاکھ روپے کی فارغ خطی لکھ دی۔

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کا ایک منہ چڑھا مصاحب تھا۔ آغا میر نے اسے الگ گھر بٹھا دیا۔ اور کہا کہ کبھی باہر نہ نکلو۔ بادشاہ نے اس کے متعلق بار بار پوچھا لیکن ہر دفعہ جواب ملا کہ وہ مر چکا ہے، ایک روز بادشاہ باہر سیر کر رہے تھے کہ وہ مصاحب فاصلے پر نظر آیا غازی الدین حیدر نے کہا دیکھو فلاں شخص ہے۔ آغا میر اور اس کے رفیقوں نے متعجب ہو کر عرض کیا کہ خدامِ بارگاہ کو تو نظر نہیں آتا حضور کی آنکھوں پر سب کچھ روشن ہے۔ اس لئے عالمِ ارواح کی مخلوق بھی صاف نظر آتی ہے۔ بادشاہ ہر چند کہتا رہا کہ اسے بلاؤ لیکن آغا میر نے یقین دلا دیا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ اور بادشاہ کو محض اس کی روح مجسم صورت میں نظر آتی ہے۔

غرض آغا میر نے آٹھ دس برس تک اودھ کو بہت بری طرح برباد کیا۔ آخر میں بادشاہ سے انگریزوں کو قرض دلا کر اس کا سود اپنے نام لکھوا لیا غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے چند ماہ کے بعد آغا میر کو معزول کیا اور اس سے حساب لینے کی کوشش کی لیکن انگریز آغا میر کے معاون بن گئے۔ دو برس تک وہ انگریزوں کی حفاظت کے بھروسے پر لکھنؤ میں خانہ نشین رہا آخر سنہ ۱۸۳۰ء میں انگریزوں کی حفاظت میں لکھنؤ سے نکل کر اپنے مال و متاع سمیت کان پور آگیا۔ وہیں دو سال کے بعد وفات پائی۔ اس کی اولاد غالباً اب تک کان پور میں ہے ۱۲

کہی گئی ہو اور مشاعرہ میں پڑھی گئی ہو۔

**کان پور اور باندہ** غالب ۲۶؍ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ سے نکلے ۲۹؍ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ کو کان پور پہنچے وہاں دو تین روز کے قیام کے بعد باندہ چلے گئے۔

**باندہ سے بنارس تک** یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ باندہ میں کتنی مدت قیام کیا لیکن باندہ سے نکلنے کے بعد مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو جو مکاتیب لکھے ان سے بعد کی منزلوں کا حال معلوم ہوتا ہے مثلاً باندہ سے نکل کر دو روز موڈہ میں قیام کیا۔ ایک رات روستا میں بسر کی۔ پھر چلہ تارا پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:-

> روز پنج شنبہ در موڈہ رسیدہ تا یک شنبہ بہ آرامش گرائید۔ دوشنبہ کوس رحیل کوفتہ شبے بہ روستا بسر بردہ سہ شنبہ در چلہ تارا رسیدہ بامدادان اگر حیات باقی است بسیج راہ فتح پور کردہ خواہد شد۔

موڈہ سے غالب نے سامان برداری کے لئے ایک گاڑی کرایہ پر لی تھی۔ جو بڑی سست رفتار تھی۔ اس کے انتظار ہی میں رات روستا میں بسر کی تھی۔ دوسرے روز غالب چلہ تارا پہنچ گئے لیکن گاڑی وہاں بھی دیر سے پہنچی موڈہ اور چلہ تارا کا درمیانی فاصلہ اگرچہ صرف بارہ کوس کا تھا لیکن گاڑی کی سستی رفتا کے باعث دو روز میں بہ مشکل طے ہوا۔ وہ خود فرماتے ہیں:-

> دوشنبہ از موڈہ بر آمدم گردونے کہ دریں ملک بہ لڑھا موسوم است برائے بارکشیدن یافتم چوں ازبس ضعیف الخلقت تر افتادہ بود آں آہستہ خرام بلکہ محزام دہ از دہ کردہ را نتوانست برید۔ واز موڈہ تا چلہ تارا نہ رسید ناچار شبے بہ دیہے (روستا) اتفاق اقامت افتاد سہ شنبہ آخر شب رواں شدم من خود دو پہر روز بر آمدہ بہ سرائے چلہ تارا رسیدم و آں ہیچ خرام بلکہ محزام تا ساعتے از شب نہ گزشت بہ من نہ پیوست۔

باندہ میں غالب سے کہا گیا تھا کہ مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجنا ہو تو چلہ تارا کے تھانہ دار کے حوالہ کر دینا غالب نے چلہ تارا پہنچ کر خط لکھا تھانہ دار صاحب سرائے میں آئے اور ادھر ادھر پھرنے لگے تو غالب نے ارسال خط کے باب میں اعانت چاہی تھانہ دار صاحب نے درخواست قبول کر لی لیکن اندا گفتار غالباً غیر مناسب تھا۔ غالب اس انداز سے اتنے مکدر ہوئے کہ خط تھانہ دار کے حوالے کر کے بجائے ایک مسافر کو دیا جو باندہ جا رہا تھا۔ لکھتے ہیں:-

میرزا مغل صاحب در باندہ فرمودہ بودند کہ عریضہ مولوی صاحب بہ تھانہ دار چلہ تارا حوالہ باید کرد کہ او خواہد رسانید۔ اتفاقاً آخر روز بلکہ اول شب بہ کاروان سرائے چلہ تارا در انتظار گردونک و واماندگان راہ نشستہ بودم کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کاروان سرا رسید و بہر سو خرامیدن آغاز کرد۔ در باب ارسال نامہ اعانت جستم اگرچہ پذیرفت اما پذیرفتن سخت سفیہانہ بود چنانکہ طبع ابا کرد و گوارا نہ شد مکتوب بہ وے دادن بہر دے مجہول الاحوال چون نام جناب از من شنود نامہ بہ عجز از من طلب کرد۔

پہلے خط میں غالب نے لکھا تھا کہ وہ چلہ تارا سے فتح پور جائیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کی سستی رفتار سے تنگ آکر مجبوراً انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کشتی میں سوار ہو کر دریا کے راستے الہ آباد پہنچیں وہ لکھتے ہیں :۔

آخر از بیداد گردون دون ستوہ آمدہ خود را بہ دریا انداختم یعنی ہم ازیں مقام کشتی بہ کرایہ گرفتہ و آذوقہ متاع ہمہ در وے گنجیدہ و بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا برخواندہ سفینہ در رود جمن راندہ ام منظور ایں کہ بہ الہ آباد رسیدہ اگر توفیقے کہ در بنارس مے خواستم کرد ہم دریں بقعہ کار بندم و روزے چند آسائشے کردہ اختلاج بہ امضا رسانیدہ رہگرا شوم و دیگر جز بہ مرشد آباد و بنگالہ در ہیچ جا توقف نہ گزینم۔ حال سفر دریا نیز دریں دو سہ روز پنہاں نخواہد ماند کشتی بانان گویند کہ در عرصہ سہ روز بہ الہ آباد رسیدہ خواہد شد۔ اسے تواں ودیا اینک روز چہار شنبہ قریب نیم روز و کشتی نشستہ دل بہ خدا و تن بہ ناخدا بستہ ام۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب الہ آباد میں کتنے روز ٹھہرے اور وہاں سے بنارس پہنچ کر کتنی مدت قیام کیا لیکن انہوں نے جو یہ لکھا تھا کہ بنارس میں نہیں ٹھہروں گا اس پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کافی مدت بنارس میں مقیم رہے۔ انہوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مستقل مثنوی لکھی ہے جس کا نام چراغِ دیر ہے یہ ان کی فارسی مثنویوں میں تیسری مثنوی ہے۔

ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باندہ میں بیمار ہو گئے تھے۔ مولوی محمد علی خاں صاحب صدر امین باندہ کو چلہ تارا سے لکھتے ہیں :۔

بعد ظہر کہ زحمت صداع دمی از ساحت طبع رخت بربست۔

پھر لکھتے ہیں:-

للہ الحمد زحمت صداع و حمی ہم از باندہ اثرے در طبع نگزاشتہ ضعف اگر باقی است تردد سے نیست کہ ایں رفیق است کہ از وطن کمر بہ ہمرہی بستہ است۔

قیام بنارس بنارس سے راۓ چھجمل کو لکھتے ہیں:-

چو نویسم کہ از متاع نوشتنیہا پر تہی دست افتادہ ام اگر از دخلیات گفتہ آید ہماں رنج معدہ و امعا است و ہماں برودت جگر و حرارت قلب و ضعف قوا۔ اگر از خارجیات سخن راندہ شود بیش ازیں نیست ؎

مغلوب سطوت غم دل غالب حزیں　　کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است　　ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

بنارس میں قیام کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غالب خود ایک خط میں مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں

عطوفت نامہ در ایام خاک نشینی ہائے بنارس چشم محبت را نورے و بخت حیثم را عروجے بخشیدہ بود۔

مناسبت مقام کا اقتضا یہ ہے کہ مثنوی "چراغ دیر" کے بعض اہم حصے بھی یہاں پیش کر دیئے جائیں اس کا آغاز یوں ہے ؎

نفس با صور دمساز است امروز　　خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شرارے مے نویسم　　کف خاکم غبارے مے نویسم

احباب دہلی کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ز دہلی تا بروں آوردہ بختم　　بہ طوفان تغافل دادہ رختم
کس از اہل وطن غمخوار من نیست　　مرا در دہر پنداری وطن نیست
ز ارباب وطن جویم سہ تن را　　کہ رنگ و رونق اند ایں چمن را
چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم　　ہم از حق فضل حق[1] را باز خواہم

---

[1] مولوی فضل حق خیر آبادی آخری دور میں معقول کے امام تھے۔ غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ غدر کے بعد انڈمان بھیجے گئے وہیں وفات پائی۔

چو حرز بازوئے ایماں نویسم          حسام الدین[1] حیدر خاں نویسم
چو پیوندِ قبائے جاں طرازم          امین الدین[2] احمد خاں طرازم
گرفتم کز جہان آباد (دہلی) رستم          مرا بیناں را چرا از یاد رفتم
نگر داغِ فراقِ بوستاں سوخت          غم بے مہری این دوستاں سوخت
جہان آباد (دہلی) گر نبود الم نیست          جہان آباد بادا جائے کم نیست

ان تمہیدات کے بعد بنارس کا ذکر فرماتے ہیں:-

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور          بہشتِ خرم و فردوسِ معمور
بنارس را کسے گفتا کہ چین است          ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
بہ خوش پرکاری طرز وجودش          ز دہلی مے رسد ہر دم درودش

بنارس کے متعلق ہندوؤں کے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند          بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد          دگر پیوندِ جسمانی نگیرد
چمن سرمایہ اُمید گردد          بہ مردن زندۂ جاوید گردد

لیکن غالب کی دلچسپی کا حقیقی مرکز و مرجع بنارس کا حُسن تھا۔ اس حُسن کے کیف و جوش کو غالب کی بینائے سخن میں مُلاحظہ فرمائیے ؎

---

[1] مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ رؤسائے دہلی میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن بعد ازاں دہلی چلے آئے۔ دہلی دربار میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ غالباً ۱۸۴۶ء میں فالج سے انتقال ہوا۔ شاعر بھی تھے۔ نامی تخلص تھا۔ غالب نے ان کے دیوان کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے جو کلیات نثر میں موجود ہے۔

[2] نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو۔

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز      نگاہے بر پری زادِ آتش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا      ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہادِ شاں چو بوئے گل گراں نیست      ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
خس و خارش گلستان است گوئی      غبارش جوہرِ جان است گوئی

……

کفِ ہر خاکش از مستی کنشتے      سرِ ہر خارش از سبزی بہشتے
سوادش پائے تختِ بت پرستاں      سراپایش زیارت گاہِ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیان است      ہمانا کعبۂ ہندوستان است
بتانش را ہیولے شعلۂ طور      سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا      ز نادانی بہ کارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است      دہنہا رشکِ گلہائے ربیعی است

……

بہ لطف از موجِ گوہر نرم روتر      بہ ناز از خونِ عاشق گرم روتر
بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ      ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
قیامت قامتانِ مژگاں درازاں      ز مژگاں در صفِ دل نیزہ بازاں

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ایک وقتن بیان سے جو زمانہ کی گردش کے اسرار سے آگاہ تھا سوال کیا کہ جہان سے نیکی، وفا اور محبت رخصت ہو چکی ہے۔ ایمان کا محض نام باقی رہ گیا ہے۔ باپ بیٹوں کی خونریزی کے درپے ہیں، بیٹے آبا کے دشمن جاں ہیں، بھائی بھائی سے سرگرم جنگ ہے موافقت زمانے سے اٹھ چکی ہے۔ گویا قیامت کی تمام علامتیں ہویدا ہو چکی ہیں لیکن قیامت کیوں نہیں آتی ہے

بہ نفخِ صور تعویق از پئے چیست؟      قیامت را عنانگیرِ جنوں کیست؟

कु० रिहाना जाकिर बिहार दरभंगा

سوئے کاشی بہ انداز اشارت
تبسم کرد و گفتا ایں عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا
کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

آخر میں اپنی درد انگیز حالت نہایت موثر و دل نشین انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

الا اے غالبِ کار او فتادہ
ز چشمِ یار و اغیار او فتادہ

چو بوئے گل ز پیراہن بروں آئے
بہ آزادی ز بندِ تن بروں آئے

مدہ از کف طریقِ معرفت را
سرت گردم بہ گردِ ایں شش جہت را

فرو ماندن بہ کاشی نارسائی ست
خدارا ایں چہ کافر ماجرائی ست

بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر
دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر

دریغا در وطن وا ماندہ چند
بخونِ دیدہ زورق راندہ چند

ہوس را پائے در دامن شکستہ
بہ امید تو چشم از خویش بستہ

بہ شہر از بیکسی صحرا نشیناں،
بروئے آتشِ دل جا گزیناں

مگر کاں قوم را دہر آفریدہ
ز سیماب بہ آتش آرمیدہ

ہمہ در خاک و خوں افگندۂ تو
بہ حکمِ بیکسیہا بندۂ تو

چو شمع از داغِ دل آزرفشاناں
بہ بزمِ عرضِ دعویٰ بے زباناں

سروسرپایہ غارت کردۂ تو
ز تو نالاں و لے در پردۂ تو

ادا نانت تغافل خوشنما نیست
بہ داغ شاں ہوائے گل روا نیست

غالب کے اہل و عیال کی کیفیت اور اس کیفیت کے لئے غالب کی ذمہ داری اس سے بہتر کیا بیان ہو سکتی ہے۔ اپنے پیشِ نظر کام کی نسبت لکھتے ہیں ؎

ترا اے بے خبر کار است در پیش
بیابانے و کہسار است در پیش

……

ترا ز اندوہ مجنوں بود باید
خرابِ کوہ و ہاموں بود باید

تن آسانی بہ تاراج بلا دہ    چو بینی رنج خود را رونما دہ
شرر آسا فنا آمادہ برخیز    بیفشاں دامن و آزادہ برخیز

اس واقعہ سے تینتیس برس بعد میاں داد خاں سیاح کے ایک مکتوب کے جواب میں جو سیاح نے بنار سے لکھا تھا فرماتے ہیں :-

بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر" اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہو اس کو دیکھنا۔

غالباً بنارس کے کوئی صاحب اشرف حسین خاں تھے جن کا ذکر سیاح نے اپنے خط میں کیا تھا، غالب لکھتے ہیں :-

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں فتنہ و فساد (غدر) کے زمانے سے پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے تم ان کو میرا سلام کہنا۔

**بنارس سے روانگی** | بنارس سے روانگی ہفتے کے دن عمل میں آئی۔ چاند کی نویں یا دسویں تاریخ تھی مہینہ معلوم نہیں ہو سکا۔ غالب لکھتے ہیں :-

امروز کہ آدینہ بقول جمعے نہم ماہ و بہ اظہار گروہے دہم است در بند بستن رخت سفرم .... فردا بہ روز شنبہ از بنارس مے پویم۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو کشتی کی سواری میں بہت آرام ملا تھا لہذا ان کی آرزو تھی کہ کلکتہ تک کشتی ہی میں جائیں لیکن کشتی والے کرایہ بہت زیادہ مانگتے تھے۔ اس لئے مجبوراً غالب خشکی کے راستے گھوڑے پر پٹنہ پہنچے۔ وہ لکھتے ہیں :-

ناخدایان ناخدا ترس در باب کشتی مضائقہ کردند چہ بہ ہر کہ بر خوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید و تا پٹنہ فزوں از بست روپیہ خواست۔ ناچار بہ ہماں اسپ سوار تا بداں بقعہ صحرا خواہم پیمود۔

لیکن ان کا خیال تھا کہ پٹنہ پہنچ کر پھر کشتی کا بندوبست کریں وہ فرماتے ہیں :-

ہنوز ہوائے کشتی از سر بدر نہ رفتہ در پٹنہ نیز جستجو خواہم کرد۔

K.REHANA.ZAIDI

**کلکتہ پہنچنے کی تاریخ** پٹنہ تک کی منزلیں۔ وہاں کے قیام اور بعد ازاں کلکتہ تک کے مقامات کی نسبت کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ

> گاہے از شدت بردیبالی افسردہ و رنجور و گاہ از سختی گردش ایام ستم رسیدہ و نالاں روز سہ شنبہ چہارم شعبان (۱۲۴۳ھ) در کلکتہ رسید۔

”بردیبالی“ سے ظاہر ہے کہ بنارس سے کلکتہ تک کا سفر دسمبر، جنوری اور فروری میں طے ہوا یعنی غالب نے لکھنؤ سے نکل کر جہاں سے وہ ہمارے اندازے کے مطابق ماہ جولائی میں روانہ ہو چکے تھے۔ باندہ، الہ آباد اور بنارس میں زیادہ وقت گزرا۔ وہ جون ۱۸۲۷ء میں دہلی سے نکلے تھے اور اواخر فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے گویا سفر میں کم و بیش آٹھ ماہ صرف کئے۔

**قیام کلکتہ** کلکتہ میں غالب نے شملہ بازار میں مکان کرایہ پر لیا تھا وہ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :-

> فرود آمدن جائے من کاشانہ ایست در شملہ بازار کہ آں را روز دادہ ہماں ہنگام ورود بے حرمت جستجو یافتم

رائے چھجمل کو اپنا پتہ اس طور پر لکھتے ہیں :-

> در کلکتہ قریب چیت بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب در حویلی میرزا علی سوداگر بہ اسد اللہ برسد۔

مکان بڑا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ اور اس کا کرایہ صرف دس روپے ماہانہ تھا مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو لکھتے ہیں :-

> غریب نوازیہائے وہاب بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانہ چنانکہ باید و ہر گونہ آسایش را بکار آید۔ ہم او را بہ اندازہ فراغ خاطر فضائے و ہم اندرو سے مانند دہان دنیا طلبان بیت الخلائے۔ در گوشہ صحن پر از آب شیریں چاہے۔ و بر طرف بام درخور اہل نعم آرامگاہے بے آنکہ جستجوئے شود یا گفتگوئے رود بے زحمت و بے منت بہ کرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ۔

**کلکتہ کی تعریف** شہر کلکتہ اور بنگال کی آب و ہوا غالب کو بہت پسند آئی تھی فرماتے ہیں :-

> شگرفی آثار رحمت الٰہی است کہ آب و ہوائے کلکتہ با من نیک درساخت و دریں بقعہ آسودہ تر از آنم کہ در وطن بودہ ام سے

غالب ز تو ہر پردہ نوائے دارد    ہر گوشہ از دہر فضائے دارد
ہرچند بپوست ازو ما غم یکسر    بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

علی بخش خاں رنجور کلکتہ کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

چہ کلکتہ جائے از ہر گونہ کالا مالا مال، جز چارہ مرگ ہر چہ گوئی ہست و درانش سہل ہم، جز بخت ہر چہ خواہی بہ بازارش ارزاں۔

مولوی سراج الدین احمد کلکتہ میں غالب کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ کلکتہ سے واپس آکر دہلی سے مولوی صاحب کو جو خط لکھے ان میں سے ایک خط میں فرماتے ہیں :-

شمار ستانے بدیں تازگی در گیتی کجاست۔ خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر من و خدا کہ اگر متاہل نبودمے و طوق ناموس عیال بر گردن نہ داشتمے دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے و خود را دراں بقعہ رساندمے تا زیستے دراں مینو کدہ بودمے از نسیم ہواہائے آغوش آسودمے زہے ہواہائے سرد و خوشا آبہائے گوارا فرخا بادہ ہائے ناب و خرما ثمرہائے شیریں۔

غالب کو آم ویسے ہی حد سے زیادہ مرغوب تھے۔ بنگالہ کے آم انہیں بہت پسند آئے۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد
غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

غالب کے کلیات نظم میں ایک قطعہ ہے جس میں انہوں نے سفر کلکتہ کی غرض و غایت، دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی کیفیت "ساقی بزم آگہی" کی زبان سے بیان کی ہے۔ وہ ہر امر کو بطور سوال "ساقی" کے روبرو پیش کرتے ہیں اور "ساقی" جواب دیتا ہے اس میں فرماتے ہیں ؎

گفتمش چیست منشا سفرم؟    گفت جور و جفائے اہل وطن
گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست؟    گفت جان است و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت    شاہدے ہست محو گل چیدن

گفتمش چوں بود عظیم آباد؟　　گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد　　گفت خوشتر نہ باشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت ،　　باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد در وے　　گفت از ہر دیار و از ہر فن

اس کے بعد انگریزوں کی طرز و روش کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد؟　　گفت از ہر کہ ہست ترسیدن
گفتم ایں جا چہ کار باید کرد؟　　گفت قطع نظر ز شعر و سخن
گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟　　گفت خوبانِ کشور لندن

غالب جس مقصد کے لئے کلکتہ گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اس کے عالم میں "خوبان کشور ندن" کے متعلق مزید فرماتے ہیں :-

گفتم ایناں مگر دلے دارند؟　　گفت دارند لیک از آہن ،
گفتم از بہر داد آمدہ ام　　گفت بگریز و سر بہ سنگ مزن

کلکتہ کی تعریف میں غالب نے اردو میں بھی چند اشعار کہے ہیں :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب　　وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر　　طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا　　وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

فارسی کی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :-

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم

الب کے ہمدرد دوست | اوپر عرض کیا جاچکا ہے۔ غالب کے سفر کلکتہ کا منشا پنشن کا قضیہ تھا۔ لہٰذا کلکتہ میں

وہ زیادہ تر اسی غرض کے لئے حکام یا دوسرے دوستوں سے ملتے رہے۔ ہم ان تمام مشاغل کو علیحدہ باب میں بیان کریں گے جن اصحاب نے کلکتہ میں پنشن کے سلسلے میں غالب کی سب سے بڑھ کر اعانت کی ان میں سے نواب اکبر علی خاں طباطبائی متولی امام باڑہ ہوگلی۔ مولوی سراج الدین احمد خاں اور مولوی محمد حسن خاں صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نواب اکبر علی خاں کے نام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے تعارفی خط دیا تھا۔ غالب فرماتے ہیں کہ کلکتہ پہنچ کر دو روز آرام کرنے کے بعد ہوگلی بندر گیا اور نواب صاحب سے ملا۔ اُن کے تپاک، محبت، ہمدردی اور حسن اخلاق سے غالب بہت متاثر ہوئے فرماتے ہیں:۔

اگر گویم کہ مرا از بخت محبوب آمد رواست و اگر گویم کہ مرا بریں رشک آورد نیز جا دارد، بخدائے کہ خرد آفریدہ و خرد در برگزیدہ۔ کہ بدیں گرانمائگی و صاحب دلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود۔

نواب صاحب سے ملاقات کے بعد ان کے ساتھ محبت و وداد کا مستحکم و محکم رشتہ پیدا ہوگیا جس زمانے میں غالب کلکتہ گئے ہیں نواب صاحب بیچارے خود امام باڑہ کے وقف کے متعلق مقدمہ میں اُلجھے ہوئے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:۔

آرے کہ دریں روزہا نواب را با حکام ہوگلی بندر در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ بلکہ مجادلہ در پیش و دل سرگرم فکر خویش است شدہ در تامل ؎

ہمہ را ماتمی حسرت دنیا دیدم
چوں بہ عشرت کدہ گبر و مسلماں رفتم

مولوی سراج الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کا رابطہ مودت و اخوت بہت گہرا تھا۔ فارسی مکاتیب میں ان کے نام متعدد خط ہیں۔ مولوی صاحب غالباً لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ میں کاروبار کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے جس زمانے میں غالب نے "دستنبو" چھپوائی ہے مولوی صاحب لکھنؤ آ گئے تھے۔ غالب "دستنبو" کا ایک نسخہ مولوی صاحب موصوف کو بھیجنے کی ہدایت دیتے ہوئے ان کا پتہ منشی شیو نرائن کو یوں لکھتے ہیں:۔

در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں متصل تکیہ شیر علی شاہ بہ برکانات مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی
سراج الدین احمد برسد۔

مولوی صاحب کے ساتھ جو گہرا تعلق تھا۔ اس کی کیفیت خود غالبؔ کی زبان سے سُنئے۔ خواجہ غلام غوث خاں بیخبرؔ کو لکھتے ہیں:-

> ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں دو مخلص صادق الولاد دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرے منشی غلام غوث خاں سلمہ اللہ تعالےٰ لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔

**ادبی ہنگامہ** سفرِ کلکتہ کی صرف ایک ضروری چیز باقی رہ گئی ہے یعنی وہ ادبی ہنگامہ جس کے نتیجے میں غالبؔ کو مثنوی "بادِ مخالف" لکھنی پڑی۔

غالبؔ کو فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی۔ ان کا مذاق نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اور ملا عبدالصمد کی دو سالہ تربیت نے ان کے ہر نادر جوہر کو یگانہ جلا دے دی تھی عنفوانِ شباب ہی میں انہوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ فارسی زبان کے بہترین اور مشہور ترین اساتذہ کے کلام کے ہم پایہ تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان کے ان فارسی گو شعرا کو خاطر میں نہ لاتے تھے جن کی زبان، اسلوب بیان اور کلام غرض ہر چیز فرومایہ تھی۔ اس زمانے میں قتیلؔ اور واقفؔ کا بہت شہرہ تھا۔ غالبؔ کے نزدیک قتیلؔ اور واقفؔ بے حقیقت تھے۔ جب غالبؔ کلکتہ پہنچے تو اس زمانے میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسہ کلکتہ میں مشاعرہ ہوتا تھا جس میں فارسی اور اُردو زبان کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ غالبؔ کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس زمانے میں شہزادہ کامران والیٔ ہرات کی طرف سے ایک سفارت کلکتہ آئی ہوئی تھی جس کے رئیس کفایت خاں نامی ایک خوش ذوق اہلِ علم تھے۔ وہ بھی مشاعرے میں شریک تھے۔ شعرائے کلکتہ نے اپنی غزلیں پڑھیں۔ تو کفایت خاں ان کے پوچ کلام پر زیرِ لب تبسم فرماتے رہے لیکن جب غالبؔ نے غزل پڑھی تو خان ممدوح نے دل کھول کر داد دی۔ اس پر عام شعرا میں غالبؔ کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اُٹھی[۵]۔ اور جیسے کہ

---

[۵] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۰۔

پوچ گو، فرومایہ اور تنگ نظر شعرا کا دستور ہے وہ غالب کے کلام میں عیب تلاش کرنے لگے۔ غالب نے اس مشاعرے میں اپنی مشہور غزل "گماں برخیزد" "تہماں برخیزد" پڑھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

✓ بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر — رسم بیداد "تہ باد" از جہاں برخیزد
زینہار از تعب دوزخ جاوید مترس — خوش بہاریست کزو بیم خزاں برخیزد
عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ — چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد
گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب — رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم — ہم چو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس پر اسی مشاعرے میں یا دوسرے مشاعرے میں یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ "ہمہ عالم" کی ترکیب مستند نہیں نیز یہ اعتراض کیا گیا کہ "موئے از میاں برخیزد" غیر صحیح ہے بعض اور اعتراضات بھی کئے گئے نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد حسن خاں صاحب نے ان اعتراضات کے جواب دیئے[1]۔ کفایت خاں نے "ہمہ عالم" کی سند میں اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کئے مثلاً ؎

گر من آلودہ دامنم چہ عجب،
"ہمہ عالم" گواہ عصمت اوست (حافظ)

اور ؎

بہ جہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم از اوست
عاشقم بر "ہمہ عالم" کہ "ہمہ عالم" از اوست (سعدی)

کلکتہ کے شعرا کا سرمایۂ ناز و افتخار اور دستاویز سند و دلیل قتیل کا کلام تھا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا۔[2] اس پر کلکتہ کے شعرا اور بھی بگڑ گئے۔ تقلید جب جمود کی انتہا پر پہنچ جائے تو مذہب یا سیاست

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۰۔ [2] قتیل فرید آباد کے کھتری تھے بعد ازاں مسلمان ہوئے اور لکھنؤ جا کر بڑا عروج پایا۔ مرزا قتیل نے ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی

یا معاشرت یا ادب کے مجتہدین فن اور مجددین طریق و راہ کو جن احمقانہ و جاہلانہ مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ سب غالب کے گرد و پیش کھڑی ہو گئیں وہ کسی ادبی ہنگامہ اور علمی جہاد کے لئے کلکتہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنی پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے لئے انہوں نے اس لمبے سفر کی زحمت برداشت کی تھی۔ جب ان کے خلاف شعراء نے ہنگامہ برپا کیا تو وہ بہت گھبرائے! اور انہوں نے نواب اکبر علی خاں و مولوی محمد حسن صاحب کی فرمائش پر معذرت میں "باد مخالف" کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا، اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی۔ اعتراضات کے جواب دیئے اور فارسی زبان میں اپنے مسلک و مشرب کی وضاحت کی

میرے نزدیک اس ہنگامہ کو غالب کی ادبی و علمی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ شروع ہی سے قتیل، واقف اور اس قماش کے دوسرے شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ تعریضات گرم ہوا۔ اس نے غالب کے جذبہ مخالفت میں بہت تندی تیزی اور تلخی پیدا کر دی یہی جذبہ مخالفت انجام کار "قاطع برہان" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو غالب کی طرف سے فارسی دانان ہند کے درجہ استناد و اعتماد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ غالب کے کلام نظم و نثر میں جابجا قتیل، واقف، عبدالواسع، غیاث الدین رامپوری اور اس قبیل کے دوسرے فرومایگان ذوق و ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں ان سب کی تیزی اور تندی کا سرچشمہ یہی کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔

**مثنوی "باد مخالف"** مثنوی "باد مخالف" میں پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ میں متظلم اور فریاد لے کے اس شہر میں آیا ہوں۔ مجھے چند روز یہاں آرام سے گزارنے دو، مہمان نوازی کا حق ادا کرو پھر اپنی مصیبتوں کی داستان لکھتے ہیں ؎

چہ بلاہا کشیدہ ام آخر — کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر
بہ سیہ روز غربتم منشینید — تیرہ شبہائے زحمتم بینید
اندۂ دوری وطن نگرید — غم ہجران انجمن نگرید
نہ ہمیں نالہ و فغاں بہ لبم — من و جاں آفریں کہ جاں بلبم

سعیہ چوں تو کردہ است مرا      غصہ بدخوئے کردہ است مرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا بلکہ خود مجھ پر بلا وجہ نادرست اعتراض کئے گئے ہے

"ہمہ عالم غلط کہ گفت نخست؟      پارہ زیں نمط کہ گفت نخست؟
مصرعے را بہ کمر کہ گفت غلط؟      شعر را سر بسر کہ گفت غلط؟

اور جب اعتراضات کا جواب ملنے پر ثابت ہو چکا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل درست تھا۔ تو کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات نے میری تائید نہ کی۔ اور میری شہرت پر جو داغ مخالفین نے لگائے تھے انہیں دھو ڈالنے کی طرف توجہ نہ فرمائی؟ آپ کی اس حق نارسی سے میری گفتگو کا انداز گلہ مندانہ ہو گیا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ قدرداں اصحاب اس پہ ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوئی کاش میں چپ رہتا ہے

نا امیدم ز شاعری نیست بیم      بود شایستہ مر مرا تسلیم
کاش با اعتراض ساختمے      نالہ در زیر لب گداختمے
زانکہ آنہم رضائے یاراں بود      رنگے از جوششِ بہاراں بود
خارِ داماں دوستاں بودن      خوشتر از باغ و بوستاں بودن

بعد ازاں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ادبی بحث سے نہیں ڈرتا صرف یہ خوف ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے کہ دہلی سے ایک سفیہ آیا تھا، وہ بزرگوں کے ساتھ معرکہ ستیز گرم کرکے چلتا بنا۔ اس طرح میرے وطن کی عزت و آبرو، بلند نامی اور اعلیٰ تربیت کا خونِ ناحق میری گردن پر ڈالا جائے گا ہے

نہ ز آویزشِ بیاں ترسم      من ز ایمانِ من گزاں ترسم
ق
کہ پس از من بہ سالہائے دراز      بہ زباں ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا      چند روز آرمیدہ بود ایں جا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت     زحمتے داد و راہِ خویش گرفت
ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت     ہم خرابا تیانہ ہوئے داشت
برگِ دنیا نہ سازِ دینش بود     ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ زاں دم کہ بعدِ رفتنِ من     خونِ دہلی بود بہ گردنِ من

کلکتہ والے اس بات پر بہت بگڑے تھے کہ غالب نے قتیل کی ستائش کیوں نہ کی۔ غالب فرماتے ہیں ؎

چونکہ در پیش گاہِ بزمِ سخن     بہ زباں ہا فتادہ است از من
کہ فلاں با قتیل نیکو نیست     مگس خوانِ نعمتِ او نیست
زلہ بردارِ کس چرا باشم     من ہمایم مگس چرا باشم

پھر کہتے ہیں کہ نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا نہ اس کی شہرت پر رشک ہے۔ نہ میں اسے برا کہتا ہوں۔ اور جو کچھ کہتا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ فارسی داں جانتے ہیں کہ قتیل اہلِ زبان نہ تھا۔ وہ شایستہ اعتماد نہیں اور اس کے کلام کو استناد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ فارسی اہلِ ایران کی زبان ہے۔ اور سند وہی مقبول ہوگی جو اہلِ زبان کے کلام سے مستفاد ہوگی اگر دوستوں کو مجھ پر یہ شکوہ ہے کہ میں قتیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا تو خدارا مجھے بتاؤ کہ میں حزیں، اسیر، طالب، عرفی، نظیری اور ظہوری کو چھوڑ کر قتیل کے پیچھے چلنا کیوں گوارا کر لوں ؎

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را

آخر میں قتیل کی مدح لکھی ہے جو حقیقتاً ہجو ملیح ہے فرماتے ہیں ؎

مے شوم خویش را بہ صلح دلیل     مے سرایم نوائے مدحِ قتیل،
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت     سعدیِ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است     از من و ہمچو من ہزار بہ است

نقشش آب حیات را ماند　　در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است　　انتخاب صراح قاموس است

جامد مقلدین اور حقیقت ناشناس رہرو معترضوں اور مصالحت کوشیوں سے حق بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے اور غالب کی تو عذر خواہی بھی باوجود ادعائے مصالحت اپنے اندر سینکڑوں تیز نشتر رکھتی تھی۔ لہذا اس سے کوئی اچھا نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب جب تک کلکتہ میں رہے یہ معرکہ جاری رہا۔

اردو مکاتیب میں غالب نے میری تحقیق کے مطابق صرف دو جگہ اس ہنگامہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں کہ پانچ ہزار کے مجمع میں اعتراض کیے گئے تھے دوسرے خط میں شاکر کو لکھتے ہیں:

> فقیر ہمیشہ مورد اعتراضات رہا ہے لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کیے ہیں۔ اللہ اللہ کلکتہ میں جو شور و شر اٹھا تھا میرا شعر ہے
>
> جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم　　ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد
>
> خستہ جراحتہائے اعتراض ہوا ہے منشاء اعتراض یہ کہ "عالم" مفرد ہے۔ اس کا ربط "ہمہ" کے ساتھ بہ سبب اجتماع نقیضین ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامراں درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ پہنچا اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" "ہمہ روز" "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار قاطع برہان[1] میں مندرج ہیں۔

**واپسی کب ہوئی** کلکتہ سے واپسی کی تاریخ کا تعین پھر ایک مسئلہ ہے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ غالب کے خاص ہمدرد تھے ان کا انتقال ۲۳ مئی سنہ ۱۸۳۰ء کو ہوا۔ ان کے انتقال سے پیشتر غالب دہلی آچکے تھے۔ اس مقدمہ کے بعد اب غالب کے اپنے بیان پر نظر ڈالیے۔ ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں:-

---

[1] ملاحظہ ہو "قاطع برہان" صفحہ ۴۳۔

یک شنبہ دوم جمادی الثانی بختی سعی آوارگی درنوردید و بہ دہلی پائے بدامن کشید نازم بہ غمخواری جان پروری بخت و پائے را کہ دریں سفر دیدہ روشناس کف پائے آنان گشتہ کہ وطن را بہ مذاق من آشفتہ مشرب تلخ تر از غربت ساختہ رسیدن بہ دہلی تلافی اندوہ ہجران کلکتہ نہ کرد تا بہ شادی چہ رسد ہر کہ از اہل نظر مرا نگرد ہرگز نداند کہ رہرو بمنزل رسیدہ بہ وطن آرمیدہ ایست بلکہ پندارد کہ دردمندیست از وطن دور افتادہ تازہ بہ داغ غربت مبتلا۔

جب یہ مسلم ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ء میں غالب دہلی میں تھے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ۲ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچے یعنی اوائل جنوری سنہ ۱۸۳۰ء میں یا اواخر دسمبر سنہ ۱۸۲۹ء میں

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہئے کہ غالب واپسی میں باندہ ضرور ٹھہرے۔ اس لئے کہ مولوی سراج الدین احمد خاں کو ایک خط میں رقم فرماتے ہیں :-

نامہ نامی کہ در باندہ بہ من رسیدہ و جوابش ہم از آں منزل مرقوم گردیدہ سطرے از نہفت لوائے جہاں کشائے گورنری داشت۔

اور کسی مقام پر ٹھہرنے کے متعلق کوئی بیان نہیں مل سکا۔ کلکتہ ہی میں غالب نے "چکنی ڈلی" کی تعریف میں ارتجالاً وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی۔

# پانچواں باب

## رام پور اور میرٹھ کے سفر

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالبؔ
آنچہ از پائے نیامد ز عصا مے آید

کلکتہ کے سفر کے بعد غالبؔ کی تحریرات سے صرف تین سفروں کا علم ہو سکا ہے وہ دو مرتبہ رام پور گئے اور ایک مرتبہ نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہؔ سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے البتہ کلکتہ کے سفر سے قبل وہ فیروز پور جھرکہ یا لوہارو آتے جاتے رہے۔ جب انگریزی فوج نے ۱۸۲۵ء میں بھرت پور پر حملہ کیا تھا۔ تو اس موقع پر نواب احمد بخش خاں کے ہمراہیوں میں غالبؔ بھی شامل تھے اگرچہ ان کا یہ شمول کسی فوجی خدمت کے لئے نہ تھا۔ وہ خود پنج آہنگ میں لکھتے ہیں :-

> در سال یک ہزار و دو صد و چہل و یک ہجری کہ گیتی ستانان انگلشیہ بر بھرت پور لشکر کشیدہ و آں دژ را درمیان گرفتہ اند من دریں یورش بہ جناب مستطاب ہمم عالی مقدار فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ دام اقبالہ و زاد افضالہ رفیقم و گرامی برادر ستودہ خوئے میرزا الٰہی بخش خاں بہادر ہم سفر است روزانہ بہ رفتار ہم قدمیم و شبانہ بہ یک خیمہ فرود آئیم۔

پہلا سفر رام پور

رام پور وہ پہلی مرتبہ اواخر جنوری ۱۸۶۰ء میں گئے اور مارچ میں واپس آئے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :-

> میاں میں جو آخر جنوری میں رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔

قاضی عبد الجمیل بریلوی کو رقم فرماتے ہیں :-

> گزشتہ سال ان دنوں رام پور میں تھا مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں واپس آ گیا۔

خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو تحریر فرماتے ہیں:۔

> جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا جو اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رام پور گیا چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلّی واپس آیا۔

گورنمنٹ کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ غدر میں غالب کی پنشن باغیوں کی اعانت کے الزام میں بند ہو گئی تھی غدر کے بعد گورنر جنرل دہلی آئے تو غالب چیف سکرٹری سے ملنے کے لئے گئے۔ صاحب موصوف نے ایک روز عدم فرصت کا عذر رکھ کر ٹال دیا دوسرے روز ملے تو یہ جواب دیا کہ "تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملتے ہو" جب تک پنشن کے کھل جانے کی اُمید تھی۔ غالب رام پور جانے میں متامل تھے۔ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم والی رام پور کے ساتھ مدت سے دوستانہ تعلقات تھے درمیان میں اُستادی شاگردی کا رشتہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جب حکومت کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو میری* رائے میں اس خیال سے رام پور گئے تھے کہ نواب صاحب کے ذریعہ سے حکومت کو اپنے معاملہ پر توجہ دلائیں۔ اگرچہ بعد میں یہ خیال تبدیل ہو گیا تھا۔

نواب علاء الدین احمد خاں لوہارو آنے پر اصرار و ابرام کر رہے تھے انہیں ۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کے مکتوب میں اپنے ضعف و اضمحلال اور عدم استطاعت سفر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

> کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ (صحیح مدت ایک سال آٹھ مہینے اور چھ دن)

**منازل سفر** غالب اس سفر میں دہلی سے ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو روانہ ہوئے تھے۔ رات مراد نگر میں بسر کی۔ ۲۰ کو میرٹھ پہنچے وہاں ایک روز قیام کیا۔ ۲۱ کو میرٹھ سے روانہ ہو کر ۲۲ کو شاہ جہان پور ۲۳ کو گڑھ مکتیسر اور وہاں سے مراد آباد ہوتے ہوئے رام پور فائز ہوئے۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> بھائی میں نے دلّی کو چھوڑا پنجشنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو مراد نگر۔ اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر روانہ کیا کل شاہ جہان آباد اور پرسوں گڑھ مکتیسر رہوں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔

* لطائف غالب۔ مرتبہ عرشی۔ ص ۹۶

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-

میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مراد نگر میں رہا دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہنچا نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں، بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں مفت کا کھانا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا کل شاہ جہان پور۔ پرسوں گڑھ مکتیسر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔

اس سفر میں باقر علی خاں اور حسین علی خاں (ابنائے میرزا زین العابدین خاں عارف) بھی ہمراہ تھے فرماتے ہیں:-

لڑکوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو خط ان کی دادی کو بھجوا دیے ہیں (یعنی بیگم صاحبہ غالب) تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور استانی جی (بیگم صاحبہ) کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہنا۔

غالب نے سفر کی منزلِ مقصود کو شروع میں خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر پردہ اخفا میں رکھنا ضروری سمجھا تھا لیکن دہلی سے نکل جانے کے بعد ان کے خیال میں اخفا کی ضرورت نہ رہی۔ وہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-

بھائی میں از روئے مصلحت اپنے کو مختلف مقامات کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کرے اس سے پردہ نہ کرنا۔ صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے

رام پور کی کیفیت

رام پور کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:-

اب میرا حال سنو تعظیم و توقیر بہت ہے۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان، کہ وہ تین مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان میں نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے۔ مگر بہ واسطہ ۲۰۰ روپیہ دلوا دیے ہیں۔ بظاہر دیکھیے کیا کہتے ہیں اور کیا قدر کرتے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے۔ اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں ایک دریا ہے کوسی سبحان اللہ

> اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ، اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت دو دن سے کچھ بیمار ہے۔

یہ خط ۱۴ر فروری سنہ ۱۸۶۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت غالبؔ کو رام پور پہنچے ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ وہ ۲۶ر یا ۲۷ر جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو وارد رام پور ہوئے تھے۔

**دریائے کوسی** دریائے کوسی کی تعریف غالبؔ نے میر مہدی مجروحؔ کو بھی لکھی ہے۔

> میٹھو یہ رام پور دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم کے فاصلے پر ایک دریا ہے۔ کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ مگر اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

**پنشن کے متعلق سفارش کی امید** ۱۴ر فروری سنہ ۱۸۶۰ء کے خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:—

> نواب لفٹنٹ گورنر آگرہ سے مرادآباد آیا چاہتے ہیں۔ مرادآباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مرادآباد جائیں گے تو میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال (صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ) کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان میں آتی ہے۔ جو واقع ہوگا نہیں لکھوں گا۔

اس گفتگو سے غالبؔ کا مدعا یہی تھا کہ پنشن کے باب میں جو گفتگو ہوگی اس کی کیفیت لکھوں گا اگرچہ صوبہ جات متحدہ کے گورنر کو دہلی سے کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شاید نواب صاحب کی سفارش سے کوئی راستہ نکل آئے۔

> میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے کتاب اور عرضی اواسط ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کرکے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

**واپسی** جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے غالبؔ آخر مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں رام پور سے واپس آگئے دہلی

میں ان کی واپسی پر چہ مے گوئیاں شروع ہو گئیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:-

میاں میں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا اُستاد تھا وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے نواب نے نوکر رکھ لیا تھا دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انہوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اسے جواب دے دو نواب نے برطرف کر دیا۔

اس کے بعد خود اصل حقیقت بیان کرتے ہیں:-

اب تم اصل حقیقت سنو نواب یوسف علی خاں تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا بشرط حیات بعد برسات پھر جاؤں گا۔

ہرگوپال تفتہ نے قیام رام پور کے دوران میں لکھا تھا کہ مجھے بھی وہیں بلا لیجیے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مرادآباد اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا تو تم کو بلا لوں گا

میر مہدی مجروح نے غالب کا جلد واپس آ جانے کا سبب پوچھا تھا لکھتے ہیں:-

میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے! میں اس مہینے میں رام پور کیوں رہتا! نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں پہنچا۔ یک شنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی

> جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو مسجد جامع میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتا ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔

لیکن یہ سب مشاغل محض افسانہ تھے شوخ طبعی کے کرشمے تھے اصل کیفیت یوں بیان کرتے ہیں :۔

> لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر کی رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات کے دن وہاں کاٹتا اب بہ شرط حیات جدیدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔

یوسف میرزا کو لکھتے ہیں :۔

> میں ۲۳ شعبان (۱۲۷۷ھ) کو رام پور سے چلا اور ۳۰ شعبان کو دہلی پہنچا اسی دن چاند ہوا۔

اپنی تنخواہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

> نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے بھی میں نے نذر دلائی تھی۔ بس بہ ہر حال غنیمت ہے رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر ادا کرنا چاہیے کمی کا شکوہ کیا۔

**دوسرا سفر رام پور** غالب نے رام پور کا دوسرا سفر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کیا اور جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس آئے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے ۱۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو وفات پائی ان کی جگہ نواب کلب علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ نواب صاحب کی مسند نشینی کے جشن کی تقریب میں غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے مولوی عبدالرزاق شاکر کو تحریر فرماتے ہیں :۔

> فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ چہار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوگا۔ تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کی تعزیت اور رئیس حال (نواب کلب علی خاں) کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔

**راستہ اور منازل** یہ سفر غازی آباد، پلکھوے، ہاپڑ اور مراد آباد کے رستے ہوا تھا۔ باقر علی خاں اور

حسین علی خاں اس سفر میں بھی ساتھ تھے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھتے ہیں :

غازی آباد کا حال شمشاد علی (شمشاد علی بیگ رضوان) سے سنا ہوگا ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کرکے راہی ہوا مقصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلہ کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپڑ کو روانہ ہوا۔ دونو برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونو بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔

ہمراہی پہلے سفر میں بھی کافی تھے اور دوسرے سفر میں بھی ان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ کھانے کی کیفیت ان لفظوں میں لکھتے ہیں :-

میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہوگئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھالئے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ اور خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی، ان کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔

پھر فرماتے ہیں :-

چار پانچ بجے صبح، کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا، سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں پہنچا۔ چارپائی بچھائی اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں دو گھوڑے کوتل آرہے ہیں۔ دونو لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ وہ آئے، اور کھانا کھالیا اور چلے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سواری کے لئے دو گھوڑے تھے۔ ایک رتھ تھا دو گاڑیاں تھیں اور غالب پالکی میں سفر کرتے تھے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

بدھ کا دن ہے۔ پہر بھر دن چڑھا ہوگا فقط میں پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۲ر جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔ دونو لڑکے دونو گاڑیاں اور رتھ اور آدمی پیچھے ہیں اب آتے جاتے ہیں، رات بخیر گزرے کل رامپور پہنچ جاؤں گا (یعنی ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو) گھبرایا ہوا ہوں تیسرا دن ہے پاخانہ پھرے کو لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔

واپسی | رامپور وہ ۱۲ اکتوبر کو پہنچے تھے۔ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۷ اکتوبر کو دلی سے چلے تھے

اس لحاظ سے پانچ روز سفر میں صرف ہوئے۔

> رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار، رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلی سے رام پور روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل ستہ وہاں پہنچا۔ بعد اختتام جشن عازم وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دہلی پہنچا۔ غرض راہ میں بیمار رہا۔ پانچ دن مرادآباد میں صاحب فراش رہا۔

دہلی واپس آنے کی تاریخ کے متعلق ایک عجیب اُلجھن ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ وہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچے۔ راستے میں پانچ روز رام پور میں بیمار رہے۔ اس لحاظ سے سفر میں کم و بیش دس روز صرف ہوئے یعنی غالب اواخر دسمبر میں رام پور سے چل پڑے تھے لیکن علاءالدین احمد خاں کے نام کے ایک خط پر جو رام پور سے لکھا گیا تھا ۱۳ جنوری کی تاریخ ثبت ہے سال درج نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ غالب صرف دو مرتبہ رام پور گئے۔ اگر وہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی واپس آ چکے تھے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ۱۳ جنوری کو رام پور میں نہیں تھے۔ پہلی مرتبہ وہ ۲۶ جنوری یا ۲۷ جنوری کو پہنچے تھے۔ اس لئے پہلے سفر کے سلسلے میں بھی ۱۳ جنوری کو ان کا رام پور میں ہونا قابل تسلیم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ نواب علاءالدین احمد خاں کے خط پر جو تاریخ ثبت ہے وہ غلط ہے۔ اور غالب کے مطبوعہ رقعات میں اس قسم کی متعدد غلطیاں موجود ہیں۔

حالات زمانہ قیام

۲۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

> تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت میں آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے۔ دونو وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، آچار، میں بھی خوش لڑکے بھی خوش، کلّو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔

پھر لکھتے ہیں:

> نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن ۳ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی لیکن اس میں میرا فائدہ ہے

نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا

میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کو تحریر فرماتے ہیں :-

آج ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں فرما گئے ہیں دو ہفتہ میں آؤں گا آکر چار روز یہاں رہیں گے پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے وہ پانچ دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا۔ اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔

**کیفیت جشن**

**۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کے مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-**

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پرتاپ پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اُترے کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے یہ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے وزیر علی خاں خان ساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے تین اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی طوائف کا وہ ہجوم احکام کا وہ مجمع اس محلس کو "طوائف الملوک" کہنا چاہیئے۔

**نواب کلب علی خاں مرحوم**

**نواب کلب علی خاں کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں :-**

قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین احمد خاں۔ عمر کا فرق، اور کچھ کچھ چہرہ اور ریش متفاوت حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم سینکڑوں شعر یاد نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں۔ اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کی طرز پر کہتے ہیں شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کو دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔

**حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-**

نواب صاحب حال بہ مقتضائے "الولد سر لابیہ" حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔ بہ مجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کر دیا۔ علی بخش تمان ساماں کو تیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا مفصل حالات بذل و نوال عند الملاقات زبانی کہوں گا ستو صاحب میں فقیر آزادہ کیش ہوں۔ دنیا دار نہیں مکار نہیں جس میں جو صفات دیکھتا ہوں بیان کرتا ہوں۔

متفرق حالات

اس جشن میں غالب کے نہایت عزیز دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی شریک ہوئے تھے۔ نیز منشی نولکشور مالک مطبع نولکشور نے اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلے میں مالی امداد کی عرضداشت پیش کر رکھی تھی۔ غالب ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

میں شعر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم و بہ اعتبار اخلاق ابر رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے۔ اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال کا غلہ کا محصول معاف کر دیا ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا۔ اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی صبیہ تجویز ہوا ہے بمقدار مجھ پر نہیں کھلی بھائی مصطفیٰ خاں بہ تقریب مسند نشینی و شمول جشن آنے والے ہیں اس وقت تک نہیں آئے۔

واپسی کے بعد دہلی سے تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

۸ر جنوری سال حال (۱۸۶۶ء) دو شنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا مراد آباد پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ روز صدر الصدور کے ہاں پڑا رہا انہوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔

جس زمانے میں غالب رام پور میں تھے قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی نے انہیں لکھا تھا کہ بریلی میں نمائش ہو رہی ہے تشریف لائیے اور نمائش کی سیر بھی کیجیے انہیں لکھتے ہیں:۔

مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں بریلی کہاں۔ ۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا نہ بطور

> حیات دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔ نمائش گاہ دہلی کی سیر کہاں، خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں ۔

**سفر میرٹھ**

میرٹھ کے سفر کی تقریب یہ تھی کہ غدر میں دوسرے اکابر کے علاوہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور سات سال قید کی سزا ہوئی۔ بعد ازاں ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کی خبر سن کر غالب ان سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے یہ سفر اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں ہوا تھا تین روز میرٹھ میں ٹھہرے اور ۲۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو دہلی واپس آئے۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

> میں مصطفٰے خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے پھر آیا۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا۔ محررہ و مرسلہ چہارشنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء۔

پھر لکھتے ہیں:-

> صاحب میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں شاید نہ پہنچا ہو اس واسطے از روئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفٰے خاں کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ اور سہ شنبہ کے دن دلی آ گیا (صبح یک شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء)

**مارہرہ جانے کا ارادہ**

غالب کے اور کسی سفر کا علم نہیں ہو سکا البتہ بعض سفروں کے ارادوں اور بعض دعوتوں کا پتہ ان کے خطوط سے چلتا ہے لیکن نظر بظاہر نہ یہ ارادے پورے ہوتے اور نہ غالب نے دعوتیں قبول کیں۔ مثلاً ایک موقع پر مارہرہ کے ایک صاحب سے بہ طریق تمنا ذکر کیا تھا کہ مارہرہ جانے اور پیٹ بھر کر آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی نے جو غالب کے بہت معتقد تھے یہ سنا تو فوراً لکھا کہ جلد مارہرہ آیئے اور دلی سے روانگی کا دن لکھیے۔ جواب میں فرماتے ہیں:-

> حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے۔ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا یا کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روز روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدم بوسی اور انوار الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا

پھر لکھتے ہیں :-

خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں اور طاقت کہاں سے پاؤں

کالپی کا ارادہ

نواب انور الدولہ رئیس کالپی کو لکھتے ہیں :-

میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزو مند ہوں میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا یعنی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان (اکبر آبادی کا پوتا) کہ وہ نواب ذوالفقار الدولہ کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین (باندہ) حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی (غالب کی والدہ) کا دودھ پیا تھا وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامان سفر کر لیا۔ ڈاک میں ڈاک کا روپیہ دے دیا مقصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر (رئیس باندہ) کے ہاں کی سواری میں باندہ جا کر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بسبیل ڈاک چلا آؤں گا ناگاہ حضور والا (ابو ظفر بہادر شاہ) بیمار ہو گئے۔ مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں میرا بھائی مر گیا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

واللہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا مگر نتیجہ اس کا آپ کے دیدار کو سمجھے ہوئے تھا۔

فرخ آباد کا ارادہ

میر احمد حسین خاں میکش کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب تجمل حسین[1]

---

[1] نواب تجمل حسین خاں بنگش خاندان میں سے تھے۔ محمد خاں بنگش سلطنت مغلیہ کے آخری دور کا ایک مشہور سردار اور جرنیل تھا اس نے فرخ آباد کی ریاست قائم کی تھی بلکہ فرخ آباد کا قصبہ خود فرخ سیر کے نام پر آباد کیا تھا ۱۷۴۳ء میں نواب محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا قاسم خاں جانشین ہوا وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کا بھائی اسلام خاں نواب بنا اسلام خاں کے بعد ایک اور بھائی احمد خاں نے ریاست سنبھال لی۔ احمد خاں کے بعد اس کا بیٹا مظفر جنگ مسند نشین ہوا مظفر جنگ نے ۱۷۹۶ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ناصر جنگ پھر ناصر جنگ کا بیٹا شوکت جنگ گدی پر بیٹھا۔ نواب تجمل حسین خاں شوکت جنگ کے صاحبزادے تھے ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کے چھوٹے بھائی تفضل حسین نے ریاست پائی لیکن غدر میں تفضل حسین پر بغاوت کا الزام لگا۔ ملک سے نکل جانے کی شرط پر جان بخشی ہوئی اور وہ عرب چلا گیا۔

والی فرخ آباد کی دعوت پر فرخ آباد جانے کا قصد کیا تھا فرماتے ہیں :-

دریں فرخندہ ہنگام امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ کہ وسادہ نشین ایالت فرخ آباد است...... ورود من بہ فرخ آباد آرزو کردہ ہر چند گوشہ نشینی و نامرادی آئین من است اما بہ مشاہدہ مہرے کہ ایں والا جاہ با من سے ورزد آہنگ آں دارم کہ پائے خوابیدہ را بہ رفتار آرم و از دہلی بہ فرخ آباد پویم و شمارا با خویشتن برم چہ خوش باشد کہ پیوند اقامت پٹودی کہ نہ بر اندازہ ارزش شماست بگسلید و ہم دریں ہفتہ بہ من پیوندید ؎

ہلا کہ شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
عناں گسستہ تر از بادِ نوبہار بیا

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب فرخ آباد گئے یا نہیں گئے لیکن بہر حال ان کا قصد ۱۸۴۶ء سے پیشتر کا ہے۔ اس لئے کہ ۱۸۴۶ء میں نواب تجمل حسین خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالب کی ایک اردو غزل کے آخر میں تجمل حسین خاں کی مدح میں چند اشعار بہ طور قطعہ موجود ہیں ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے،　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیر[1] دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک　　بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

**گوالیار کا ارادہ**

میر سید علی خان بہادر عرف حضرت جی کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار جانے کا قصد بھی کیا تھا۔ حضرت جی کو لکھتے ہیں کہ مجھے ولایت سے اپنے مقدمے کے متعلق آخری اطلاع ملنے کا انتظار ہے۔ اس کے بعد۔

جز آں مایہ مدت کہ بہ سر انجام ضروریات سفر وا تواند کرد بہ دہلی نیارامم و رو بہ گوالیار نہم۔ و اگر روندگان بہ پا روند من بہ سر پویم

غالباً یہ قصد بھی پورا نہ ہوا۔

---

[1] نصیر الدولہ معین الملک حشمت جنگ تجمل حسین خاں کے اجزائے خطاب تھے۔

**سورت کی دعوت** غالب کی زندگی کے آخری دنوں میں نواب میر غلام بابا خاں انہیں سورت بلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ریل کے سفر میں تکلیف نہیں ہوگی۔ غالب ان کے تقاضے کے جواب میں لکھتے ہیں:

> بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ اور ان سب پر ضعف طالع کیوں کر قصد سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں۔ گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں۔[1]

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ریل تین چار روز میں سورت پہنچتی تھی۔ غالب کے کمالات نگارش کا یہ ایک نہایت دلچسپ کرشمہ ہے کہ وہ کسی تفصیل کے عزم و ارادہ کے بغیر مختلف ضروری حالات کو ضمناً بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی پنشن کے لیے درخواست ولایت بھیجنے کے ضمن میں یہ بیان کر گئے کہ جہاز چھ ہفتے میں لندن پہنچتا ہے۔ اور یہاں سورت تک ریل کے سفر کی مدت بیان کر گئے۔

**انبالہ کا ارادہ** غالب کا دربار نمبر اور خلعت جب سرکار انگریزی سے بحال ہوئے تو لفٹنٹ گورنر پنجاب نے انہیں کہا تھا کہ گورنر جنرل انبالہ میں دربار کریں گے۔ وہاں جا کر خلعت لے لیجیے۔ اگرچہ غالب نے اس وقت لفٹنٹ گورنر کو یہ جواب دیا تھا کہ انبالہ کہاں جاؤں گا لیکن بعد میں وہ انبالہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اس سے قبل ان کے سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی نکلی تھی جو پھوڑا بن گئی۔ اس کی وجہ سے انہیں اپنا یہ ارادہ سفر فسخ کرنا پڑا۔[2]

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۲۲۶ [2] اردوئے معلی

# چھٹا باب

## پنشن کا مقدمہ

بندہ را بودہ است از سرکار دست مزد مشقت اسلاف
زر سالانہ برائے دوام وجہ شائستہ بقدر کفاف
ملزمم کردہ اند ہاں بہ دروغ حق من خوردہ اند ہیں بہ گزاف
آہ از اقربائے بے آزرم داد از حاکمان بے انصاف

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے۔ خواجہ حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اتنا مجمل ہے کہ کوئی شخص اس سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیت معلوم نہیں کر سکتا۔ اور جس جھگڑے میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا جس کی وجہ سے ان کا دل مسلسل تیس برس تک ل خوش کن توقعات کا مولد و مشہد بنا رہا اس کی تفصیلات ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ معہذا اس قضیہ کا غالب کی نظم و نثر میں جا بجا ذکر ہے اور جب تک اصل قضیہ کے حالات معلوم نہ ہوں نظم و نثر کے وہ حصے ٹھیک سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس لئے میں نے کوشش کی ہے کہ اس داستان کا ایک ایک پہلو سامنے آ جائے

**خاندانی پنشن کا آغاز** ۱۸۰۶ء میں غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہوا۔ وہ لارڈ لیک کے ماتحت چار سو سوار کے بریگیڈیر تھے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ان کا ذاتی مشاہرہ تھا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ سالانہ کی جاگیر تھی[۵۱]۔ ان کے انتقال پر جاگیر واپس لے لی گئی۔ اور ان کے متعلقین کی پرورش کے لئے دس ہزار روپے سالانہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ کے ذمے لگا دیئے گئے۔

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۔ آزاد مرحوم نے خدا جانے کس بنا پر سترہ سو روپیہ لکھا ہے (ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۹۱)

صاحب کو ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۶ء میں دو جاگیریں بطور استمراری ملی تھیں۔ ایک فیروز پور جھرکا اور سانگرس کی جاگیر دوسری پرگنہ پونا ہانا۔ بچھور اور نگینہ کی جاگیر اول الذکر کا معاوضہ پانچ ہزار روپے سالانہ۔ اور آخر الذکر کا معاوضہ بیس ہزار روپے سالانہ تھا یعنی دونوں جاگیروں کے لئے نواب صاحب پچیس ہزار روپے سالانہ سرکار انگریزی کو ادا کرنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے۔ ان جاگیرات کے باشندے بڑے سرکش اور امن شکن تھے۔ اور ان کو مطیع رکھنے کے لئے نواب صاحب کو خاص انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ لہذا لارڈ لیک کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ نواب صاحب کے ساتھ کسی حد تک رعایت ہونی چاہیئے۔ اسی اثنا میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ لارڈ لیک نے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو حکومت کی طرف سے ایک شقہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے نام بھجوادیا کہ جو پچیس ہزار روپے وہ حکومت کو ادا کرتے ہیں ان میں سے دس ہزار روپے سالانہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو دیئے جائیں میرزا کے مرحوم کے رسالے کے پچاس سوار باقی رہ گئے تھے جن کا افسر خواجہ حاجی نام ایک شخص تھا۔ ان کے متعلق انتظام کر لیا جائے اور قیام امن کے لئے حکومت سے کوئی امداد طلب نہ کی جائے ان شرطوں پر پچیس ہزار روپے کی رقم معاف ہو جائے گی اور جاگیر مستقلاً نواب صاحب اور ان کے وارثوں کے پاس رہے گی۔ یہ شقہ حکومت کا منظور کردہ تھا۔ اور اس کا مسودہ دفتر میں موجود تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور شقہ حاصل کر لیا جس کا مضمون یہ تھا کہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جائیں۔ اور ان متعلقین میں خواجہ حاجی کو بھی شامل کر لیا گیا جو حقیقتہً کسی اعتبار سے بھی میرزا نصر اللہ بیگ خاں کا رشتہ دار نہ تھا اور پانچ ہزار کی تقسیم یہ قرار پائی:۔

| | |
|---|---|
| خواجہ حاجی | دو ہزار روپے سالانہ |
| والدہ و ہمشیرگان نصر اللہ بیگ خاں | پندرہ سو روپے سالانہ |
| میرزا نوشہ اور میرزا یوسف<br>برادرزادگان نصر اللہ بیگ خاں | پندرہ سو روپے سالانہ |

### جھگڑے کی ابتدا کیوں کر ہوئی

غالب ۱۸۰۶ء میں صرف نو برس کے تھے۔ جو کچھ ملتا رہا اس پر قانع رہے جب ہوش سنبھالا تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاندانی جائداد کو بیچ بیچ کر گزارا کرتے رہے۔ نیز نانا کی طرف بھی ان کی کافی امداد ہوتی تھی۔ جب وہ دہلی آ گئے تو غالباً نواب احمد بخش خاں مرحوم وظیفہ مقررہ کے علاوہ بھی ان کی امداد کرتے رہتے تھے۔ جب نواب الٰہی بخش خاں کا انتقال ہو گیا، نواب احمد بخش نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ اور نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے رئیس بنے۔ تو اس وقت مقررہ وظیفہ کے سوا کوئی ذریعہ آمد باقی نہ رہا بلکہ سر امیر الدین احمد خاں کے بیان کے مطابق شمس الدین نے وہ بھی بند کر دیا تھا علاوہ بریں غالب کی بیگم صاحبہ کو تیس روپے ماہانہ کا جو وظیفہ نواب احمد بخش خاں کے زمانے سے فیروز پور جھرکہ سے ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اس حالت میں غالب کو اپنی خاندانی پنشن کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں پانچ ہزار روپے کے اس شقہ کا غالباً کوئی علم نہ تھا جو نواب احمد بخش خاں نے ۷ جون ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک سے حاصل کیا تھا۔ اور سمجھ رہے تھے کہ لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری سے ان کے خاندان کے لئے دس ہزار روپے سالانہ کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی۔ وہی ملنی چاہئے۔ اس پنشن میں سے ان کے خاندان کو صرف تین ہزار روپے ملتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی چونکہ نصر اللہ بیگ خاں کے حقیقی متعلقین میں شامل نہ تھا اس لئے اس کے دو ہزار روپے کو بھی وہ اپنی خاندانی پنشن کا جزو نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مطالبہ پیش کیا کہ اول ان کی دس ہزار کی پنشن بحال ہونی چاہئے دوم جتنی رقم انہیں نہیں ملی وہ مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر کاملاً ملنی چاہئے۔

### مصیبتوں کا ہجوم

اس زمانے میں ان کی مالی حالت بہت سقیم تھی، وہ اپنی آزادہ مشربیوں میں کافی اُڑا چکے تھے۔ بہت سا روپیہ قرض لے چکے تھے ایک طرف قرضخواہ انہیں تنگ کر رہے تھے دوسری طرف۔ ان کا بھائی دیوانگی کے عارضہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> آغاز ورود دہلی کہ فرد یاد و غفلتے بہ تیج دانستم سختے از عمرم بدوں جادہ کامروائی ہوس گزشت و سپہ راہم خرامیدہ شد۔ تا سراز سرمستی گردیدہ و اندراں آنجو دمی پاے مطلبہ پیاپے بہ گوے فرو رفت …… ہنگامہ

دیوانگی برادر یک طرف و غوغائے وام خواہاں یک سو آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب و نگاہ روزنہ چشم فراموش کرد.... با بسے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فروبستہ جاں جواں شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بر دم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم۔

**نواب کے ساتھ فیصلہ کی کوشش**

معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ جانے سے قبل دہلی کے مختلف دوستوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ خود نواب صاحب ہی سے فیصلہ کر لیا جائے چنانچہ وہ اس غرض کے لئے فیروز پور جھرکہ گئے۔ وہ خود دہلی سے نواب الٰہی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :-

> یک چند بہ امید نواب صاحب سوختم و از تاب آتش انتظار گداختم نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بزنداں نشیند و مے بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند بہ فیروز پور از بہر آں نیامدہ بودم کہ بازم بہ دہلی باید آمد نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند..... تا کجا شکیب ورزم و خود را بہ ہیچ شاد ماں دارم اندرون دیوار شاہ جہان آباد دیا بارہ..... میر امام علی را با عرضداشت بہ خدمت نواب صاحب فرستادہ ام زنہار با من زمانہ سازی و از نواب محابا مکنید۔ و چناں کنید کہ چوں عرضداشت خواندہ شود شما ہم دراں انجمن باشید تا نگارش را بہ گزارش نیرو دہید..... یاراں مے گفتند کہ تو بہ نواب نمی گرائی و درد دل با وے نمی گوئی۔ ورنہ از کجا کہ نواب بہ چارہ برنہ خیزد..... اینہا کہ مے گویم از بہر زباں بندی ایں ناشناساں است۔ خدا را طرح آں افگنید کہ میر امام علی زود برگردد و بہ من پیوندد تا دوستاں را ہم را خیرباد گویم و بہ سمتے روم کہ نہ دارم شرح گویم

**کلکتہ میں کوشش**

بہرحال غالب جون سنہ ۱۸۲۷ء میں دہلی سے روانہ ہو کر فروری سنہ ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے دو روز آرام کرنے کے بعد نواب اکبر علی خاں سے ملنے کے لئے ہوگلی گئے جن کے نام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے ایک سفارشی خط دیا تھا[51]۔ اس کے بعد سائمن فریزر صاحب سے ملے جو اس زمانے میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی میں اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدے پر مامور تھے۔ فرماتے ہیں :

> سیمن فریزر اسسٹنٹ سکرٹر را دریافتم ملاقات شائستہ رو داد و استقبال و مشایعت و معانقہ و عطائے عطر و پان بہ میاں آمد۔ طرز ملاقات ایں ستودہ خوئے خرسند و توانا دلم کرد۔ عرضداشت گورنر جنرل

---

[51] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۶ -

> بہادر چنانکہ رسم این دادگاہ ہست بہ صاحب سکرٹری بہادر سپردہ اندو ہم دریں صحبت صاحب سکرٹری
> بہادر آں را با پاٹن صاحب سپرد تا آں بہ انگریزی نقل کند۔

اس تحریر سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۸ء میں انگریز افسر معزز ہندوستانیوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔ جب وہ ملنے کے لیے آتے تھے تو افسر ان کا استقبال کرتے تھے۔ ان سے معانقہ کرتے تھے۔ عطر اور پان دیتے تھے اور جاتے وقت چند قدم چھوڑنے کے لیے ساتھ جاتے تھے۔

**چیف سکرٹری سے ملاقات** مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ جو دفتر فارسی کے سکرٹری اور پولیٹکل ڈی پارٹمنٹ کے ڈپٹی سکرٹری رہ چکے تھے[1]۔ غالب کا مقدمہ پیش ہونے کے زمانے میں چیف سکرٹری تھے[2]۔ غالب نے ان سے بھی ملاقات کی۔ وہ بڑی اچھی فارسی جانتے تھے۔ غالب کے بیان کے مطابق سخن فہم تھے۔ بڑے حسن اخلاق سے ملے۔ غالب نے ان کی مدح میں پچپن شعر کا ایک فارسی قصیدہ کہا تھا۔ اس کا ایک حصہ سنایا۔ مسٹر اسٹرلنگ بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ پوری امداد فرمائیں گے۔ غالب لکھتے ہیں:

> اندرو اسٹرلنگ کہ قوس عروجی کونسل را نقطہ بدایت و قوس نزولی آں را نقطہ نہایت است چوں سرمایہ علم و آگہی وارد و سخن را مے فہمد و بہ اطافت سخن وا مے رسد در مدح وے قصیدہ مشتمل بر پنجاہ و پنج بیت انشا کردم و در آخر قصیدہ لختے از حال خویشتن نگاشتم از حسن اتفاق نہ بسعی کسے ملازمتش بروش گزیدہ و ایں معنی پسندیدہ بہم داد۔ اعتبار خاکسار بہائے سخن افزود و عیار اُمیدواری بہائے سخن کامل برآمد پارہ از قصیدہ برخواندم محظوظ شد۔ دلجوئیہا کرد و وعدہ یاریگری داد۔

غالب نے اسٹرلنگ کے قصیدہ میں اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ انہی کی زبان سے سن لیجیے ؎

من شکستہ دل بے نوائے ہیچمداں ۔۔۔ چگونہ دم زدم از دعویٰ ثنا خوانی
گدائیم و بہ تمنائے داد آمدہ ام ۔۔۔ بہ درگہے کہ بود قیصرش بہ دربانی
ز نالہ ام چہ محابا کہ معدلت کیشی ۔۔۔ ز گدیہ ام چہ خجالت کہ از کریمانی
نہ مالکانہ خواہم و نے مال ایں قدر خواہم ۔۔۔ کہ گردمن نرخ بخت غم سیہ فشانی

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۴۰۵ [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷۔

مرا دلیست ز دردِ شکستگی لبریز — نہ آرزوئے امیری نہ حسرتِ خانی
زبست سال فزوں می شود کہ می سوزد — نفس چو رشتۂ شمعم بہ بزمِ حیرانی
کجاست جیب کہ چاکے درو توانم زد — مگر جگر بہ دریدن دہم ز عُریانی
ز اہلِ دہر دریں روزگارِ بے روی — بہ عیدِ عشرتِ خویشم نمودہ قربانی
سیاہ مست نہ دارد ز کس محابائے — شمردہ خونِ دلم را رحیقِ ریحانی
شرر بہ پیرہنِ جاں فشاند جا نگزاشت — کہ شعلہ سر کشد از داغہائے پنہانی
چناں بہ حلقۂ دامم کشید تنگ کہ من — بہ بندِ عجز فسردہ ماندم از پر افشانی
غریب نیست بہ دردِ دلم رسیدن ہا — نہ مدعی عربی و نہ من خراسانی
بہ دادگاہ رسیدم چنانکہ دانستم — بپرس بہ دادِ غریباں چنانکہ می دانی

**کونسل کا طریقِ کار**

اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ جب دو تین مقدمے کونسل میں پیش ہونے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ تو اسسٹنٹ سکریٹری صاحب دادخواہوں کے نام اور حالاتِ مقدمات چیف سکریٹری صاحب کے روبرو پیش کر دیتے تھے چیف صاحب ہر مقدمے کے حالات ملاحظہ کرتے ان پر غور فرماتے جن مقدمات کو کونسل میں پیش کرنے کے قابل سمجھتے رکھ لیتے بقیہ مقدمات کو واپس کر دیتے[1]۔ غالب یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

> بارے بہ ہوس شادمانم کہ داد نامۂ من پذیرفتنی و بہ کونسل گذشتنی سنجیدہ شد، تا دراں انجمن چہ روئے دہد و فرمانِ فرماندہاں دربارۂ من چہ باشد۔

**دہلی میں مقدمہ پیش کرنے کا حکم**

عرضداشت کونسل میں پیش ہوئی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ضابطے کے مطابق یہ معاملہ سب سے پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس پیش ہونا چاہیے۔ غالب نے عذر پیش کیا کہ میرے پاس اتنا ساز و سامان اور تاب و تواں نہیں کہ کلکتہ سے دہلی جاؤں اور وہاں سے دوبارہ چارہ خواہی کے لیے کلکتہ آؤں اس پر کونسل نے حکم دیا کہ خود یہاں انتظار کرو اور وکیل کے ذریعے سے

---

[1] کلیاتِ نثرِ فارسی صفحہ ۱۶۸۔

دہلی میں مقدمہ پیش کراؤ۔ غالب لکھتے ہیں :۔

عرضداشت بہ کونسل گذشت ۔ و فرمان صادر گشت کہ ضابطہ مقتضی آن است کہ نخست نزد منتظم بہ گوش ریذیڈنٹ دہلی رسیدہ آید گفتم کہ سرو برگ و تاب و تواں معاودت نیست فرمان یافتم کہ خود ایں جا باش و حالۂ بہ ریذیڈنسی دہلی گرامیہ ۔

اس پر غالب نے کلکتہ سے اپنے ایک دوست کو لکھا۔ ایک وکیل کے ذریعہ سے دہلی ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرایا۔ اور تمام ضروری کاغذات اپنے وکیل کے پاس دہلی بھیج دیئے۔[۵۳] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دہلی میں کس شخص نے وکالت کی اور کون سے دوست نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔ رائے چھجمل کے نام کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو وکیل کرنے کے خواہاں تھے۔[۵۴] ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ لالہ ہیرالال ان کے وکیل تھے۔

**پیشی میں تعویق** مقدمہ تیار ہو چکا تھا لیکن ابھی پیش نہیں ہوا تھا کہ ایڈورڈ کول بروک ریزیڈنٹ دہلی دورے پر روانہ ہو گئے اس وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ غالب لکھتے ہیں :۔

کاغذ فرستادہ من رسیدہ است کار فرما آں را پذیرفت ۔ وکالت نامہ وکیل داد ہنوز وکالتش از قوۃ بہ فعل نیامدہ بود کہ روشن الدولہ مسٹر ایڈورڈ کول بروک فرمانروائے دہلی بہ ہنجار دورہ بال نہضت کشاد ہر آئینہ انتظار باز گردیدنش پیش و این درنگ کہ بے خواست درمیان آمد بجائے خویش است ۔

ادھر کلکتہ میں ولیم بیلی رکن اعظم کونسل برما چلے گئے۔ لارڈ ہیٹنگز گورنر جنرل شکار کے لئے مالدہ روانہ ہو گئے۔ مولوی عبدالکریم صاحب میر منشی دفتر فارسی نے آٹھ ماہ کی رخصت لے لی اور وہ اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے۔[۵۵]

**انگریز کرنیل کی سفارش** غالب نے ایک فوجی افسر کرنیل ہنری املاک سے مسٹر ایڈورڈ کول بروک کے نام ایک سفارشی خط لکھوا دیا تھا۔ نیز نواب اکبر علی خاں متولی امام باڑہ ہوگلی بندر سے ایک سفارشی خط منشی التفات حسین خاں کے لئے حاصل کیا تھا۔ جو غالباً ریزیڈنسی کے میر منشی تھے۔ یہ خط لالہ ہیرالال

---

[۵۳] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۸ و ۱۶۹ [۵۴] کلیات نثر فارسی صفحہ ۹۵ [۵۵] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹ ۔

وکیل کو بھجوا دیا تھا۔ علی بخش خاں رنجور کو یہ تمام حالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :-

> وقت است کہ رپورٹ مقدمہ من از محکمہ ریذیڈنسی دہلی بال روانی گشاید لاجرم شما را باید بہ منشی التفات حسین سر رشتہ گفتگو وا کردن۔ و درنگ آں ریختن کہ تقریباً ذکر سفارش نامہ کرنیل ہنری املاک بہادر درمیان آورند تا گل مدعا شادمانی پذیرد و از ورزش من بہ لطف و ضمیر حاکم تازہ گردد۔

معلوم ہوتا ہے کہ کرنیل ہنری املاک کی سفارش پر سر ایڈورڈ کول بروک نے اچھی رپورٹ اوپر بھیجی تھی اور وہاں سے اچھا جواب حاصل کر لیا تھا لیکن جواب ابھی دہلی پہنچا نہیں تھا کہ صاحب موصوف دفعتہً ریزیڈنسی سے علیحدہ ہو گئے اور ان کی جگہ فرانسس ہاکنس رزیڈنٹ مقرر ہو گئے جن کے ساتھ والی فیروزپور جھرکہ نے بہت گہرے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ انہوں نے از سر نو غالب کے خلاف رپورٹ لکھ بھیجی۔ غالب فرماتے ہیں :-

> کول بروک بہ توسط کرنیل ہنری املاک بر من مہربان شد و رپورٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید بہ صدر فرستد و جوابے کہ سود مند تر ازاں نتواں سنجید از صدر حاصل نماید۔ ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کول بروک معزول گردد و ہاکنس بجائے کول بروک نشیند آنچہ برہم زدن ہنگامہ سلطنت را بس باشد از بہر من بہ صدر نویسد۔

**مزید سفارش کی سعی**

کلکتہ کے ایک دوست میرزا ابوالقاسم خاں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کرنیل ہنری املاک سے فرانسس ہاکنس کے نام بھی سفارشی خط حاصل کریں گے لیکن کرنیل ہنری املاک بیمار ہو گئے۔ اور اسی بیماری میں وفات پا گئے۔

> میرزا ابوالقاسم خاں وعدہ دادند کہ چوں کرنیل ہنری املاک را فرجام رنجوری برخیزد سپارشنامہ ای وے بنام ہاکنس صاحب بہ کف آرند و بہ من رسانند ہم دریں روزہا یکے از سترگان فرنگ بہ من گفت کہ کرنیل ہنری املاک از جہاں رفت وائے بر روزگار من کہ دریں دیار بے فرمانروا مرگ سے زخم و جاں بہ ناکامی سپردہ و ہم عدو جاہ مند و مالدار و من تہی دست و تنہا۔

---

ؔلہ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۰۰ —

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسس ہاکنس کے رزیڈنٹ مقرر ہو کر غالب کے مقدمہ کے متعلق رپورٹ پیش کرنے تک غالب کلکتہ سے واپس آچکے تھے وہ کلکتہ میں کم و بیش دو برس ٹھہرے اس دوران میں چونکہ دہلی ریزیڈنسی سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا اور ولیم بنٹنگ گورنر جنرل ادھر پر دہلی وغیرہ پر آنے والے تھے اس لئے غالب بھی وہاں سے چلے آئے۔ تاکہ جلد سے جلد ریزیڈنسی سے رپورٹ پیش کرا کے گورنر جنرل کے دورے ہی میں اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرا لیں۔

**ریزیڈنٹ سے بے پروائی** فرانسس ہاکنس نے غالب کے خلاف رپورٹ لکھ دی تو ریزیڈنسی کے دفتر میں جو لوگ غالب کے ہمدرد تھے اور رپورٹ کے راز سے آگاہ تھے۔ وہ ہر چند غالب سے کہتے رہے کہ ابھی وقت ہے کچھ چارہ کر لیجئے۔ ہاکنس صاحب سے مل کر اپنے حالات خود انہیں سنا دیجئے لیکن غالب کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ چیف سکریٹری سے مل چکے ہیں اور ان سے امداد و اعانت کا وعدہ لے چکے ہیں۔ اس لئے انہیں ریزیڈنٹ کی مخالفانہ رپورٹ کی چنداں پروا نہ تھی وہ خود لکھتے ہیں:۔

> اگر بار اُمیدم را استواری تحریر یافتہ صدر نبودے پیش دستان ایں محکمہ (ریزیڈنسی) رخنہ در بنیادم افگندہ بودند و حاکم را بر من دگرگوں ساختہ۔

**مسٹر اسٹرلنگ کا انتقال** لیکن سوء اتفاق دیکھئے کہ ادھر ریزیڈنسی میں غالب کے خلاف رپورٹ تیار ہوئی ادھر کلکتہ میں مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کا انتقال ہو گیا اور غالب کی یہ اُمید گاہ بھی جاتی رہی۔ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کا انتقال ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو ہوا غالب لکھتے ہیں:۔

> فرماندہ ایں خراب آباد کہ فرانسس ہاکنس بہادرش نامند با والی فیروز پور پیمان یک دلی بست۔ و رپورٹے چنانکہ خواست بہ صدر فرستاد۔ ہر چند پردہ داران در پردہ بارم دادند و سخنے ازاں راز بہ من باز گفتند مرا دل از جائے نہ رفت گفتم اسٹرلنگ حق پرست و حق شناس کسے ہست کہ سر رشتہ ہر کار بہ دست اوست بچارہ گری خواہد نشست قضا بر من خندید، طرح آں افگند کہ پیش ازانکہ رپورٹ بہ صدر رسد اُمید گاہ مرا اجل فرو رسید و چشم جہاں بینش فرو بستہ شد۔

پھر فرماتے ہیں :-

حیرتے داشتم کہ بہ مرگِ ناگاہ و درگزشتن امیرِ جواں دولت و جواں سال یعنی مسٹر اندرو اسٹرلنگ ستودہ خصال برائے چیست۔ و کارپردازانِ قضا ازیں سانحہ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند؟ حالیا حالی شد کہ بہ سیلابِ فنا دادن بنارِ امیدواری غالبِ رسیدہ بخت مے خواستند۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

مسٹر اندرو اسٹرلنگ مُرد و از گیتی جز نامِ نیکو با خود نبرد۔۔۔۔۔ اکنوں اُمید غمخواری اند کہ بایدم داشت و دل را بہ خیالِ گردشِ چشمِ تو تسکین بایدم داد۔ رپورٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوص دادخواہی من بہ صدر فرستادہ است چہ گویم کہ چہ مایہ اُمیدگاہ و اندوہ فزا بودہ است تکیہ بر کارسازیِ آں چابک خرام بیدائے فنا داشتم اکنوں از کشش سوزناک بہ کامِ دشمن است۔

غالب نے اینڈریو اسٹرلنگ کی وفات پر ایک قطعہ لکھا تھا جو ان کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ اس میں صاحبِ موصوف کے اوصافِ حسنہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

بہ صد نشاط سی و پنج سالہ از دنیا    جریدہ رفت جواناں چنیں روند چنیں
بہ روزِ بست و سوم ۲۳ از مئی بہ ہنگامے    کہ بود خسرو انجم بہ برجِ ثور مکیں،
ہزار و ہشت صد و سی ۱۸۳۰ ز عہدِ عیسیٰ بود    کہ جست برقِ جہاں سوز ایں الم زمیں

……

ہمیں ہم است نہ تنہا زباں فغاں پیما    ہمیں ہم است نہ تنہا جگر شگاف آگیں
لباسِ نیلی و رخت سیاہ پوشیدہ،    سپہریاں بہ سپہر و زمینیاں بہ زمیں
دگر زباں بہ ثنائے کہ جنبدم بہ دہن    دگر اُمید وفائے کہ بخشدم تسکیں

……

بہ رفتہ نقشِ خیالے نخواہد رست    ز خاطرِ اسد اللہ دادخواہ حزیں

رپورٹ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کے انتقال سے صرف اُنیس روز قبل یعنی ۴ مئی سنہ ۱۸۳۰ کو دہلی

سے روانہ ہوئی تھی۔ غالب خود فرماتے ہیں:—

بہ روز چہارم از مئی کہ چہارشنبہ بود و با یازدہم ذی قعدہ تطابق داشت رپورٹ مقدمہ من ازیں داوگاہ بہ صدر رواں شد۔ ہے ہے چہ رپورٹ و کو مقدمہ۔ رپورٹے چوں موئے زنگیاں خم اندر خم، رپورٹے چوں حال دل بستگان درہم۔ رپورٹے فتوائے خون یک جہان آرزو و رپورٹے فرمان ریزش آبرو۔

غالب نے ہاکنس کی رپورٹ کے متعلق ایک قطعہ بھی لکھا ہے ؎

ایا ستم زدہ غالب ز ہاکنس مسگال　　منہ بہ سینہ سے کینہ از شکایت داغ
اگر بہ جہد خلاف تو کردہ است رپورٹ　　دگر بہ خصم بہ قتل تو بستہ است جناغ
قضا بنار خرابی فگند و ہم ز بخت　　ندیدہ کہ ہماں عکس غالب است بلاغ

**نئے چیف سکرٹری کے پاس کوشش** اینڈریو اسٹرلنگ کی جگہ جارج سونٹن چیف سکرٹری مقرر ہو گئے۔ غالب نے ان کے پاس سفارش پہنچانے کے لئے مولوی سراج الدین احمد کو لکھا:۔

بخدا اگر جارج سونٹن مہربان گردد و در ظہور حق تحقیقی کوشد۔ بہ کام دل رسیدن من آسان است۔۔۔

اگر کار خود را کار شما نہ دانستم چگونہ ایں، از سترگ درمیان مے نہادم۔

اس باب میں غالب کو رازداری کا بھی بہت خیال تھا مولوی سراج الدین کو جارج سونٹن تک سفارش پہنچانے کی تحریک کے بعد لکھتے ہیں:—

ہر نامہ کہ از من مے رسیدہ باشد۔ بعد خواندن و بہ مولانا نمودن مے دریدہ و بہ آب و آتش افگندہ باشد۔

**ہر کوشش ناکام** لیکن تھوڑی مدت کے بعد جارج سونٹن صاحب ولایت چلے گئے۔ غالب ایک خط میں اپنی ناکامی کی داستان درد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

سبحان اللہ معزول نہ گردد مگر کول بروک، بہ مرگ ناگاہ نہ میرد مگر اسٹرلنگ، بولایت نہ رود مگر جارج سونٹن، در غور صدمہ ہائے جاں کاہ نہ باشد مگر اسد اللہ۔ داد خواہا اکنوں مصلحت دریں مے بینم کہ ازیں داوری قطع نظر فرمایند و کالت نامہ من کہ نزد منشی نصر اللہ صاحب است باز ستانند و از ہم درند بگزر اللہ بس، ما سوا ہوس۔

یہ غالب کے مقدمہ کلکتہ کے وہ حالات ہیں جو ان کے اپنے مکاتیب سے ماخوذ ہیں :-

**غالب کے دعوے کی بنا** اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب حکومت کے اس شقہ کی بنا پر دس ہزار روپے سالانہ کے طلبگار تھے۔ جو لارڈ لیک کی تجویز کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد ان کے متعلقین کی پرورش کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں کے نام ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو جاری ہوا تھا۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم لارڈ لیک کے ۷ جون ۱۸۰۶ء کے شقہ پر عمل پیرا تھے جس کے مطابق ان پر صرف پانچ ہزار روپے سالانہ واجب تھے اور ان پانچ ہزار میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے لئے تھے اور بقیہ تین ہزار نصر اللہ بیگ کے متعلقین یعنی والدہ، ہمشیرگان اور برادرزادگان کے لئے مقرر تھے۔ غالب کو اس آخری شقہ کی صحت سے انکار تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کا کوئی مسودہ سرکاری ریکارڈوں میں موجود نہ تھا۔ نہ اس کی نسبت، یہ دعوے کیا جا سکتا تھا کہ وہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء والے شقہ کی طرح حکومت کی منظوری سے صادر ہوا تھا اس لئے اسے ۴ مئی ۱۸۰۶ء والے شقہ اور تجاویز کا ناسخ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ غالب کے دعوے کی حقیقی بنا یہی تھی ۔

**خواجہ حالی کا بیان** خواجہ حالی فرماتے ہیں :-

> اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے ..... وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اس وقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے انہوں نے دلّی ہی میں میرزا (غالب) سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کیا تھا۔ ان امیدوں کے وثیقے پر وہ پورے دو برس کلکتہ میں رہے مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ اور انہیں کے رو برو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا انہوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا۔ اور جس قدر پنشن فیروزپور سے ملنی قرار پائی تھی اس کی مفصل کیفیت جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی گورنمنٹ میں بھیج دی۔

لیکن میری رائے میں خواجہ مرحوم کی یہ تحریر بعض غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اینڈریو اسٹرلنگ کا وعدہ امداد بالکل درست ہے لیکن یہ دعوےٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ کول بروک نے کلکتہ جانے سے

قبل دہلی میں غالب کے مفید مطلب رپورٹ کا وعدہ کر لیا تھا۔ غالب کی جو تحریریں اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ کلکتہ میں مقدمہ پیش کرنے کے وقت تک انہیں یہ خیال ہی نہیں تھا ضابطے کے مطابق مقدمہ پہلے ریزیڈنسی میں پیش ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ کلکتہ جا کر اور ضابطہ کا یہ حکم سن کر اپنی بیچارگی پر زور نہ دیتے اور کلکتہ میں بیٹھ کر وکیل کے ذریعہ سے ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرانے کے بجائے خود دہلی میں فیصلہ کرا کے کلکتہ جاتے۔ دوسرے کلکتہ سے کرنیل ہنری املاک کا سفارش نامہ کرنل بروک صاحب کے نام نہ بھجواتے۔ نیز نواب اکبر علی خاں طباطبائی سے منشی التفات حسین کے نام خط نہ لکھواتے۔[۱]

**سر جان میلکم نے کیا کہا تھا؟** یہ بالکل درست ہے کہ سر جان میلکم صاحب کے پاس والی فیروزپور کا پانچ ہزار والا شقہ اس غرض سے پیش کیا گیا تھا کہ اس کی مہر اور دستخط دیکھ کر بتائیں کہ وہ لارڈ لیک کا ہے یا نہیں لیکن دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں غالب کی پنشن کے متعلق جو کاغذات ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سر جان میلکم نے صرف اس امر کی تصدیق کی تھی کہ والی فیروزپور کے پیش کردہ شقہ پر مہر لارڈ لیک کی ہے اور دستخط بھی انہی کے ہیں۔ باقی امور کے متعلق یا غالب کے دعوے کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ غالب اس شقہ کے متعلق اپنے ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں

> فرماندہ دہلی وکیل مرزبان میوات (نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروزپور جھرکہ) را نزد خود خواند و کاغذ گزارندہ مہرے بودے باز داد و گفت کہ جعلی است۔ مہر و دستخط این کاغذ ثابت نہ شدہ و سر جان میلکم بہادر ایں را بہ دیدہ وری پذیرفت اکنوں مرا گرہے چند بہ سررشتہ خیال افتاد یکے از دیگرے سخت تر و محکم تر نخست اینکہ کہ سر جان میلکم چنانکہ نامہ فارسی بے نام و نشان را باور داشت رپورٹ انگریزی را کہ جگر گوشہ دفتر سرکاری است نیز غلط وانمودہ است یا نہ؟ دوم اینکہ ہرگاہ ایں خط فارسی نمے تواند کہ رپورٹ انگریزی را ناسخ افتد بدیں زودی چرا باز آمد؟ بایستے کہ مقابلہ ایں ہر دو تحریر بہ میان آمدے تا کار یک سو شدے سوم ایں کہ ہرگاہ خط فارسی بہ مدعا علیہ کہ ایں نقش تازہ بر روئے کار آوردہ

---

[۱] کلیات نثر صفحہ ۱۰۰

اوست باز دادند به مدعی چرا نه گفتند که زر مستند حیه این را باید ستد و دیگر نباید خروشید۔

**غالب کا دعوےٰ مسترد ہو گیا**

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار والا شقہ والی فیروز پور نے مقدمہ کے آغاز میں پیش نہیں کیا تھا بلکہ مقدمہ کے آخری دور میں پیش کیا تھا۔ جارج سوئنٹن کے ایک خط سے جو ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے۔ اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ سر جان میلکم کی تصدیق کے بعد وہ پانچ ہزار والے شقہ کی صحت کے منکر نہیں رہے تھے تاہم ان کی رائے یہ تھی کہ اس شقہ سے حکومت کے منظورہ شقہ کی تنسیخ نہیں ہو سکتی لیکن پانچ ہزار والا شقہ ہی صحیح سمجھا گیا اور غالب کا دعوےٰ مسترد ہو گیا۔ غالب کے دل پر اس استرداد سے جو اثر پڑا اس کا اندازہ ذیل کے الفاظ سے ہو سکتا ہے:-

کار من به دادگاه دہلی چنانکه دانسته باشند تباہی گزید۔ حالیا بر آں سرم که اگر مرگ امان دہد باز بدان (کلکته) رسم و درد دل بدان زمزمه فرو ریزم که مرغان ہوا و ماہیان دریا را بر خود بگریانم ہیہات اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیه سالانه ہم بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار که ساده لوحان آں را سند آثار گویند ثابت شده بودے بایستے که صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے که ہرزه مخروش آنچه تو باز یافت و انمودی یافتنی از آں فزوں تر نیست۔ قرارداد نیز ہماں است۔ لاجرم دیوانه بودمے اگر بدیں کشور باز آمدمے و با یک قبیله که خویشان و برادران من اند به ستیزه برخاستمے و به جعل سیری نام بر آوردمے۔

**گورنر جنرل کے پاس اپیل**

لیکن غالب اس پر خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے پھر براہ راست گورنر جنرل کے پاس اپیل کر دی۔ وہ اس سلسلے میں دوبارہ کلکتہ جانے کے آرزومند تھے لیکن زاد راہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے شاہ اودھ کی مدح میں ایک قصیدہ بھیجا تھا اس کے صلہ کے متوقع تھے۔ اور اس صلہ کو سفر خرچ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے وہ منشی محمد حسن کے نام کے خط میں شاہ اودھ کے قصیدہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:-

بو که مرا به جائزه یاد خوانی و صله مدح گستری ایں مایه ساماں فراز آید که خود را گرد آورده به کلکته توانم برد۔ و کارے توانم کرد وقت از دست می رود و ہنگامه کار ہمے گزرد۔

سفر کا سامان میسر نہ آسکا اور وہ اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ گورنر جنرل بہ سلسلہ دورہ دہلی پہنچیں تو ان سے آخری جواب کے لئے تقاضا کیا جائے گا۔

چار سال مے گزرد کہ مقدمہ من بہ اجلاس کونسل در پیش است۔ و دلم از تفرقۂ امید و بیم ریش چشمے کہ قطع خصومت تواند کرد برنیامدہ و ہنگام بہ پایان رسیدن تیرہ شب ناامیدی در نیامدہ حالیا برآں سرم کہ چون جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنک بہادر بدیں دیار رو آید بہ دامنش درآویزم و داد خواہم و استدعائے حکم اخیر کنم۔

لارڈ صاحب کا دامن تھام کر غالب نے داد خواہی پر ابرام کیا یا نہیں کیا۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ لارڈ صاحب نے ان کے کاغذات منگا لیے۔ غالب فرماتے ہیں:۔

انجام داد خواہی من جز ایں قدر نیست کہ لارڈ کونڈس بنٹنک بہادر کاغذ مقدمہ مرا از دفتر دہلی با خود برد کارپردازان دفتر گورنری مے گفتند کہ داد نامہائے پیشیں از دفتر کلکتہ نیز طلب فرمودہ است تا بہ مشاہدہ آں مجموع حکم اخیر توانم داد۔

**مایوسی** لیکن ان کا دل مایوس تھا۔ انہیں اس بات پر بے حد قلق تھا کہ ایک غیر منظورہ تحریر کی بنا پر حکومت کی منظورہ تحریر منسوخ کر دی گئی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

نظر بہ تفرقہ کہ در قوانین حکومت رخ دادہ و بہ حکم کشاکشے کہ در سر رشتہ کار من افتادہ اگر فی المثل دربارہ من حکم قتل صادر گردد بعید نے دانم و اگر بالفرض یک نیمہ از جاگیر فلاسے بہ من بخشیدہ شود شگفت نمے پندارم۔ چوں عدل حقیقی نیست ہر چہ باشد گو باش۔

**اپیل مسترد ہوگئی** آخر کار غالب کے خلاف فیصلہ صادر ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

چپراسی سر رشتہ ایجنٹی دہلی رسید و نامہ مہری ولیم فریزر بہادر بہ من داد۔ چوں بہ میزان نظر سنجیدم گرانش ازاں بود کہ آں را یک نامہ تواں انگاشت بارے از ہم کشودم و دیدم کہ نامہ مہری ولیم جے[1] میکناٹن

---

[1] سر ولیم جے مکناٹن ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک لارڈ ولیم بنٹنک کے سکرٹری تھے اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۷ء تک حکومت ہند میں پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری تھے۔ (ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۲۶۶)

صاحب بہادر در دور آن است مضمونش اینکہ کو انعد منتظمہ مثل مقدمہ از نظر نواب معلی القاب گورنر جنرل) مکرر گذشت و فرمان صادر شد کہ تجویز ہاکنس صاحب منظور و مہر و دستخط کاغذ گزرانیدہ مرزبان میوات (والی فیروزپور جھرکہ) دہلی و بندوبست مندرجہ دفتر سرکار ناصحیح و ناکمل فقط اللہ درین حال ع

در خاندان کسریٰ ایں عدل و داد باشد

**گورنر جنرل سے ملاقات بھی نہ کی**

غالب اس کے بعد اس درجہ مایوس ہوئے تھے کہ گورنر جنرل دہلی آئے تو ان سے ملنے بھی نہ گئے۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

> لارڈ کونڈس بنٹنک بہادر سومین نوبت بہ دہلی نزول اجلال فرمودہ و بودیار دادہ مرزبانان و مشاہرہ خواران، بزرگان و مالداران شہر رفتند و نشستند و عطر و پان یافتند۔ غالب مستمند گرشتہ صورت معقولہ اعمال خود است دریں ہنگامہ جا گرم نہ کرد و بہ بارگاہ نہ رسید چشم براہ پدید آمدن ابر رحمت از جانب محیط کہ اشارہ بورود نواب گورنر جنرل جدید است ۔

یعنی غالب سمجھ رہے تھے کہ لارڈ بنٹنک تو ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے شاید جدید گورنر جنرل یعنی لارڈ آکلینڈ ان کی حق رسی پر متوجہ ہوں۔ اس لیے لارڈ آکلینڈ کے ورود کو ابر رحمت قرار دیتے تھے جس کی آمد کے انتظار میں وہ بیٹھے تھے۔

**ولیم فریزر کا قتل و شمس الدین احمد خاں کو پھانسی کی سزا**

اس دوران میں ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس میں نواب شمس الدین احمد خاں ماخوذ ہوئے۔ ان کی ریاست سرکار انگریزی نے اپنے قبضے میں لے لی۔ ولیم فریزر ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں تقریباً ایک ماہ بعد گرفتار ہوئے اور انہیں اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی دی گئی۔ ان کی ذاتی جائداد فروخت ہو گئی۔ جس میں ہاتھی، گھوڑے، سانڈنیاں، گائیں، بیل، بیش بہا پارچات کے تھان، بگھیاں اور بہت سا دوسرا ساز و سامان تھا۔ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کی رقم نواب صاحب نے پرامیسری نوٹوں کی صورت میں حکومت انگلشیہ کے پاس جمع کر رکھی تھی جس میں سے ڈھائی لاکھ روپے پھانسی سے

دو یا تین روز قبل ایک وصیت نامہ کے رو سے انھوں نے اپنی بڑی بیگم کے مہر میں ان کے نام کر دیئے تھے۔ نواب صاحب کے ذمے مختلف ساہوکاروں کے قرضے بھی تھے۔ ان کی ریاست سے جن لوگوں کو پنشنیں ملتی تھیں۔ ان کے بقایے بھی واجب الادا تھے۔ نواب کی بیگم صاحبہ نے یہ درخواست پیش کر دی تھی کہ ریاست نواب کی صاحبزادیوں احمد النساء بیگم اور شمس النساء بیگم کے نام منتقل کی جائے۔ دلیل یہ دی کہ ریاست نواب احمد بخش خاں کو استمراراً ملی تھی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے کسی ذاتی فعل کی بنا پر ان کی اولاد کو آبائی ریاست سے محروم کرنا خلاف انصاف ہے۔

**غالب کی تازہ درخواست**

اس زمانے میں دہلی کا علاقہ آگرہ والہ آباد کی لفٹنٹ گورنری سے متعلق تھا۔ غالب نے بھی اس موقع پر اپنے پرانے مطالبات کے متعلق ایک مفصل درخواست مرتب کرکے لفٹنٹ گورنر آگرہ والہ آباد کے پاس بھیج دی۔ یہ درخواست دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے۔ اصل درخواست انگریزی زبان میں ہے۔ آخر میں غالب کی مہر ثبت ہے۔ اور مہر کے پاس غالب کے دستخط ہیں۔ یہ درخواست ۳۰ جون ۱۸۳۵ء کو یعنی نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری سے قریباً دو ماہ بعد بھیجی گئی تھی۔ اس میں غالب نے ۷ جون ۱۸۰۶ء والے شقہ پر جو غالب کے دعوے کے استناد کی بنا تھا مفصل بحث کی ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) کوئی پروانہ یا شقہ جاری نہیں ہو سکتا جس کا مسودہ ریکارڈ میں موجود نہ ہو۔ لہٰذا لارڈ لیک کا جو شقہ والی فیروزپور کی طرف سے پیش ہوا وہ جعلی ہے اس لئے کہ اس کا کوئی مسودہ سرکاری دفتر میں نہیں۔

(۲) اصل شقہ میں "گورنر جنرل" کے نام کے ساتھ "نواب" کا لفظ موجود نہیں۔ اور یہ عام سرکاری دستور کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ شقہ کسی ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے جو قواعد دفتر فارسی سے نابلد تھا۔

(۳) اس شقہ میں خواجہ حاجی کو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے اہل خاندان میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ خواجہ حاجی نہ اس خاندان کا فرد تھا اور نہ اس خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی[۵۹]۔

(۴) اصل شقہ میں پانچ ہزار روپیہ کا ذکر ہے لیکن یہ تصریح نہیں کی گئی کہ آیا یہ پانچ ہزار کی رقم پچیس ہزار کی اس رقم کے علاوہ ہوگی جو نواب احمد بخش خاں کے ذمے لگائی گئی تھی یا اسی رقم میں محسوب ہوگی۔

---

[۵۹] برلاس قبیلے کے ایک اور ترک جیون بیگ بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے ان کے بیٹے محمد اکبر بیگ کی شادی غالب کی

(۵) اگر پانچ ہزار کی رقم کو دس ہزار کی اس رقم کا حصہ قرار دیا جائے جو ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لیے مقرر ہوئی تھی تو سوال یہ ہے کہ لارڈ لیک ایک ماہ کے اندر اندر اس رقم میں سے نصف حصہ کیوں کر حذف کر سکتے تھے؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس باب میں گورنر جنرل سے منظوری نہیں لی گئی اور نہ اس کے متعلق کوئی خط و کتابت موجود ہے۔ لارڈ لیک گورنر جنرل کی منظورہ رقم میں بہ اختیار خود تخفیف کے حقدار نہ تھے۔

اس کے بعد غالب نے لکھا ہے کہ بے شک والی فیروز پور جھرکہ کے پیش کردہ شقہ کی مہر اور دستخطوں کی سر جان میلکم نے تصدیق کر دی۔ اور یہ ثابت ہو گیا کہ شقہ لارڈ لیک کی مہر اور دستخطوں سے جاری ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک کے عملہ کو رشوت دے کر وہ شقہ لکھوایا اور دوسرے بہت سے کاغذات میں رکھوا کر اس پر لارڈ لیک کے دستخط لے لیے۔[۱]

**دو لاکھ تین ہزار کا مطالبہ**

آخر میں غالب نے اپنا مطالبہ یہ پیش کیا کہ فیروز پور جھرکہ کی ریاست اواخر اپریل ۱۸۳۵ء تک نواب شمس الدین احمد خاں کے پاس رہی۔ لہٰذا مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر اپریل ۱۸۳۵ء تک سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے جو دو لاکھ تین ہزار روپے کی رقم بنتی ہے وہ اس رقم میں سے دلائی جائے جو نواب شمس الدین احمد خاں نے سرکار انگریزی میں جمع کرا رکھی ہے۔ اور خواجہ حاجی کو جو دو ہزار سالانہ ملتے رہے ہیں وہ اس پندرہ ہزار کی رقم میں محسوب ہوں جو نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش والے دس ہزار روپوں کے علاوہ

---

[۱] مولانا آزاد نے "آب حیات" میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے بیان کی بنا پر تحریر فرمایا ہے کہ سر جان میلکم نے غالب کے دعوے کے متعلق یہ لکھا تھا کہ "نواب احمد بخش خاں انگریزوں کا قدیمی دوست اور ذی امتیاز امیر تھا۔ اس پر اتہام ضد سے لگایا گیا ہے" میں نہیں کہہ سکتا کہ نواب صاحب کا یہ بیان صحیح ہے یا نہیں ہے لیکن غالب کے دعوے کی بنا محض یہ نہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نے عملہ کو رشوت دے کر شقہ پر دستخط لے لیے بلکہ حقیقی بنا یہ تھی کہ لارڈ لیک بطور خود حکومت کی کسی منظور کردہ تحریر کو منسوخ کرنے کے حقدار نہ تھے۔

والی فیروزپور کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس وقت تک نواب شمس الدین احمد خاں کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور ان کی ریاست اگرچہ سرکار انگریزی کی تحویل میں تھی لیکن ضبطی کے آخری احکام صادر نہیں ہوئے تھے لہٰذا غالب نے اپنی درخواست میں لکھا کہ اس باب میں تین صورتیں پیش آسکتی ہیں۔ اول یہ کہ ریاست نواب شمس الدین احمد خاں کو یا ان کے وارثوں کو واپس مل جائے۔ اس صورت میں پچیس ہزار سالانہ کی مقررہ رقم حکومت کو لینی چاہیے جس میں سے دس ہزار روپے سالانہ مجھے (غالب کو) ملیں اور پندرہ ہزار روپے سرکار انگریزی کے خزانے میں جمع ہوں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ریاست کو حکومت خود سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کا گزارہ مقرر کرے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے (غالب کو) ملنے چاہئیں اور پندرہ ہزار روپے حکومت خود رکھے تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت ریاست کو سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کو گزارہ بھی نہ دے اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے ملنے چاہئیں اور خواجہ حاجی کے وظیفہ کو ہر حال میں ختم کر دینا چاہیے۔

اس درخواست کے آخر میں غالب نے اپنے قلم سے پانچ ہزار والا وہ فارسی شقہ نقل کر دیا ہے جو والی فیروزپور جھرکہ کے جواب دعوے کی بنا رہا تھا۔

**مقدمہ از سر نو دہلی میں**

اس درخواست کے جواب میں لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ ٹی ٹی مٹکاف ریزیڈنٹ اس کے متعلق رپورٹ پیش کریں۔ غالب کو اس حکم کا علم ہوا تو انہوں نے پھر ۱۲ دسمبر ۱۸۳۵ء کو ایک درخواست لفٹنٹ گورنر کے پاس بھیجی جس میں لکھا کہ مٹکاف صاحب کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ عملے سے تمام مقدمات کا خلاصہ تیار کراتے ہیں اور ان خلاصوں کی بنا پر اپنی رائیں لکھتے ہیں۔ عملے والے رشوت کے عادی ہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میں انہیں خوش نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں اس باب میں محض خلاصہ مقدمہ پر تکیہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اصل کاغذات دیکھے جائیں۔

غالب کو جو پنشن مل رہی تھی اس میں سے بھی کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ لہٰذا انہوں نے تیسری درخواست پیش کر دی کہ اول نواب فیروزپور کا جو ڈھائی لاکھ روپیہ سرکار میں ہے اس میں دو لاکھ

تین ہزار روپیہ بسلسلہ بقایا دیا جائے اور تین ہزار روپے جو پنشن کے بقایا میں ہیں وہ ادا کئے جائیں جزوی بقائے کا معاملہ الگ چلتا رہا لیکن اصل دعوے کے جواب میں لفٹنٹ گورنر کا حکم آیا کہ مقدمہ سوپریم کونسل میں پیش ہو چکا ہے۔ اس لئے لفٹنٹ گورنر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کرسکتا سارے کاغذات گورنر جنرل کے پاس بھیجے جائیں۔

**گورنر جنرل کے پاس درخواست**

۲۳ مارچ ۱۸۳۶ء کو غالب نے لارڈ آکلینڈ کے پاس دو درخواستیں بھیجیں ان میں اپنے مقدمے کی روداد تحریر کردی۔ نیز لکھا کہ سکرٹری اور ریزیڈنٹ نے میرا مقدمہ خراب کردیا اور میرے ساتھ صریح بے انصافی کی۔ آپ خود انگریزی انصاف کے اصول پر میرے مقدمے کا فیصلہ کریں تمام ضروری کاغذات سرکاری دفتر میں موجود ہیں۔ اگر دہلی کے حکام میرے مطالبات کے سلسلے میں شبہات پیدا کریں تو میں انہیں دور کرسکتا ہوں انہی درخواستوں میں سے ایک پر غالب نے اپنے قلم سے حکومت کا وہ فارسی شقہ لفظاً لفظاً نقل کردیا تھا جو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری کے مطابق نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کے حکم پر مشتمل تھا۔ ان درخواستوں کی رسید کی استدعا بھی کی تھی۔

**بقیہ حالات مقدمہ**

اس کے بعد غالب کی تحریرات سے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوسکتے۔ وہ مولوی خلیل الدین خاں بہادر کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ لارڈ بنٹنک کے عہد میں سچائی بروئے کار نہ آئی۔ اور دشمن کامیاب ہوگیا۔ لارڈ آکلینڈ کے ہندوستان آنے تک زمانے کے حالات بدل گئے۔ والی فیروز پور کو پھانسی کی سزا مل گئی۔ ان کی ریاست سرکار انگریزی کے قبضے میں آگئی۔ میں نے سرکار انگریزی کو مدعا علیہ اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کو جج قرار دیا اور مقدمہ ولایت بھیجا۔ لارڈ آکلینڈ کا زمانہ ختم ہوگیا لندن سے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ لارڈ ایلن برا گورنر جنرل بنے تو میں نے اپنی مظلومیت کی داستان ان کے سامنے پیش کی۔ اور ایک انگریزی عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھ کر خواہش کی کہ اسے لندن بھیج دیا جائے۔ اس کا جواب چیف سکرٹری صاحب نے الہ آباد کے مقام سے بھیجا کہ عرضداشت دوسرے کاغذات کے ہمراہ ولایت بھیج دی جائے گی۔[۵]

---

[۵] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰ —

میر سید علی خاں عرف حضرت جی کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مدت تک فرماندہا کلکتہ کی انجمن میں پیچ و تاب کھاتا رہا اب دو سال سے میرا مقدمہ ولایت گیا ہوا ہے[51]۔

اُردو کے ایک مکتوب میں خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھتے ہیں :-

> ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اس قصیدے کے صلہ اور جائزہ کے واسطے جو بتوسط لارڈ ایلن برا سائل نے بھجوایا ہے۔ خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اُٹھایا (یعنی غدر برپا ہوگیا)

لارڈ ایلن برا ۱۵ جون ۱۸۴۴ء تک گورنر جنرل تھے قصیدہ اور عرضداشت بہرحال اس سے قبل بھیجے گئے ہوں گے لیکن بارہ برس کے بعد جواب ملا کہ سائل کو خطاب اور خلعت اور پنشن ملے گی۔ بہرحال ۱۸۴۴ء تک غالب پنشن کے مقدمے میں مبتلا تھے۔ اور غالباً اسی سلسلے میں ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ لکھا گیا تھا جس نے بعد ازاں ایک مستقل پنشن اور خطاب کی توقع پیدا کر دی لیکن ۱۸۵۷ء میں غدر برپا ہوگیا۔ اور غالب کی ساری توقعات ختم ہوگئیں۔ بلکہ تین برس تک وہ پنشن بھی بند رہی جسے غالب اپنے حق سے بہت کمتر سمجھ رہے تھے دہلی ریزیڈنسی کے پرانے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۶ء والی درخواست کے بعد غالب نے ۳ جنوری ۱۸۴۰ء کو پھر ایک درخواست لارڈ آکلینڈ کے پاس بھیجی تھی جس کا جواب ۳۱ جنوری ۱۸۴۰ء کو یہ آیا کہ سابقہ فیصلوں میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔ ولایت جو عرضداشت بھیجی گئی تھی وہ گورنر جنرل کے اس حکم کے بعد بھیجی ہوگی۔

### غالب کے انگریز ممدوح

غالب کے فارسی کلیات نظم میں متعدد انگریزوں کے مدحیہ قصائد و قطعات ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر اصحاب کی مدح اسی کم بخت پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں کی گئی تھی مثلاً مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کے قصیدے سے بعض اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں۔ وہ چیف سکرٹری تھے ا

---

[51] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۸۳۔

غالب کا مقدمہ ان کے پاس پیش ہوا تھا۔ ایک قطعہ ولیم میکناٹن کی تعریف میں ہے وہ سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۳۳ء تک گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکرٹری اور سنہ ۱۸۳۳ء سے سنہ ۱۸۳۷ء تک پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری تھے۔ جیمس ٹامسن جو بعد ازاں صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے اور جن کی تعریف میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ موجود ہے وہ سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۳۲ء تک گورنمنٹ کے سکرٹری اور سنہ ۱۸۴۲ء سے سنہ ۱۸۴۳ء تک فارن سکرٹری تھے۔ چارلس مٹکاف صاحب جن کی مدح میں ایک قصیدہ موجود ہے سنہ ۱۸۲۷ء سے سنہ ۱۸۳۴ء تک سوپریم کونسل کے ممبر تھے۔ پرنسپ صاحب جن کی مدح میں ایک قصیدہ موجود ہے سنہ ۱۸۳۴ء میں چیف سکرٹری تھے اور سنہ ۱۸۳۵ء سے سنہ ۱۸۴۳ء تک سوپریم کونسل کے ممبر رہے۔ ٹامسن ماڈک صاحب جن کی مدح میں ایک قصیدہ موجود ہے۔ گورنمنٹ کے سکرٹری تھے بعد ازاں ڈپٹی گورنر بنگال بنے۔ کالون صاحب جن کی مدح میں ایک قصیدہ موجود ہے۔ لارڈ آکلینڈ کے پرائیویٹ سکرٹری تھے بعد ازاں صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر بنے۔ ایڈمنسٹن صاحب جن کی مدح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ موجود ہے۔ گورنمنٹ کے فارن سکرٹری تھے۔ گورنر جنرلوں کی مدح کا سلسلہ بھی پنشن ہی کے ضمن میں شروع ہوا تھا مثلاً لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے میں پنشن کا مقدمہ پیش ہوا ان کی مدح میں یا ان سے پیشتر کے گورنر جنرلوں کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں صرف ایک قطعہ لارڈ بنٹنک کے ورود دہلی کے متعلق موجود ہے۔ اس کے بعد ہر گورنر جنرل کی مدح میں ایک ایک قصیدہ موجود ہے۔ لارڈ ایلن برا کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔

غالب نے حکومت ہند کے مختلف عہدیداروں اور گورنر جنرلوں کے قصیدوں یا قطعوں کے سلسلے میں پنشن کے مقدمہ کے متعلق یا اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی یہاں پیش کر دیا جائے:۔

**میکناٹن صاحب** | میکناٹن کے قطعہ میں لکھتے ہیں:۔

باچنیں بخشے کہ من دارم عجب دارم کہ من  خویشتن را مستحق لطف و احساں دیدہ ام
وہم مستولیست برمن وین چرا نبود کہ من  خود چہ نومیدی ز گردشہائے دوراں دیدہ ام

[illegible] Kaniz Fatima Rizvi (Nagpur)
B.Sc. III yr.
1951

یک دو پرسش دارم وازلعل گوہربار تو    آرزو در تشنہ کام پاسخ آں دیدہ ام

**سرچارلس مٹکاف**

چارلس مٹکاف کے قصیدے میں فرماتے ہیں:-

یاد باد آنکہ ازیں مرحلہ تا کلکتہ    کردہ ام طے بہ امید تو رہ دور و دراز
گر نہ اندیشہ بہ عدل تو قوی دل گشتے    ناقہ سعی من از راہ نہ گردیدے باز
نالہ زارِ من از شدت جورِ شرکاست    نہ ز دیوانگی و خیرگی و شوخی و آز
برُخِ من در رزقے کہ کشاید داور    حیف باشد کہ کند خصم بد اندیش فراز
ہفت سال است کہ با یک دگر آویختہ ایم    من و غاصب چو سر رشتہ شمع و دم گاز
او ز خونخوارگی خویش در اندازِ غضب    من ز بیچارگی خویش بہ آدابِ نیاز

……………………

خود تو دانی کہ ازیں مخمصہ رستن نتواں    جز بہ تائید توائے خسرو درویش نواز
بوکہ اندازہ درآید بہ درستی ز خلل    بوکہ اندیشہ گراید بہ حقیقت ز مجاز
طاقتم نیست بجز خاکِ کفِ پائے تو قسم    زانکہ غم حوصلہ سوز است و بلا زہرہ گداز
چوں چراغِ رہ بادم بہ گزرگاہ فنا    داورا زود تراز ہر چہ بہ حالم پرداز

**پانچ مطالبات**

”ہفت سال“ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ غالباً ۱۸۳۴ء میں لکھا گیا تھا“ ہیں اپنے مطالبات کے متعلق لکھتے ہیں ؎

پنج مطلب ز توام ہست و بہ صد گونہ امید    خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اوّل ایں است کہ در باب معاشے کہ مراست    کنی اندیشۂ محکم بہ طریق ایجاز
ہر چہ در دفترِ سرکار بود نقش پذیر    ہم بہ اندازۂ آں نقش شود مایہ ساز
دوم آں کز اثرِ عدلِ توائے سنجر عہد    غیر با بندہ دریں وجہ نباشد انباز
سوم آں است کہ دیگر نکنم دستِ طلب    پیش فرماندہ میوات بدریوزہ دراز
ہم بہ گنجینۂ سرکار رسانے خواہم    دادہ انصاف بدیں یافتگی اذن جواز

چارم آن است کہ باقی زر چندیں سالہ    بے نزاع و جدل وجہ بہ من گردد باز
پنجم آں کز پس ایں فتح کہ بنماید روے    دہی ام مژدۂ اکرام و نوید اعزاز
بخشی ام تازہ خطابے و براں افزائی    خلعتے درخور ایں دولت جاوید طراز

غالب کی قادر الکلامی کے کمالات کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ وہ نہایت خشک مطالب کو بے تکلفی کے ساتھ شعروں میں لکھتے جاتے ہیں اور شعریت میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔ اوپر کے اشعار میں ملاحظہ فرمایئے کہ اپنے پانچ مطالبات کس خوبی سے نظم کئے ہیں کہ اول مجھے پنشن سرکار کی منظوری کے مطابق ملے۔ دوم میری پنشن دوسرے متعلقین سے علیحدہ کردی جائے۔ سوم مجھے والی فیروز پور جھرکہ کے روبرو دست طلب دراز نہ کرنا پڑے بلکہ پنشن سرکاری خزانہ سے متعلق ہوجائے۔ چہارم جتنا روپیہ اب تک وصول نہیں ہوا وہ مل جائے پنجم مجھے نیا خطاب اور خلعت دیا جائے۔

مقدمہ ولایت جا رہا ہے

جس زمانے میں مقدمہ ولایت جا رہا تھا انہوں نے حکومت ہند کے کسی رکن کو لکھا ہے ۵

بہ صدر مے رود ایں بار پرسش بسم اللہ    ہمیں مراد من است جز ایں مرادم نیست
تو کردی و تو کنی کارم اعتقاد ایں است    بہ کارسازی بخت خود اعتقادم نیست
رسیدمے و بپائے تو سودمے سر عجز    بضاعت سفر و دستگاہ زادم نیست
مفید مطلب من ہر کتابتے کہ بود    تو جمع کن کہ بسازانچہ نہ یادم نیست
اُمید لطف تو دل مے دہد بدیں شادم    وگرنہ تاب صبوری ازیں زیادم نیست
بہ ذوق قرب زمان مراد بے تابم    وگرنہ شورش تعجیل در نہادم نیست
نہ نیم روز بہ لندن رساندمے زورق    ولے چہ چارہ کہ فرماں بر آب و بادم نیست

لارڈ آکلینڈ

لارڈ آکلینڈ کے قصیدے میں لکھتے ہیں ۵

از تو رسیدم بہ نوش ورنہ لبم سالہا    سر کہ ز صہبا چشید زہر شکر گرفت
از تو توانا شدم ورنہ مرا روزہا    چارہ ز بے مایگی صورت ابتر گرفت

خواست دل ار در خیالِ زخمِ جگر دوختن　　از پئے آں بخیہ تار از تنِ لاغر گرفت

……

ہم زدم گرم خویش خشک نمودم رقم　　صد رہ اگر نالہ ام از مژہ تر گرفت
با تو چہ گویم ز جور کایزد از انصاف تو　　خانۂ ظالم بہ سوخت ستم برگرفت

آخری شعر میں نواب شمس الدین خاں کی پھانسی اور ریاست فیروزپور جھرکہ کی ضبطی کی ط

اشارہ ہے۔

لارڈ ایلن برا

لارڈ ایلن برا کے قصیدے میں فرماتے ہیں ؎

بہ گفتارم توانگر گر بہ سیم و زر تہیدستم　　زمین کلبۂ من شد گلستاں بعد ویرانی
بہ رسمِ نکتہ سنجاں در سخن نامم بود غالب　　بدیں نام از ازل آوردہ ام طغرائے سبحانی
مرا دردیست اندر دل کہ جانفرسائی آنرا　　ندانم چارہ اما ایں قدر دانم کہ مے دانی

……

کرمے کرد گر لارڈ آکلینڈ از رہ غمخواری　　تو نیز از راہ غمخواری کرم کن کز کریمانی
ازاں در نامۂ مدح تو آرم بر زباں نامش　　کہ با من داشت گوناگوں نوازشہائے پنہانی
گر او در رشتۂ مدح سخنور گوہر آمودے　　ترا باید کہ بر فرقِ سخنور گوہر افشانی

دوسرے قصیدے میں فرماتے ہیں ؎

رفت آں غم از نہاد و بدیں شاد زیستن　　دانم کہ مردہ زندہ شد اندر زبانِ تو
ورا چرا اینکہ کوشش من رائگاں نہ رفت　　خواہم ز حق حیاتِ ابد در آنگانِ تو

وکٹوریہ

وکٹوریہ کے قصیدے میں غالب نے یہ سلسلہ دعا لکھا تھا۔

آں بادہ دور نیست کہ گفتار من مرا　　سیمائے عزّ و جاہ بریں آستاں دہد
آں بادہ زود باد کہ کلکِ دبیرِ خاص　　آوازۂ نوازشِ من در جہاں دہد
آں بادہ در خور است کہ فرماندہی کنم　　بر یک دو دہ کہ گنگ تہ ہندوستاں دہد

آں بادہ خوش بود کہ شہنشاہ بجرعہ  انجام خواہش اسد اللہ خاں دہد

میرا خیال ہے کہ غالب کی اقتصادی و مالی حالت کی تخریب میں اس پنشن کے مقدمہ کا بڑا حصہ تھا۔ انہوں نے اس پر کافی روپیہ صرف کیا۔ اور مدت مدید تک انہیں یہ توقع لگی رہی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ اس بنا پر وہ بلا تکلف قرض لیتے رہے اور انہیں قرض ملتا رہا، ایک وقت میں انہیں یہ اُمید ہو گئی تھی کہ وہ لاکھ تین ہزار روپیہ یک مشت مل جائے گا اور اتنی بڑی رقم کے یک مشت مل جانے کی اُمید پر غالب کو قرض کا بڑے سے بڑا بوجھ اُٹھا لینے میں بھی کیا تامل ہو سکتا تھا اور سود خوار مہاجنوں کے لیے اچھی موٹی مگر عاقبت نااندیش اسامی کو زیادہ سے زیادہ قرض دینے میں تذبذب کی کون سی وجہ تھی۔ بہ ہر حال غالب ۱۸۲۷ء سے لے کر ۱۸۴۴ء تک اس قضیہ میں اُلجھے رہے۔ اور اسی ضمن میں نئی پنشن، نئے خطاب اور نئے اعزاز کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۵۷ء تک خدا جانے کشائش و فراغت بال کے کیسے کیسے خیالی منظر ان کے سامنے پیش کرتی رہی۔ یہ دلخوش کن مناظر اس وقت سراب ثابت ہوئے جب سنین حیات کی ساٹھ مسافتیں طے ہو چکی تھیں اور شہر خموشاں کا سواد بالکل سامنے آ گیا تھا۔

◆

# ساتواں باب

## ابتلاء اسیری

چرخ یک مرد گرانمایہ بہ زنداں خواہد
یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۷ء) میں غالب پر اسیری کی ابتلا نازل ہوئی مجھے غالب کی شا
شدہ تصانیف میں اس واقعہ کے متعلق کوئی مواد نہیں ملا۔ خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ غالب نے
یک فارسی خط میں اس واقعہ کو اختصاراً لکھا ہے۔ میری نظر سے یہ خط نہیں گزرا۔ خواجہ مرحوم نے
س خط کا جو اقتباس "یادگار" میں دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا
ست شوق تھا۔ چوسر جب کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے۔ کوتوال دشمن تھا۔ اس نے
ماربازی کا مقدمہ بنا دیا۔ مجسٹریٹ غالب کی حیثیت، مرتبہ اور ذاتی حالات سے ناواقف تھا۔ اس نے
ہ ماہ کی قید کی سزا دی۔ سیشن ججی میں اپیل کیا گیا۔ جج اگرچہ غالب کا دوست تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں
ے تکلف ملتا تھا لیکن اس نے بھی تغافل اختیار کیا۔ اور سزائے قید بحال رکھی۔ صدر میں اپیل کیا گیا
ن وہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی تین ماہ کے انقضا کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کی رپورٹ
در میں بھیج دی۔ اور غالب تین ماہ کے بعد رہا ہو گئے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ قید میں ان کی حیثیت
ں نظربند کی تھی۔ کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست ان سے
کلف ملتے تھے لیکن اس زمانے کے حالات اور نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ واقعہ غالب
نظروں میں سخت ذلت خیز تھا اور اسے انہوں نے شدید محسوس کیا۔ خواجہ حالی کے بیان کے
بق وہ خود فرماتے ہیں:۔

> اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں مصر ہے، ایران ہے بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں۔[۵۱]

اُردوئے معلّٰی میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جس پہ ۱۰ر دسمبر ۱۸۵۲ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں :-

> سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔

شاید ان الفاظ میں بھی قید ہی کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

**دہلی میں قمار بازی کی وبا** خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے "احسن الاخبار" کے ان فارسی مضامین کا ترجمہ شائع کیا ہے جو دہلی یا دربارِ شاہی کے حالات پر مشتمل تھے۔ یہ کتاب نومبر ۱۸۴۴ء سے لے کر مارچ ۱۸۴۸ء تک حالاتِ دہلی کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حکام کی توجہ قمار بازی کے انسداد کی طرف بطورِ خاص مبذول تھی، شاید اس لئے کہ یہ وبا بہت پھیل گئی تھی۔ مثلاً ۲۰ر جون ۱۸۴۵ء کے حالات میں مرقوم ہے :-

> کوتوالِ شہر نے سولہ آدمیوں کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا تو نو آدمیوں کو چھ مہینے کی قید اور پچاس روپیہ جرمانہ اور پانچ آدمیوں کو تین مہینے کی قید و پچیس روپیہ جرمانہ اور دو آدمیوں کو ایک مہینے کی قید اور چار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر سڑکوں کی تعمیر و درستی کا کام لیا جائے۔[۵۲]

---

[۵۱] "یادگارِ غالب" صفحہ ۲۷ و ۲۸ ۔
[۵۲] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۶ ۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قمار بازی کا برائے نام ارتکاب بھی حکام کی نظروں میں بہت سنگین جرم بن گیا ہوگا۔

**غالب کے خلاف مقدمہ**

اس کتاب میں غالب کی گرفتاری اور مقدمہ کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کے حالات میں آیا ہے تحریر یہ ظاہر ہے:-

> مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا معظم الدولہ بہادر (ریزیڈنٹ) کے نام سفارشی چٹھی (بہادر شاہ کی طرف سے) لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر (ریزیڈنٹ) نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔[۵]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کو یا اس سے چند روز قبل گرفتار ہوئے بہادر شاہ بادشاہ اور ان کے درباریوں کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ گرفتاری محض حاسدوں کی فتنہ پردازی سے عمل میں آئی ہے۔ اور غالب قمار بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ریزیڈنٹ کو سفارشی چٹھی لکھی گئی لیکن ریزیڈنٹ نے جواب میں یہ لکھا کہ مقدمہ عدالت میں جا چکا ہے۔ اور اس حالت میں قانون قبول سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔

۲ رجولائی ۱۸۴۷ء کے حالات میں پھر غالب کے اس مقدمے کا ذکر آیا ہے۔ تحریر یہ ظاہر ہے:-

> مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں بسوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور

---

[۵] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۷۱۔

> مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے۔ اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے[۵]۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کو چھ ماہ قید بامشقت کے علاوہ دو سو روپے جرمانے کی سزا بھی دی گئی تھی اور بہ صورت عدم ادائے جرمانہ مزید چھ ماہ کی قید کا حکم سنایا گیا تھا۔ البتہ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ وہ پچاس روپے کی رقم دے کر مشقت معاف کرا سکتے ہیں

اقتباس کا آخری حصہ "احسن الاخبار" کے ایڈیٹر یا اس کے نامہ نگار کا تبصرہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے:

(۱) غالب کی صحت اس زمانے میں اچھی نہ تھی۔ اور وہ پرہیزی غذا کھاتے تھے۔

(۲) عام خیال تھا کہ سزا بہت سخت دی گئی ہے۔

(۳) وہ بڑے باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے جن کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

(۴) اندیشہ تھا کہ وہ اسیری کی تاب نہ لاسکیں گے۔

میرا خیال ہے کہ مشقت پچاس روپے دے کر معاف کرالی ہوگی اور دو سو روپیہ جرمانہ بھی یقیناً ادا کردیا ہوگا۔

**غالب کا حبسیہ**

قید کی حالت میں غالب نے چوراسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند لکھا تھا جو ان کی بہترین نظموں میں سے ہے لیکن غالب کے عزیزوں اور دوستوں نے اسے کلیات نظم میں شامل نہ ہونے دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ اس نظم کی اشاعت سے غالب کی قید کا واقعہ ہمیشہ کے لئے منظر عام پر آجائے گا۔ انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ شاعر کی زندگی محض شعر ہوتی ہے۔ دنیا کو اس کے حالات کی اچھائی یا برائی سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ محض اس چیز سے واسطہ ہوتا ہے کہ مختلف

---

[۵] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۷۴ او ۱۷۵۔

واقعات نے اس کے سازِ سخن میں سے کون کون سے ترانے پیدا کئے۔ غالب کے دوستوں اور عزیزوں کی غلط اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے قید کے واقعہ کو چھپانے کے اہتمام میں غالب کی ایک بہترین نظم کو ضائع کرنا پسند کیا۔ کلیات نظم فارسی کے چھپ جانے کے بعد غالب نے "سبد چین" کے نام سے اپنے بعد کے کلام کا جو مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا اس میں یہ ترکیب بند بھی شامل کر دیا تھا افسوس کہ "سبد چین" والا کلام کلیات کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل نہ ہو سکا اور اب "سبد چین" بے حد کمیاب ہے۔ میں اس ترکیب بند کو تماماً درج کرتا ہوں شاید اس طرح یہ زیادہ محفوظ ہو جائے اور اربابِ ذوق اس سے مستفید ہو سکیں۔

**قید کی حالت** خواجہ حالی مرحوم کا جو بیان اوپر درج ہو چکا ہے اس میں صاف مرقوم ہے کہ قید میں غالب کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں، دوست ان سے بلا تکلف ملتے تھے۔ عام قرائن بھی اسی بیان کے مؤید ہیں لیکن خود غالب نے "حبسیہ" میں لکھا ہے ؎

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

میری رائے میں یہ محض سخن گستری ہے۔ اظہارِ واقعہ نہیں ہے۔

غالب کے غیر مطبوعہ اردو کلام کے سلسلے میں مختلف اصحاب نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جناب نظامی بدایونی اس شعر کی شانِ نزول کے باب میں فرماتے ہیں کہ غالب اتفاقاً قید ہو گئے تھے۔ وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ ان کو چن رہے تھے۔ کہ ایک رئیس نے جا کر پرسشِ مزاج کی غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔[1]

---

[1] دیوان غالب مع شرح نظامی طبع ششم صفحہ ۲۶۸ ۔

مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ یہ شعر غالبؔ کا ہے یا نہیں لیکن اس کی شان نزول کو درست تسلیم کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ "احسن الاخبار" کے بیان سے ظاہر ہے کہ پچاس روپے ادا کرنے پر مشقت معاف ہو جانے کا موقع حاصل تھا۔ اور یہ امر قرین قیاس نہیں کہ غالبؔ نے یا ان کے دوستوں نے فوراً پچاس روپے ادا نہ کر دیئے ہوں اور مشقت معاف نہ کرا لی ہو معہذا غالب بہت بڑے رئیس تھے۔ حتیٰ کہ خود پادشاہ وقت نے ان کی رہائی کی سفارش کی تھی بظاہر یہ صورت قابل یقین نہیں کہ ان کی سزا کی سختی اس حد تک پہنچ گئی ہو گی کہ انہیں اپنے کپڑوں میں سے جوئیں چننے کی ضرورت پیش آئی۔

"حبسیہ" سے ظاہر ہے کہ اس ابتلا میں نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ نے اعانت، غمخواری اور دوست نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے غالبؔ نے نواب صاحب مرحوم کا خاص طور پر ذکر کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ ایسا غمخوار دوست عزاداری کے لیے موجود ہو تو مرنے کا بھی غم نہیں۔ نیز عید الفطر قید میں گزاری تھی اور اگر چھ ماہ کی مدت جیل میں پوری ہوتی تو عید اضحیٰ بھی قید ہی میں آتی۔

آخر میں "حبسیہ" پر اس باب کو ختم کرتا ہوں ؎

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خونناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہاں میکدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعوی اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید، بہ شعر آویزم
روزکے چند رسن تابیِ آواز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم
چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم
تا چہ افسوں بہ خود از ہیبتِ صیاد دہم
تا چہ خوں در جگر از حسرتِ پرواز کنم
یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا
آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
ہائے ناسازی طالع کہ بہ من گردد باز
با خرد شکوہ گر از طالعِ ناساز کنم
اہلِ زنداں بہ سر و چشم خودم جا دادند
تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
ہلہ دزدانِ گرفتار وفا نیست بہ شہر
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

من گرفتارم و ایں دائرہ دوزخ تن تن　　در سخن پیروی شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقع گرفتاری جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوش دلی اُمیدم نیست

شمع ہر چند بہ ہر زاویہ آساں سوزد　　خوشتر آں است کہ بر نطع در ایواں سوزد
عود من ہرزہ مسوزید و گر سوختنی است　　بگزارید کہ در مجمر سلطاں سوزد
خانہ ام ز آتش بیداد عدو سوخت دریغ　　سوختن داشت ز شمعے کہ شبستاں سوزد
منم آں خستہ کہ گر زخم جگر بنمایم　　برہمن از مہرِ دلِ گبر و مسلماں سوزد
منم آں قیس کہ گر سوئے من آید لیلےٰ　　محمل از شعلۂ آوازِ حدی خواں سوزد
تا چسانم گزرد روز بہ شبہا دریاب　　از چراغے کہ عسس بر درِ زنداں سوزد
تنم از بند در انبوہ رقیباں لرزد　　دلم از درد بر اندوہ اسیراں سوزد
از نم دیدہ من فتنۂ طوفاں خیزد　　از تفِ نالۂ من جوہر کیواں سوزد
آہ زیں خانہ کہ روشن نشود در شب تار　　جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد
آہ زیں خانہ کہ در روے نتواں یافت ہوا　　جز سمومے کہ خس و خار بیاباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بہ چراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

پاسباناں ہمہ آئید کہ من مے آیم　　درِ زنداں بکشائید کہ من مے آیم
ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے　　خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہ شما مے ترسم　　راہم از دور نمائید کہ من مے آیم
رہرو جادۂ تسلیم و درشتی مکنید　　سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم
خستہ تن در رہ و تعذیب ضرورست اینجا　　نمک آرید و بسائید کہ من مے آیم
عارض خاک بہ پاشیدنِ خوں تازہ کنید　　رونق خانہ فزائید کہ من مے آیم

چوں من آیم بہ شما شکوہ گردوں رواست		زیں سپس از نخائید کہ من مے آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید		بخت خود را بہ ستائید کہ من مے آیم
تا بہ دروازۂ زنداں پئے آوردن من		قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است		بہرہ از من بہ ربائید کہ من مے آیم
بخود از شوق بہ بالید کہ خود باز روید		بہ من از مہر گرائید کہ من مے آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامی من
غیر نشگفت خورد گر غم ناکامی من

آنچہ فرو دست ہم امروز در آمد گوئی		آفتاب از جہت قبلہ بر آمد گوئی
دل ہر دستے کہ مرا بود فرو ماند ز کار		شب و روزے کہ مرا بود بسر آمد گوئی
سرگزشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی		سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی
بہرۂ اہل جہاں چوں ز جہاں درد و غم است		بہرۂ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی
خستن و بستن من حد عسس نیست بہ رو		بر من ایں ہا ز قضا و قدر آمد گوئی
ہنرم را تواں کرد بہ جستن ضائع		خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
غم دل داشتم اینک غم جانم دادند		زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی
چرخ یک مرد گرانمایہ بہ زنداں خواہد		یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی
مژہ امشب ز کجا ایں ہمہ خونناب آورد		ایں چنیں گرم ز زخم جگر آمد گوئی
خود[لہ] چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواری من		رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے		پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بہ میرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

---

[لہ] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے قید کے زمانے میں دوستی کا حق بہ طریقِ احسن ادا کیا تھا۔ یہ تینوں شعر نواب صاحب کی سچی اور مخلصانہ ہمدردی کا وثیقہ ہیں۔

خواجہ دانم کہ بسے روزنہ ماند دربند     لیک دانی کہ شب و روز نمانم دربند
نہ پسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم     جانب دریچہ حسرت نگرانم دربند
خستہ ام خستہ من و دعوی تمکیں حاشا     بند سخت است تپیدن نتوانم دربند
شادم از بند کہ از بند معاش آزادم     از کف شحنہ رسد جامہ و نانم دربند
آمہ و جامہ بیارید و سجل بنویسید     خواب از بخت ہمے وام ستانم دربند
یارب ایں گوہر معنی کہ فشانم ز کجاست     بند در تن بود و نیست زبانم دربند
ہر کس از بند گراں نالد و ناکس گنہم     نالم از خویش کہ بر خویش گرانم دربند
خوے خوش ہر مصیبت زدہ رنج دگر است     رنجہ از دیدن رنج دگرانم دربند
رفتہ در بارۂ من حکم کہ با درد و دریغ     شش مہ از عمر گرامی گذرانم دربند
اگر این است خود آن است کہ عید اضحیٰ     گذرد نیز چو عید رمضانم دربند
مدت قید اگر در نظرم ہست چرا     خون دل از مژہ بے صرفہ چکانم دربند

نیستم طفل کہ در بند رہائی باشم
ہم ز ذوق است کہ در سلسلہ خائی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود     چہ کنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود
زیں دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی نہ ظہور     گلہ نیست کہ از بخت دو رنگم نبود
رازدا نا غم رسوائی جاوید بلاست     بہر آزار غم از قید فرنگم نبود
لرزم از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است     ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نبود
زیں دو سرہنگ کہ پویند ہمے ترسم     نیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود
منم آئینہ و ایں حادثہ زنگ است ولے     تاب بدنامی آلائش زنگم نبود
آہ ازاں دم کہ سرا یند ز زنداں آمد     اندریں دائرہ گیسم کہ درنگم نبود
ہمدماں واردم امید رہائی دربند     وا من ار بعد رہائی نہ سنگم نبود

جورِ اعداه جدا ز دل به رهائی پیکن		طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود
حاش لله که درین سلسله باشم خوشنود		چه کنم چوں سر این رشته به چنگم نبود
به صریرِ قلمِ خویش بود مستی من
اندریں بند گراں بین و سبک دستی من

همدماں دردِ دلم از دیده نهانید همه		غالبِ غم زده را روح و روانید همه
لله الحمد که در عیش و نشاطید همه		لله الشکر که با شوکت و شانید همه
هم در آئینِ نظر سحر طرازید همه		هم در اقلیمِ سخن شاه نشانید همه
چشمِ بد دور که فرخنده لقائید همه		شاد باشید که فرخ گهرانید همه
سرو بینا و وفا دیده و نورید همه		زنده مانید صفا قالب و جانید همه
من نگوں خفته و بینم همه بینید همه		من جگر خسته و دانم همه دانید همه
درمیاں ضابطهٔ مهر و وفائے بود است		من برینم که هر آئینه بر آئید همه
روزے از مهر نگفتید فلانے چوں است		بارے از لطف بگوئید چه سانید همه
گر نباشم به جهاں خار و خسے کم گیرید		اے که سرو و سمن باغِ جهانید همه
چارهٔ گر نتواں کرد دعائے کافی است		دل اگر نیست خداوند زبانید همه
هفت بند است که در بند رقم ساخته ام		بنویسید و به بینید و بخوانید همه
آں نه باشم که به هر بزم ز من یاد آرید
دارم امید که در بزمِ سخن یاد آرید

مہناز قمر لیتی

ل ریحانہ دی

# آٹھواں باب

## مالی حالات، مدح گوئی اور صلہ یابی

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

غالبؔ کی زندگی مالی مشکلات کے جس ہجوم اور پریشان حالی و درماندگی کے جس الم زار میں گزری اس کا صحیح نقشہ اوپر کا شعر پیش کر رہا ہے۔ اسی مضمون کو وہ اُردو میں یوں لکھتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ بڑے خوشحال اور دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے تھے باپ اور چچا کا سایہ کمسنی ہی میں ان کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ وہ فطرتاً لاأبالی تھے نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت کی سیہ مستیوں اور فارغ البالی کی سرخوشیوں اور بے پروائیوں نے انہیں حد درجہ مسرف اور غیر محتاط بنا دیا جب دولت و ثروت کے جمع شدہ ذخائر ختم ہو گئے تو وہ اپنی روش کو بدلنے کے بجائے اپنے بڑھتے ہوئے مصارف کے لئے بلا تکلف قرض لینے لگے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اسراف ان کی فطرت کا جزو بن گیا۔ شراب کی عادت ایسی پڑی کہ آخری دم تک نہ چھوٹی۔ ان کی ذاتی آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے لیکن جمع شدہ دولت نے ابتدا میں ان کی قلت کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ دی جب وہ تنگ ہوئے تو پنشن پوری نہ ملنے کی جانب خیال منتقل ہوا۔ اور انہوں نے مقدمہ کا سلسلہ جاری کیا جو ۱۸۲۷ء سے شروع ہو کر غالباً ۱۸۴۴ء تک جاری رہا اس کے دوران میں انہیں مسلسل یہ اُمید لگی رہی کہ روپیہ جلد مل جائے گا۔ اسی ضمن میں حکو انگلشیہ کی طرف سے نئے صلے کی توقع پیدا ہو گئی جس میں وہ غدر تک اُلجھے رہے۔ بہر حال مختلف اوقات

کی بنا پر وہ قرض لیتے رہے۔ اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ سود میں ضائع کرتے رہے دوسری مصیبت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے روزگار میں کشائش کے جتنے وسیلے سامنے آتے رہے یا تو اُن میں ناکامی ہوئی یا اگر کامیابی ہوئی تو وہ وسیلے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اس لئے اپنی زندگی کے متعلق غالب کے نظریہ میں روشنی اور اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی تھی۔

**یاس کی تیرگی** صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں انہوں نے اپنے مختلف وسائل آمد کا حال لکھا ہے۔ خاندانی پنشن اور اس کے مقدمے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

> بعد ایک زمانے کے پادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اس کے ولیعہد نے چار سو روپے سال، ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں۔ مگر سلطنت جاتی رہی۔ اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے یا متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا۔ یہ دونوں امر واقع نہ ہوتے تو کوشش اس کی رائیگاں جائے گی۔ اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا۔ اور احیاناً اگر اس نے کچھ سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔

**غالب کی کم نصیبی** غالب کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وظیفہ یا فتوح کے لئے ہر اس مقام پر کوشش کی جہاں سے انہیں کامیابی کی کچھ بھی اُمید دلائی گئی۔ انہوں نے ایسے لوگوں کے قصیدے لکھے۔ جو اگرچہ والیان ریاست تھے یا بڑے بڑے سرکاری عہدے دار تھے لیکن غالب جیسے نادر روزگار شاعر کے فکر و تخیل کے لئے صحیح اور موزوں موضوع نہ تھے۔ ان قصیدوں کے صحیح مخاطب سنجر، محمود، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور خانخاناں جیسے لوگ تھے لیکن سخنوروں کی پایہ شناسی اور قدردانی کا یہ زریں دور غالب سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔ خانخاناں اور ذوالفقار خاں کی جگہ آکلینڈ، ایلن برا، ہارڈنگ اور کیننگ نے لے لی تھی۔ اور غالب کو اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لئے انہی کا رخ کرنا پڑا۔

لیکن ان فرومایہ چشموں سے ان کی پیاس کیا بجھ سکتی تھی۔ وہ زندگی میں جس سکون اور ضروریات سے جس فراغ کے طلبگار تھے۔ وہ میسر نہ آیا۔ ان کے رہوارِ فکر نے اپنے عہد کے تقریباً ہر قابلِ ذکر میدان میں مدت العمر تک و دو کی لیکن ان کا مقصد پورا نہ ہوا۔ انہوں نے اپنے زمانے کی قدر شناسی پایہ نادانی اور مرتبہ نافہمی کے متعلق جو درد انگیز خیالات جابجا ظاہر کئے ہیں۔ ان کو محض شاعرانہ تخیل قرار نہیں دینا چاہئے بلکہ وہ واقعات ہیں حقایق ہیں۔ روزگار کی ستم پیشگی اور جفا آرائی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ کہ جو شخص قصاید میں عرفی کا ہم پایہ اور غزل میں نظیری کا ہم پایہ تھا۔ جو مثنوی میں فارسی کے بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکر کھاتا تھا۔ جو رباعیات میں عمر خیام اور سحابی استرآبادی سے کم نہ تھا۔ اور نثر میں ابوالفضل اور ظہوری سے بہتر تھا۔ اسے بہتر برس کی عمر میں ایک خانخاناں اور ایک اکبر بھی نہ ملا۔ مغلیہ سلطنت نے ذوق کو "خاقانی ہند" بنا دیا۔ اور ان کے لئے ایک معقول تنخواہ اور جاگیر مقرر کر دی لیکن غالب کو وہ سلطنت صرف پچاس روپے ماہوار دے سکی اور وہ بھی تاریخ نگاری کی تنخواہ تھی جس سے زیادہ قیمت آج غالب کا ایک غیر مطبوعہ اردو خط پا سکتا ہے۔ اور جس سے چار گنا قیمت پہ ہمارے زمانے میں غالب کے اُردو دیوان کے ایک مصور ایڈیشن کا ایک ایک نسخہ بک چکا ہے۔

مشہور ہے کہ عرفی نے خانخاناں کی مدح میں ترسٹھ شعر کا قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را
وے ساختہ آرایش ہم فضل و کرم را

دریا دل اور قدر شناس خانخاناں نے ترسٹھ ہزار روپیہ دیا۔ غالب نے اسی زمین میں وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں اُنہتر شعر کا قصیدہ لکھا۔ جو عرفی کے قصیدے سے کسی حالت میں بھی کم پایہ نہیں لیکن غالب کو ٹونک سے غالباً اُنہتر سو روپے بھی نہ ملے مشہور ہے کہ ناصر علی سرہندی نے ذوالفقار خاں کی خدمت میں سات شعر کی ایک مدحیہ غزل پیش کی تھی جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار
نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

ذوالفقار خاں نے صرف مطلع سن کر ناصر علی کو روک دیا اور کہا کہ مجھ میں مزید اشعار کا صلہ دینے کی ہمت نہیں۔ ناصر علی کو جو کچھ ملا وہیں فقراء میں بانٹ دیا اور اپنی غزل کا مقطع پڑھ کر چلا آیا ؎

ناصر علی ترا ز تو خواہد مراد و بس
اے ابرِ فیض بر ہمہ عالم گہر ببار

غالب نے اس زمین میں راجہ شیو دھیان سنگھ والی الور کی مدح میں چالیس شعر کا قصیدہ لکھا۔ الور کی ریاست کی خدمت میں غالب کے والد نے اپنی جان قربان کی تھی۔ اور راجہ شیو دھیان سنگھ غالب کے قدردان بھی تھے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ الور سے غالب کو اس کا بیسواں حصہ بھی ملا جتنا ذوالفقار خاں نے ایک شعر کے صلے میں ناصر علی کو دے ڈالا تھا۔ ناصر علی صلہ لے کر فقراء میں بانٹتے ہوئے گھر چلا آیا لیکن غالب کی زبان کو اس شکوے سے فراغ نصیب نہ ہوا کہ ؎

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد    بہ ہر بار زر پیل بارم دہد
کہ تا پیل از انبار انگیزمے    زرش بر گدایاں فرو ریزمے

بہ ہر حال غالب کی مالی مشکلات کی داستان بڑی ہی درد انگیز ہے۔ اور غالب جیسے نازک دل اور نازک دماغ شاعر پر ان مشکلات میں جو قیامت گزرتی ہوگی اس کا صحیح اندازہ آج کون کر سکتا ہے۔

**دہلی کی ابتدائی زندگی** غالب جب دلّی میں آتے ہیں تو اس وقت ان کی مالی حالت غالباً اچھی تھی۔ خاندانی پنشن کے علاوہ بھی ادھر ادھر سے روپیہ مل جاتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی قرض لیتے تھے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

بھائی (امین الدین احمد خاں والی لوہارو) سے کہنا اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی لوٹی۔ ہر ایک کے پاس

تمسک مُہری موجود۔ شہد لگاؤ چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے (غالباً خان سے مراد نواب احمد بخش خاں ہیں) کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔

**تنگ دستی اور مالی مصائب کو پیش کرنے کے نئے نئے اسلوب**

اپنی تنگ دستی اور ہجوم آلام و مصائب کو نئے نئے اسلوبوں اور نئے نئے عنوانوں سے بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی نہیں تھکتے۔ گویا یہ موضوع ان کے فکر و تخیل پر بہ طور خاص حادی تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا مردود مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو لوگوں نے جنت آرامگاہ اور عرش نشیمن خطاب دیئے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضخواہ کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضخواہ بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا بے عزت۔ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔

**خاندانی پنشن**

غالب کی جو آمدنی ابتدا سے آخر تک مستقل طور پر قایم رہی وہ فیروز پور جھرکہ والی خاندانی پنشن تھی جو ریاست فیروز پور جھرکہ کی ضبطی کے بعد سرکار انگریزی کے خزانے سے متعلق ہو گئی تھی

اس کی مقدار سات سو پچاس روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تھی۔ یہ پنشن مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر مئی ۱۸۶۰ء تک بند رہی تھی۔ اس لئے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر شروع ہو گیا تھا۔ اور دہلی میں انگریزی حکومت کا کوئی ادارہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ستمبر میں غدر کا خاتمہ ہو گیا۔ تو غالب پر باغیوں کی اعانت اور چاپلوسی کا الزام عاید ہو گیا تھا۔ تین برس کے بعد وہ اس الزام سے مبرا ثابت ہوئے تو جمع شدہ روپیہ یک مشت مل گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب کی وفات کے بعد ان کی بیگم صاحبہ کو بھی اس پنشن میں سے گزارے کے لئے کچھ ملتا رہا یا نہیں۔

**قلعہ کی ملازمت**

شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کی سفارش پر ۱۸۵۰ء میں غالب کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی۔ یہ تنخواہ آغاز جون ۱۸۵۰ء سے لے کر آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتی رہی۔ حکیم احسن اللہ خاں جمع و تحقیق سوانح پر مامور تھے۔ وہ حالات لکھ کر غالب کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور غالب ان حالات کو اپنی بہار آفریں نثر کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ غالباً ۱۸۵۴ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا مکمل ہوا۔ اس کا نام "مہر نیمروز" تھا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غالب نے "ماہ نیم ماہ" رکھا تھا۔ لیکن اس حصے کو وہ ابھی شروع بھی نہیں کر سکے تھے کہ غدر کی آگ مشتعل ہو گئی۔ جس کی وجہ سے تیموری خاندان کا رخت وجود ہی راکھ بن کر اڑ گیا۔

غدر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ قلعہ سے غالب کو جو آخری تنخواہ ایصال ہوئی ہو گی وہ اپریل ۱۸۵۷ء کی ہو گی۔ گویا اس سلسلے میں غالب کو کل چار ہزار ایک سو پچاس روپے ملے۔

**ملازمت سے پیشتر کا تعلق**

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ملازمت سے قبل بھی غالب قلعہ میں آتے جاتے تھے مختلف تقریبات پر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے گزرانتے تھے۔ اور خلعت پاتے تھے۔ خواجہ

مرحوم کے اس ارشاد کی تائید غالب کے کلیات سے بھی ہوتی ہے۔ کلیات میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے جن کا انتقال ۱۸۳۷ء میں یعنی قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے سے تیرہ برس قبل ہوا۔ بہادر شاہ ثانی کی مدح میں غالب کے فارسی کلام میں دو مثنویاں، ایک ترکیب بند اور پندرہ قصیدے ہیں۔ نیز اُردو میں دو قصیدے اور چند چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ کے ساتھ غالب کا تعلق ملازمت سے پہلے بھی قائم تھا لیکن یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ ان قصائد کے صلہ میں کیا کچھ ملتا رہا اور خلعت کی حیثیت کیا ہوتی تھی۔

**شش ماہہ تنخواہ کا حکم**

قلعہ والی تنخواہ میں غالب کے لئے صرف ایک نہایت ناگوار صورت حالات پیدا ہوئی تھی یعنی یہ حکم ہو گیا تھا کہ ملازمین قلعہ کو ماہ بہ ماہ تنخواہ ملنے کے بجائے چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ ملا کرے۔ غالب کی پوری زندگی مختلف النوع مالی احتیاجات میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کسی ذریعۂ آمد میں ایک لمحہ کا توقف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہیں ششماہی والا حکم بڑا تکلیف دہ نظر آیا۔ انہوں نے اس حکم سے مستثنیٰ کئے جانے کے متعلق اُردو میں ایک قطعہ لکھ کر بادشاہ کی بارگاہ میں گزرانا جس میں اپنی ضروریات و مشکلات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا فرماتے ہیں[۵]

مری تنخواہ جو مقرر ہے      اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک      خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات      اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض      اور رہتی ہے سود کی تکرار
مری تنخواہ میں تہائی کا      ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آخر میں لکھتے ہیں ؎

مری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ      تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اس پر غالب کے لئے ماہ بہ ماہ تنخواہ کا حکم جاری ہو گیا۔ بادشاہ کی طرف سے پچاس روپے ماہانہ کے علاوہ شہزادہ فتح الملک کی طرف سے بھی چار سو روپے سالانہ تنخواہ ملتی تھی لیکن شہزادہ کی وفات

کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ وہ اس فتوح سے دو برس سے زیادہ تمتع اند نہ ہو سکے[1]۔

**رام پور کا وظیفہ** غالب کی زندگی کے آخری دس برس میں انہیں رام پور سے سو روپے ماہانہ مستقل طور پر ملتے رہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم فرمانروائے رام پور اپنی صاحبزادگی کے زمانے میں تحصیل تعلیم کے لئے دہلی آتے تھے تو غالب کے ساتھ نہایت گہرے دوستانہ روابط پیدا ہو گئے تھے۔ وہ مفتی صدرالدین آزردہ سے عربی اور غالب سے فارسی پڑھتے تھے۔ اغلب ہے کہ اس طالب علمی کے زمانے میں بھی غالب سے کچھ سلوک کرتے رہے ہوں۔ اس لئے کہ نہ غالب عام معلم و مدرس تھے نہ انہوں نے کوئی درسگاہ جاری کر رکھی تھی۔ اور نہ امیرزادوں کا یہ دستور تھا کہ کسی سے پڑھیں اور اس کے ساتھ سلوک نہ کریں۔ ۱۸۵۵ء میں نواب صاحب اردو شاعری میں غالب کے شاگرد بنے۔ ان کے لئے ناظم تخلص تجویز کیا گیا۔ غالب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد ہونے کے بعد وہ وقتاً فوقتاً کچھ روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

> ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا (یعنی نواب کے عطایا) فتوح گنے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔

**مستقل تنخواہ کا مطالبہ** غدر کے بعد جب قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی۔ اور خاندانی پنشن بند ہو گئی تو غالب نے ایک فارسی قصیدہ نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا جس میں گہرے دوستانہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب کے تغافل کا شکوہ کیا گیا تھا۔ بمناسبت مقام کے لحاظ سے اس قصیدے کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

چوں نیست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل    دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

---

[1] اردوئے معلّیٰ صفحہ: ۱۱۔

در بادیہ بر گور غریباں ز چہ سوزد      آں شمع فروزاں کہ بود در محفل
زاں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود      صد حیف کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل
افسانۂ غم گر بسرائم بنود عیب      با دوست کہ پیوستہ ہمے برد غم از دل
مے گویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن      چوں مے ندہد داد ز فریاد چہ حاصل

……

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من      بربستہ بہ رویم در ارسال رسائل

……

چوں است کہ گاہے نکنی روئے بدیں سوئے      چوں است کہ ہرگز ندہی گدیہ بہ سائل
گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بہ گیتی      حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری از دور بہ فرمائے      تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل
غالب بہ سخن نام من آمد ازل آورد      دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی جاہل
"در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب"      ایں آیۂ خاص است کہ بر من شدہ نازل
من گنجم و گردوں بہ گل اندودہ درم را      مے بیں در گنج ارچہ کشودن شدہ مشکل
خود در خور ویرانہ بود گنج گراں مند      غم نیست گر آبادی دہلی شدہ زائل
ہاروت فسون نفس گرم چہ داند      اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

اس کے بعد نواب صاحب کو توقیع بریلی کی مبارکباد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں مفتی یا قاضی یا شحنہ یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ماہ بماہ پہنچتا رہے۔

اس قصیدے سے نواب یوسف علی خاں مرحوم نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ غالب کے لئے مقرر فرما دیا جو ماہ بہ ماہ نواب صاحب خود غالب کو بھیج دیتے تھے۔ نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے ہنر شناس اور پایہ فہم جانشین نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی یہ وظیفہ بدستور قائم رکھا

### متفرق عطایا

اس مقررہ وظیفہ کے علاوہ بھی نواب یوسف علی خاں وقتاً فوقتاً متفرق رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ غالب ۱۸۶۵ء کے ایک مکتوب میں سیف الحق میاں داد خاں صاحب سیاح کو لکھتے ہیں:

> ایک قرن سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں والی رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے۔ اور سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ بہ سبیل ہنڈوی بھیجتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھئے کہ کبھی مجھ سے اس روپے کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے تھے میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ بھی کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد (غدر) کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بہ ماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

شاید کسی صاحب کے دل میں آخری لفظوں سے یہ شبہ پیدا ہو کہ نواب یوسف علی خاں شاگردی کے آغاز ہی سے سو روپیہ ماہانہ مستقل بھیجتے رہے۔ یہ شبہ صحیح نہیں۔ غالب نے خود میرزا تفتہ کے نام کے خط میں تصریح کی ہے کہ مستقل وظیفہ جولائی ۱۸۵۹ء سے شروع ہوا۔ فرماتے ہیں:-

> نواب یوسف علی خاں تیس برس کے میرے دوست۔ اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا یہاں رہوں یا وہاں رہوں خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

### نواب کلب علی خاں کا عہد

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی یہ وظیفہ جاری رکھا تھا۔ غالب لکھتے ہیں:-

> رئیس حال (نواب کلب علی خاں) کو خدا بہ دولت و اقبال ابداً مؤبداً سلامت رکھے۔ وجہ مقرری کی ہنڈوی ہر مہینے حسب دستور قدیم اپنے خط میں بھیجا جاتا ہے فتوح کی رسم دیکھئے جاری رہے یا نہیں

### قاطع برہان کی طباعت میں امداد

معلوم ہوتا ہے کہ غالب خود بھی خاص ضروریات کے سلسلے میں روپیہ طلب کر لیتے تھے مثلاً "قاطع برہان" کی چھپائی کے لئے دو سو منگائے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:-

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور (نواب یوسف علی خاں) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو روپے پہنچیں گے۔ وہ (نواب صاحب) آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔ بصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ مگر اس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کا سررشتہ دفتر سے نہ تھا جو ازروئے دفتر اس کی تقلید ہو۔

اصلاح اشعار سے معذرت

غالب نے ایک مرتبہ اصلاح اشعار سے بھی معذرت لکھ بھیجی تھی لیکن نواب صاحب کی طرف سے مقررہ وظیفہ بدستور پہنچتا رہا۔ غالب میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :-

رئیس رام پور سو روپیہ مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے۔ تو میں سکہ لمبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بہ شرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری تو برابر آتی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیئے جاتے ہیں۔

نہ محض اصلاح اشعار کی خدمت ہی معاف تھی۔ بلکہ رام پور جانے کی بھی پابندی نہ تھی۔ غالب خود فرماتے ہیں :-

حق تعالیٰ والی رام پور کو صد و سی سال سلامت رکھے۔ ان کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو پہنچتا ہے کرم گستری اور استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔

رام پور میں قیام کرنے کی تنخواہ

غالب صرف دو مرتبہ رام پور گئے۔ پہلی مرتبہ نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں جنوری ۱۸۶۰ء میں۔ دوسری مرتبہ نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کی تقریب میں اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور میں ان کو مقررہ وظیفہ کے علاوہ سو روپیہ بنام دعوت ملتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے

ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا۔ تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی رام پور میں رہوں تو دو سو روپیہ
مہینا پاؤں اور دلی میں رہوں تو سو روپیہ۔

**اودھ کے ساتھ تعلقات** سلطنت اودھ کے ساتھ غالب کے تعلقات و روابط کے متعلق ایک اقتباس اوپر پیش کیا جا چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی سرکار سے انہیں بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سالانہ مقرر ہوئے لیکن واجد علی شاہ کی سلطنت اس وظیفے کے تقرر کے بعد دو برس سے زیادہ قائم نہ رہی۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ پانسو روپے سالانہ کا یہ وظیفہ ۱۸۵۳ء کے اواخر یا ۱۸۵۴ء کے اوائل میں مقرر ہوا تھا۔ ہم غالب کے سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھنؤ میں ٹھہرنے کے حالات بیان کر چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے ساتھ غالب نے غازی الدین حیدر کے زمانے میں ۱۸۲۷ء میں تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ خواجہ حالی غالب کے قیام لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں :—

> اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ ان کی تقریب کی گئی مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں جو ان کے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔

**خواجہ حالی مرحوم کا سہو** ہم غالب کے لکھنؤ جانے کی تاریخ متعین کر چکے ہیں۔ غازی الدین حیدر نے ۱۷ر ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو اس دنیا سے کوچ کیا۔ غالب اس سے قبل لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ کا انتقال ہوا۔ غالب کو یہ اطلاع کلکتہ کے راستے میں ملی تھی۔ اور اس وقت وہ محض لکھنؤ ہی نہیں بلکہ باندہ سے بھی آگے نکل چکے تھے۔ لہذا یہ صحیح نہیں کہ وہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔

اس زمانے میں روشن الدولہ کے نائب السلطنت ہونے کا بیان تو اس درجہ حیرت انگیز ہے

---

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۴۔

کہ دل میں خیال پیدا ہوتا ہے خواجہ حالی نے غالب کے کلیات نثر فارسی کو بالاستیعاب دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ صنعت تعطیل والی جس نثر کا خواجہ حالی نے ذکر فرمایا ہے وہ کلیات کے صفحہ ۶۵ اور ۶۶ پر موجود ہے۔ اس نثر کی ترتیب کی داستان غالب خود ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا۔ جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے "وہ بہ تر خانی فرمانروائے آں کشور و مدار المہامی آں سلطنت اشتہار داشت"[۵۱]۔ پھر لکھنؤ کے حالات رائے چھجمل کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> ہرچہ دراں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانی ایں گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ مے شد بخدا کہ حال برعکس است[۵۲]۔

اگر خواجہ حالی مرحوم کی نظر سے کلیات نثر فارسی کے یہ حصے گزر چکے ہوتے یا "یادگار" لکھتے وقت یہ حصے انہیں مستحضر ہوتے تو وہ کبھی یہ نہ فرماتے کہ غالب کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں روشن الدولہ نائب السلطنت تھے یا صنعت تعطیل میں جو نثر لکھی گئی تھی وہ روشن الدولہ کے لئے لکھی گئی تھی یا غالب کی تقریب بہ عنوان شائستہ روشن الدولہ کی بزم میں ہوئی تھی۔

نیز معلوم ہے کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں اور نصیر الدین حیدر کے ابتدائی دور میں روشن الدولہ نہیں بلکہ معتمد الدولہ آغا میر ہی نائب السلطنت اور مدار المہام تھے۔ سارے اختیارات کی باگ انہی کے ہاتھ میں تھی۔ معتمد الدولہ کی معزولی کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی مدار المہام و نائب السلطنت مقرر ہوئے انہی کے داماد نواب حامد علی خاں تھے جو کچھ مدت کے لئے بہادر شاہ پادشاہ کے بھی وزیر بنے تھے اور غالب کے ایک عزیز دوست تھے۔ ان کے بعد جمادی الثانی ۱۲۴۶ھ مطابق ۴ر نومبر ۱۸۳۰ء کو منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نیابت و مدار المہامی پر مامور ہوئے[۵۳]۔ اس سے کم و بیش گیارہ ماہ قبل غالب کلکتہ ہو کر اور وہاں دو برس رہ کر دہلی آ چکے تھے۔ اگست ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی علی خاں معزول ہوئے[۵۴]۔ اور نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ کو وزارت کا منصب عطا ہوا[۵۵]۔ غالب کے لکھنؤ جانے سے سوا پانچ برس بعد

---

[۵۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵۔ [۵۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۵۔ [۵۳] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۵۔ [۵۴] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۹۲۔ [۵۵] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۸۰

جو شخص نیابت سلطنت اور مدار المہامی کے منصب پر فائز ہوا اس کی نسبت یہ دعویٰ کیوں کر قبول کیا جاسکتا ہے[لہ] "غالب کے لکھنؤ جانے کے وقت نائب السلطنت تھا؟ جیسا کہ عرض کیا جا چکا میرا خیال یہی ہے کہ خواجہ حالی نے نہ غالب کی تمام تحریرات بالاستیعاب ملاحظہ فرمائیں۔ نہ ان اشخاص کے حالات کی تحقیق کی طرف توجہ فرمائی جن کا ذکر غالب کی تحریرات میں آیا ہے اور روشن الدولہ کا نام انہوں نے غالباً اس بنا پر بلا تکلف لکھ دیا کہ نصیر الدین حیدر والے قصیدے کے آخر میں روشن الدولہ کی مدح میں بھی چند اشعار موجود ہیں۔ حالانکہ یہ قصیدہ غالب کے لکھنؤ جانے سے کم از کم پانچ برس بعد لکھا گیا ہوگا ـــ

**سلاطین اودھ کے قصائد**

غالب کے کلیات نظم فارسی میں شاہان اودھ کے لئے پانچ قصیدے ہیں اور ایک قطعہ ہے۔ قصیدوں میں سے پہلا نصیر الدین حیدر کی مدح میں ہے۔ چونکہ اس میں روشن الدولہ کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ بہ ہر حال نومبر ۱۸۳۲ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ دوسرا قصیدہ امجد علی شاہ کی مدح میں ہے تیسرا بھی امجد علی شاہ ہی کی مدح میں لکھا گیا تھا لیکن غالب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعد ازاں امجد علی شاہ کے بجائے واجد علی شاہ کا نام داخل کر دیا گیا تھا۔ بہ ہر حال وہ واجد علی شاہ ہی کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ بقیہ دونوں قصیدے واجد علی شاہ کی مدح میں ہیں قطعہ نصیر الدین حیدر کی شادی کی تقریب میں لکھا گیا تھا جس سے سنہ ۱۲۴۴ھ تاریخ نکلتی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ غالب کے روابط کی پہلی کڑی یہی قطعہ ہے۔ غالباً یہی قطعہ ہے جس کے متعلق کلکتہ میں بیٹھے ہوئے مولوی کرم حسین صاحب سفیر شاہ اودھ مقیم کلکتہ کو لکھتے ہیں :-

> آنچہ من در رہنمائی نگارش ایں قطعہ دست مزد خویش می خواہم روشناسی خسرو است۔ و تشریف قبول و نوید التفات و عطیہ فتوح۔ اما کشائش طلسم ایں مدعا در گرو آں است کہ پایۂ مقام ستائش گر بہ حضرت ممدوح شمردہ می شود تا بہ اندازہ ارزش وے عطا تواند کرد۔ ورنہ پیدا است کہ جائزہ باز خواناں

---

[لہ] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۲۷۴ ـ

تا چہ قدر است۔

اس کے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ بھیجنے تک غالب کی طرف سے اودھ کے د رابطہ پیدا کرنے کی غالباً کوئی کوشش نہیں ہوئی

**نصیر الدین حیدر کا قصیدہ**

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قصیدہ نومبر ۱۸۳۲ء کے بعد لکھا گیا۔ اس لئے کہ اس میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے جو نومبر ۱۸۳۲ء میں وزیر اعظم ہوئے ؎

روشن الدولہ بہادر کہ بہ ایثار و عطا — حاتمش گفتم و شرمندۂ نقصاں رفتم
برکیدند ہمہ برکیاں زہسر زرشک — چو ثنا خوان ثنا گسترش بر آناں رفتم

بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

تو سلیمانی و آں آصف و من مور ضعیف — راہ نسبت طلبی ہیں کہ چہ شایاں رفتم
بہ ولیم بسپر و بنویس برائم بروے — تا بدانم کہ بہ آصف ز سلیماں رفتم

سبحان علی خاں قوم کے کمبوہ اس زمانے میں ایک نہایت فاضل اور دانشمند شخص تھے جو معتمد الدولہ آغا میر کے مشیر خاص رہ چکے تھے اور روشن الدولہ نے بھی اپنے زمانے میں انہیں اپنا مشیر خاص بنا لیا تھا۔ غالب اسی قصیدہ کے متعلق سبحان علی خاں کو لکھتے ہیں :-

> این عرضداشت بہ فروغ نگاہ قبول آصف ثانی و روشن الدولہ مشرف گردد و ایں قصیدہ بہ بزم مینو مثال سلیمانی (نصیر الدین حیدر) خواندہ شود تا مرا کہ سخن پیوند ستائش نگارم بہ جائزہ خسروی رخ امتیاز افروزش پذیرد، و آنگاہ حاسداں گرانمائگی کہ ہم بہ ہرم بلند نامی و ہم در نظر خویش گرامی کنند۔[۱]

سبحان علی خاں کے نام غالب کے مکاتیب فارسی میں دو اور خط ہیں جن میں سے ایک میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ اور عرضداشت مدت سے آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ بھی سن چکا ہوں کہ وزیر اعظم نے اس قصیدے کو بہت پسند کیا، لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ قصیدہ بارگاہ شاہی میں پہنچایا گیا یا نہیں

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۱۲۔

منشی محمد حسن خاں صاحب کو بھی اسی قصیدے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اگر صلہ مل جائے تو میں مقدمہ کی پیروی کے لئے دوبارہ کلکتہ جانے کا سامان کروں[1]۔

پانچ ہزار کا صلہ متوسط کھا گئے

اردو کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ پر پانچ ہزار روپے ملے تھے لیکن تین ہزار روپے روشن الدولہ نے ہضم کر لئے جسے غالب ایثار و عطا میں حاتم کہنا بھی اس کے پایہ سے فروتر سمجھتے تھے اور جس کی جود و سخا کی داستان برمکیوں کو سناتے انہوں نے زہر کھا لیا تھا۔ دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور کہا کہ ان میں سے جو کچھ مناسب سمجھو غالب کو بھیج دو لیکن غالب کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ[2] مرحوم لکھنؤ سے آئے انہوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا۔ اور کہا خدا کے واسطے منشی محمد حسن کو میرا نام نہ لکھنا۔ ناچار میں نے امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدہ پر کیا گزری۔ انہوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار روپے ملے تین ہزار روپے روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے پادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط پادشاہ کو پڑھوا کر ان کا (روشن الدولہ وغیرہ کا) کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی! یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین مرگیا۔ اب کہو

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷

[2] مظفر الدولہ سیف الدین خاں خلف اکبر نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر (جو غدر کے بعد الور سے پکڑے آئے تھے اور گوڑگانوہ میں گولی سے مارے گئے تھے۔

میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔

یہ اس نادر الوجود شخص، آخری دور کے سب سے بڑے شاعر، پرانی طرزوں کے خاتم اور نئی طرز کے موجد اول کی حالت تھی۔ کہ اس کا جو قصیدہ فارسی زبان کے بہترین شعرا کے بہترین قصائد کے مقابلے میں بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے اس پر شاہ اودھ پانچ ہزار انعام دیتا ہے لیکن سارا روپیہ متوسط ہضم کر جاتے ہیں اور اس غریب کو پانچ پیسے بھی نہیں ملتے۔ بلکہ صلہ یابی کی اطلاع بھی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔

**امجد علی شاہ کا قصیدہ**

نصیر الدین حیدر نے ۱۸۳۷ء میں وفات پائی اور محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے لیکن غالب نے ان کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا نہ کیا۔ امجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو پھر انہوں نے ایک قصیدہ لکھا جس کی بیت اسم یہ ہے ؎

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوق دعائے او
صد رہ نماز صبح قضا کرد روزگار

اس قصیدہ کے سلسلے میں بھی عجیب واقعہ پیش آیا۔ غالب جس زمانے میں آگرہ میں تھے ایک صاحب ان سے ملے تھے۔ جو بڑے زبان آور اور چالاک تھے۔ وہ کہیں تحصیلدار رہ چکے تھے۔ آگرہ میں ملازمت کی جستجو کی لیکن کوئی صورت نہ بنی اور وہاں سے چلے گئے۔ غالب دہلی میں آ رہے۔ کافی مدت کے بعد امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ سے ان کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ وزیر سے ملا ہوں بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انہیں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے، "خان" اور "بہادر" کا خطاب ملا ہے۔ مصاحبوں میں نام درج ہوا ہے۔ وزیر آپ کا بہت مداح ہے۔ اگر آپ قصیدہ اور عرضداشت بھیجیں تو بادشاہ آپ کو بلائیں گے۔ غالب لکھتے ہیں کہ قصیدہ تیار تھا لیکن

متردد تھا کس کی معرفت بھیجوں توکلت علی اللہ اس شخص کے پاس بھیج دیا۔ رسید آگئی دو صفحے کے

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶۔

> بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا، یہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا میں متوقع ہوں کہ یہاں بدرالدین مہرکن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کی بادشاہ تک گذرنے کی نوید بس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا میں نے جو خط بھیجا اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مہر تم سے حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

گویا یہ قصیدہ بھی بے صلہ رہا۔

**واجد علی شاہ سے تعلق**

واجد علی شاہ کے زمانے میں غالب نے پھر سلسلہ جنبانی کی شاہ موصوف کے مصاحبوں میں اس وقت ڈوموں کا بڑا زور تھا اور انہیں بڑے بڑے خطاب ملے ہوئے تھے مثلاً رضی الدولہ، نجیب الدولہ، قطب الدولہ، وہاج الدولہ۔ غالب نے قطب الدولہ کی وساطت سے قصیدہ واجد علی شاہ کی بارگاہ میں بھیجا۔ مولانا ضمیر نے قصیدہ بارگاہ میں پڑھا حکم ہوا کہ اس کے صلہ کا مسئلہ دوسرے وقت میں پیش کیا جائے لیکن ابھی صلہ کی نسبت کچھ طے نہیں ہوا تھا کہ قطب الدولہ اور دوسرے تمام ڈوم واجد علی شاہ کی مصاحبی سے نکالے گئے۔ ان کے اخراج کا واقعہ ۲ر جون ۱۸۵۰ء کو پیش آیا[۵۱]۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ قطب الدولہ نے اپنے اخراج پر قصیدہ مع عرضداشت بجنسہ غالب کے پاس بھیج دیا[۵۲]۔ نواب محمد علی خاں عرف میرزا حیدر کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ مع عرضداشت دوبارہ ان کی وساطت سے بھیجا گیا تھا[۵۳]۔

**مجتہد العصر کی وساطت**

یوسف میرزا کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غالب کو واجد علی شاہ کے دربار سے خلعت مجتہد العصر کی وساطت سے ملا تھا وہ فرماتے ہیں:-

> میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص و رومال و دوشالہ ایک بار پاچکا۔

---

[۵۱] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۱۶۹ [۵۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰ [۵۳] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰-

> حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں مگر یہ بھی جانتے ہو وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے ملا ہے؟ یعنی جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ بے ان کے توسط کے مدح گستری کروں۔ چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا دستور ہے کاغذ کو بڑا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا۔ اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ کو بھیج دیا ہے۔

یہ خط ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کا ہے۔ اور یوسف مرزا اس زمانے میں کلکتہ میں تھے۔ واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں سلطنت سے علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت اودھ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی واجد علی شاہ کے ساتھ غالب کا تعلق قائم رہا۔ یوسف مرزا کے نام کے ایک اور خط سے بھی جو ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے اس میں لکھتے ہیں:

> بہ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے حصہ برادرانہ کروں نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد، نصف میں مفلسوں کا مدار حیات۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کلکتہ سے واجد علی شاہ نے کبھی کوئی رقم بھیجی یا نہ بھیجی۔

**حیدرآباد سے تعلق** اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ صاحب عالم مارہروی نے غدر کے بعد لکھا تھا کہ کیوں حیدرآباد سے روابط پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ لیکن غالب نے اپنے طالع کی ناسازی اور ناکامیوں کی داستان بیان کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حیدرآباد میں کوشش کی جائے گی تو یا تو متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا یا مقصد میں ناکامی ہوگی بالفرض اگر کچھ مقرر ہوگا تو ریاست برباد ہو جائے گی۔

**شمس الامرا کا قصیدہ** لیکن غالب نے کوشش کی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ مدینہ منورہ کے ایک صاحب جن کا نام عبد الرزاق تھا حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ انہوں نے بیان کیا کہ نواب شمس الامرا بہادر والی پائیگاہ کی محفل میں غالب کا ذکر آیا تھا بس یہی امر غالب کے لئے تعلقات پیدا کرنے کا محرک بن گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۲۷ شعر کا ایک قصیدہ شمس الامرا کی مدح میں لکھا اور

ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی حیدر آباد بھیج دیا۔ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں اُردو شعر کہتا تھا۔ اور ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اب تیس برس سے صرف فارسی شعر کہتا ہوں۔ قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں :-

چہ قصیدہ از سینہ کہ تاب غم دراں آتش افروخت نیم سوختہ آسے واز خرمنے کہ برق آں را پاک سوخت دود و اندوہ گیاست۔ فرخا بخت عریضہ نگار کہ دستایہ چشمداشت قبول روزے چند دل بہ شادمانی نہد و دریں تمنائی داد ہمدمی خویش دہد ؎

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس زکیمیا طلبی است

اس فارسی قصیدے کے صرف دو شعر مکتوب میں درج ہیں نہ یہ غالب کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے نہ "سبد چین" میں ہے۔ اور نہ کسی اور جگہ شائع ہوا ہے۔ نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ضائع ہوا دو شعر یہ ہیں ؎

اے مظہر کل درازل آثار کرم      منت بہ سر لوح زاسم تو قلم را
شمس الامرا کز شرف نسبت نامش      خور قبلہ بُد اورنگ نشینان عجم را

ممکن ہے خاندان شمس الامرا کے پرانے کاغذات میں سے غالب کا یہ قصیدہ مل جائے اگر کوئی صاحب اسے تلاش کر سکیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شمس الامرا کی طرف سے قصیدہ کا کوئی صلہ ملا یا نہ ملا۔

**سر سالار جنگ کا قصیدہ**

اس کے بعد غالب نے نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ فارسی مکاتیب میں ایک عرضداشت نواب صاحب موصوف کے نام موجود ہے جس میں لکھتے ہیں :-

قصیدہ مدحیہ فرستادہ باشم و نہ دانستہ باشم کہ بہ نظرگاہ خدائگاں گزشت یا خود عریضہ در عرض راہ تلف گشت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کب یہ قصیدہ نواب مختار الملک کی خدمت میں بھیجا؟ غالب کے جس

مکتوب یا عرضداشت کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ اس پر تاریخ ثبت نہیں لیکن مکتوب کے آخر میں شعر

تا چرخ گشت محمل برجیس بقا باد
نواب فلک محمل برجیس شیم را

یہ نواب وزیرالدولہ والی ٹونک کے قصیدہ کا دعائیہ شعر ہے۔ اور تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں نواب وزیرالدولہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ نواب مختارالملک کا قصیدہ نواب وزیرالدولہ کے قصیدے کے بعد لکھا گیا۔

اسی زمانے میں ایک مکتوب منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو بھیجا گیا تھا جو نواب مختارالملک بہادر کے میر منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ موم جامہ میں لپیٹ کر نواب مختارالملک بہادر کو بھیجا تھا[۵۱]۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا نے اس کی رسید بھیجی اور فارسی کلام طلب کیا۔ غالب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فارسی کلام غالباً نواب صاحب کے ایما سے طلب کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ میرے ایک عزیز نے بعد ازاں پنجاہ جزو کے قریب جمع کیا۔ میں اب اسے چھپوانے کی فکر میں ہوں لیکن چھپائی کے مصارف ادا نہیں کر سکتا۔ اسی خط کے آخر میں فرماتے ہیں:-

> آں خواہم کہ رسیدن و نارسیدن دیوان اردو باز دانم و نیز بدانم کہ طلب کلیات فارسی چنانکہ گمان بردہ ام بہ فرمان حضرت نواب صاحب معلی القاب است یا ہمیں از جانب جناب صحیفہ طراز در ہر دو صورت فرمان پذیری آئین خواہد بود۔ والسلام بالوف الاحترام سہ شنبہ یازدہم ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

---

[۵۱] اردو دیوان کے دو ایڈیشن غدر سے پہلے چھپ چکے تھے۔ تیسرا ایڈیشن محرم ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں دلی کے مطبع احمدی میں چھپا تھا۔ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں اور غلط نامہ ساتھ شامل کرنا پڑا تھا۔ اسی ایڈیشن کی تصحیح کے بعد دیوان چوتھی بار مطبع نظامی کانپور میں چھپوایا گیا۔ اور ذی حجہ ۱۲۷۸ھ میں چھپ کر شائع ہوا۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا میر منشی نواب مختارالملک نے اردو دیوان کے پارسل کی رسید بھیجتے ہوئے فارسی کلام طلب کیا تھا جس کے جواب میں غالب نے ۱۱ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ کو اطلاع دی کہ فارسی کلام چھپوانے کی فکر میں ہوں، چھپ جانے کے بعد بھیج دوں گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نواب مختارالملک کو احمدی مطبع والا دیوان بھیجا گیا ہو گا

**ب کی اپنی داستان** نواب مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا۔ اس میں غالب اپنے متعلق تے ہیں ؎

روشن دل آتشیں زبانم　　از دودہ و دودمان نگویم
در نظم بلند پایہ زندم　　والائی خاندان نگویم
عشق است ظہیر و انوری را　　از سنجر و ارسلان نگویم
والا گہر اسپہر جاہا　　اینہا زرہ گمان نگویم
تنگ است دل از ہجوم اندوہ　　میرم اگر آنچنان نگویم
کس نیست متاع را خریدار　　با آنکہ بہا گران نگویم
زاں رو کہ خرد وران گیتی　　رنجند چو قدرداں نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم　　بے رونقی دکاں نگویم
سرمایہ زدست رفتہ وانگاہ　　گاہے سخن از زیاں نگویم

حسن طلب ملاحظہ فرمائیے ؎

امید کہ جز سوال نبود　　حرفے کہ دریں میاں نگویم
ننگم ز سوال نیست اما　　با کلک سیہ زباں نگویم
گر وایہ رسد بمن ز سویت　　با غالب خستہ جاں نگویم
کاں خود ز من است ناتوانی　　با وے سخن از تواں نگویم

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نواب مختار الملک بہادر نے غالب کے ساتھ کچھ سلوک کیا یا نہیں کیا۔

**وزیر الدولہ والی ٹونک کی مدح** غالب کے دو قصیدے نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں ہیں۔ تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت غالب کی عمر چونسٹھ پینسٹھ برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے بڑھاپے کا ذکر قصیدے میں بھی کیا ہے فرماتے ہیں ؎

ہرچند بہ پیری شدہ دل سرد ز ہستی　　از سردی ہوسم چہ زیاں گرمی دم را
دارم نفس گرم در افسردہ دلی نیز　　از بہمن و دے تب نبود شیر اجم را
برنائی اگر رفت نہ آنست کہ برمن　　حقّے نبود پرورش آموز ہرم را
فرخ دم پیری کہ کند در نظرم خوار　　خوبان قمر طلعت و ناہید نغم را
پشتم بہ سوئے سجدہ ز خم راہ نماید　　باریست گراں منّت غمخواری خم را
با پشت خم آسودہ تواں زیست بگیتی　　اما چہ کنم کج روی بخت دژم را
جا در دو جہاں آنقدرم نیست کہ وقتے　　بیروں نہم از دائرہ پاس قدم را

اس قصیدے میں ایک غزل بھی کہی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

در ہند تنک مایہ چو رندان نکویاں　　یا رب بحجۂ تسلیم برہم ذوقِ ستم را
شیرینیِ جاں بر لب من موج زد اما　　ایں شہد ببرد از دہنم تلخیِ سم را
آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغانم　　دانند کہ من مردنیم رنج و الم را
غافل کہ ہم از ہول نگونساری بخت است　　فریاد گر از لب جدا رباب ہمم را
غم خست درون من و خونابہ آں زخم　　بر چشم روا داشت برون دادن نم را
در سرمہ فرو خفتہ گدایانہ خروشیست　　پیش آمدہ روز سیہ حرف رقم را

آخر میں فرماتے ہیں ؎

گفتم کہ گدائم ز گدایاں نہ شماری　　در ہم نفساں نیز بود تفرقہ ہم را
ہر چند بہ دریوزہ عزّت ز عزیزاں　　با خود بہ شفاعت نتواں برد قسم را
سوگند خورم گر بہ فروغ گہر خویش　　فیض از دم سوگند رسد صبح دوم را
من دا بہ زنشہ چہ بیم و نشۂ معرفت از من　　رنج جانکنی گل من است افسر جم را
ہنگام گدائی فتد از شرم سوالم　　لعل گہر از لرزہ ز دست اہل کرم را

تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کے صلہ میں تاخیر ہوگئی۔ تو غالب نے والی

قطعہ بھیجا جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں ہجو ملیح کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے[1]۔ اور جو غالب کے مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں لیکن "سبد چین" میں موجود ہے۔ میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعہ کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا تھا[2]۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس قدر بھیجا گیا تھا۔

غالب کے کلیات میں نواب وزیر الدولہ بہادر کی مدح میں ایک اور قصیدہ بھی ہے جو عید اضحے کی تقریب میں بھیجا گیا تھا۔ اس قصیدے کے دعائیہ اشعار کا انداز بہت اچھوتا اور دلکش ہے فرماتے ہیں ؎

چند چیز است کہ در پیشگہ اہل تمیز　　　بہ گرانمائگی آرایش گیہاں آمد
آں درخشندہ درفشے کہ بہ یغمائے عرب　　　در زمان عمرؓ از لشکر ایراں آمد (درفش کاویانی)
آں فروزندہ و فیروزہ و دل افروز نگیں　　　کہ روائی دہ فرمان سلیماں آمد (خاتم سلیمانی)
دیگر آں جام جہاں بیں کہ بہ روشن روشی　　　عالم افروز تر از مہر درخشاں آمد (جام جم)
دیگر آں تخت سبک سیر کہ از تیز روی　　　ہمدم باد چو بوئے گل و ریحاں آمد (تخت سلیمانی)
ہفت گنجینۂ پرویز کہ در ہفت اقلیم　　　بہ نموداری ہفت اختر تاباں آمد (گنجینۂ پرویز)
فہم ہر نکتۂ غامض کہ پیمبر فرمود　　　فیض ہر آیت رحمت کہ بہ قرآں آمد
یا رب اینہا بہ تو بخشند و بر آں افزایند　　　دم آبے کہ ز سرچشمۂ حیواں آمد

**تجمل حسین خاں والی فرخ آباد** مسلمان ریاستوں میں اس زمانے میں ریاست فرخ آباد بھی خاص اہمیت رکھتی تھی۔ یہ ریاست بنگش خاندان نے فرخ سیر کے عہد میں قائم کی تھی اور غدر میں برباد ہوئی۔ اس کے والی نواب تجمل حسین خاں کے ساتھ غالب کے روابط بہت اچھے تھے۔ اردو کی ایک غزل کے آخر میں نواب صاحب ممدوح کی مدح میں ایک قطعہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۵۵ [2] بہ حوالہ رسالہ "رومان" بابت جون ۱۹۳۵ء۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

تجمل حسین خاں نے ایک مرتبہ غالب کو فرخ آباد بھی بلایا تھا۔ فارسی مکاتیب میں ایک مکتوب میر احمد حسین خاں میکش کے نام ہے جس میں لکھتے ہیں کہ "امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ امین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ" فرخ آباد بلا رہے ہیں میں نے ان کی محبت کے "تقاضے سے جانا منظور کیا ہے اور تمہیں بھی (میکش کو) ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لہذا پاٹودی سے اسی ہفتے دہلی پہنچ جاؤ۔[1] یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ غالب فرخ آباد گئے یا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً فرخ آباد سے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا رہا ہوگا۔

**الور کے ساتھ روابط** ریاست الور کے ساتھ غالب کے روابط بہت دیرینہ تھے۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب کے والد کی ناگہانی شہادت پر راجہ بختاور سنگھ نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ غالب اور اس کے بھائی کے لئے مقرر کردیا تھا جو مدت دراز تک جاری رہا[2] لیکن کسی دوسرے ذریعہ سے اس معاش کی تصدیق نہیں ہوئی۔ اور غالب نے کہیں اس معاش کا صراحتاً ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی آمدنی کا بلا تکلف ذکر کرتے رہے۔ نہ اس معاش کی بندش کی وجہ خواجہ حالی نے بیان فرمائی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو ابتدائے ورود دہلی میں وقتاً فوقتاً الور سے کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ وہ خود فرماتے ہیں :—

> صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ........ اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا قرض خرچ کے سر بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا[3]

**گل کیوڑہ کا عطیہ** مہاراجہ راؤ بنی سنگھ[4] کے نام غالب کے فارسی مکاتیب میں ایک مکتوب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے کیوڑہ کے پھول غالب کو تحفتاً بھیجے تھے۔ غالب نے ان کی تعریف

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۲۱ [2] یادگار غالب صفحہ ۱۱ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۹۳ [4] مہاراجہ راؤ بنی سنگھ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۵۷ء تک الور کے رئیس رہے ۱۲ —

میں ایک مثنوی لکھی جو محولہ بالا مکتوب میں درج ہے اور ان کے کلیات نظم میں نہیں آئی فرماتے

خوشا کادی و بوے جاں پرورش    زخود بہر پرواز بو شہپرش
کیوڑہ
شمیم رواں پرورش دادہ اند    وگر صورت شہپرش دادہ اند
ازاں روست کایں گل بہ نشر شمیم    نہ زیباست منت پرست نسیم
تو گوئی بہاران فرخندہ خوے    کہ رتمام رنگ است و تمام بو
پے تازہ گلہائے اُردی بہشت    برات رواں بخشی بو نوشت
شمیمے کزاں تازہ گردد دماغ    فزوں آید از طرف گلہائے باغ
نگہداشت آں مایہ دلفروز    بہ کادی بہ بخشید اندر تموز
تموز از دمش نو بہاراں شدہ    شرفنامۂ روزگاراں شدہ
اگرجور دارخست شادی بود    زاکسون گلہائے کادی شود
شمال و صبا پیشکارش بہ باغ    گل از شبنم آئینہ دارش بہ باغ
بدیں ارمغانے کہ فرخ دم است    چنیں تازہ برگے دریں عالم است
بدانساں کہ جاں زیست از تن سپاس    فرستندہ را باد از من سپاس
بود تا کہ زیب بساط سپہر    ز نسرین ماہ و گل سرخ مہر
ہر آں گل کہ آرد بہ گلزار باد    مہاراجہ را وقف دستار باد

گل کیوڑہ کا تحفہ بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے ساتھ غالب کے روابط میں دوستی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔

**الور کے مسلمان دیوان**

منشی امین اللہ خاں دیوان الور کے بھائی منشی فضل اللہ خاں کے نام ایک خط ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کہیں سے سنا تھا کہ ان کی طرف سے کوئی عرضداشت مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوئی حالانکہ غالب نے کوئی عرضداشت نہیں بھیجی تھی۔ منشی فضل اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ بھائی ان سے پوچھ کر لکھو یہ عرضداشت کون لایا تھا

تیسرا خط میرزا اسفندیار بیگ دیوان الور کے نام ہے جس میں میرزا صاحب کے دیوان

ملنے پر مبارکباد دی گئی ہے۔ نیز ان کے حسن انتظام کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> توانگراں را بہ ایمنی بشارت و تہیدستاں را بہ بخشش صلا۔ داوگری را روز بازار خواہد بود و خرد وری را گرمی ہنگامہ۔ بیاباں ہا گلستاں ہا خواہد شد و دمن ہا چمن ہا۔ مرا کہ گوشہ نشینم و چوں چشم پلہ از آں فرخ انجمن دور با کشور و اہل کشور چہ کار و از آبادی ملک و آزادگی خلق چہ سخن...... آخر از دیریں بندگان آں دولتم و از کہن خاک نشینان آں درگاہ۔ نہ شگفت کہ چوں اساس کار بہ آئین دانش و داد نہند گوشہ و توشہ دیرینہ من بمن باز دہند۔[۱]

راجہ شیو دھیان سنگھ

مہاراجہ راؤ بنی سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا راجہ شیو دھیان سنگھ مسند نشین ہوا۔ مسند نشینی کے وقت اس کی عمر کم تھی۔ مہاراجہ راؤ بنی سنگھ کے عہد میں منشی امین اللہ خاں دیوان بنے تھے اور میرزا اسفندیار بیگ نائب دیوان تھے لیکن ان دونوں میں باہمی کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک وقت میں منشی امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں پر عتاب نازل ہوا۔ دوسرے وقت میں میرزا اسفندیار بیگ معتوب ہو گئے۔ راجہ شیو دھیان سنگھ کی مسند نشینی کے وقت منشی امین اللہ خاں ہی مختار تھے۔ اسفندیار بیگ نے انتقام کے جوش میں راجپوتوں کے ساتھ ساز باز کیا۔ اور کہا کہ تمام کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ راجہ انہی کی صحبت کو پسند کرتا ہے۔ اگر یہ صورت حالات قایم رہے گی تو راجہ مسلمان ہو جائے گا۔ راجپوتوں نے اس پر ہنگامہ برپا کر کے منشی امین اللہ خاں اور ان کے بھائی فضل اللہ خاں کو گرفتار کر لیا لیکن راجہ کے اصرار پر دونوں بھائیوں کو دہلی بھیج دیا گیا۔ پولیٹکل ایجنٹ کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے حالات کی اصلاح کے لئے راجہ کو ہوشیار ہونے تک امور ریاست سے علیحدہ کر کے انتظام ایجنسی کے حوالے کر دیا جس کے صدر کپتان امپے تھے۔ پانچ برس کے بعد راجہ کو اختیارات ملے۔ کچھ مدت تک بڑا اچھا انتظام ہوتا رہا لیکن پھر بدنظمیاں پیدا ہو گئیں اور راجپوت موقوف ہونے لگے جن سے راجہ کو سخت نفرت تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ساتھ گہرا میل جول تھا

---

[۱] ممکن ہے یہ اسی "توشہ" کی طرف اشارہ ہو جس کا ذکر خواجہ حالی نے "دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر زر نقد کی شکل میں "یادگار" میں کیا ہے۔

۱۸۷ء میں پھر راجہ صاحب کے اختیار کر دیئے گئے ۱۸۷۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

قصیدہ | غالب نے مہاراجہ شیو دھیان سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ غالباً ۱۸۶۰ء میں لکھا تھا۔ س میں اپنے والد کی شہادت کا ذکر بھی کرتے ہیں ؎

در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور — رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
باید شنود راز ز اعیان بارگاہ — باید شنفت قصہ ز پیران آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست — در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

ات پوری نہ ہوئیں | راجہ شیو دھیان سنگھ سے غالب کو بڑی توقعات تھیں۔ میر مہدی مجروح کو ایک یں لکھتے ہیں :-

> راجہ صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ الحمد للہ علیٰ کل حال۔ دیکھئے اعانت کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو کب طلب کرتے ہیں۔ کلکتہ جاتے وقت فرما گئے ہیں۔ کہ میں آکر اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔

ایک مکتوب سے جو رام پور سے لکھا گیا تھا ظاہر ہوتا ہے کہ الور سے غالب کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ کم از کم ۱۸۶۵ء تک وہ مایوس تھے حکیم غلام نجف خاں صاحب کو لکھتے ہیں :-

> بھائی فضل اللہ خاں کی تنخواہ جاری رہی، رہے گی کیا کہنا ہے۔ مگر الور سے مجھ کو لینا نہیں۔ یاد رکھنا وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ یہ فرض محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں برادر ابن اللہ خاں سابق دیوان الور کا دینا ہے ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپے کا حکم ہوا۔ اور وہ آجائیں تو تم بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دے کر مجھ کو لکھنا۔ باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں گا اس طرح کرنا۔

"سبد چین" | میرزا باقر علی خاں کو ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

> میں نے پچھلے مہینے میں (یعنی نومبر میں) "سبد چین" کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشان میرزا تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی سوا ایک ہفتے میں حضور پر نور مہاراؤ راجہ بہادر کا خط انہی کی معرفت

مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کئے۔

میرزا باقر علی خاں اس زمانے میں الور میں تھے اوپر کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد انہیں لکھتے ہیں:—

> تم تو وہیں تھے تم کو اس کی اطلاع ہوگئی تھی یا نہیں! اور اگر ہوگئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں۔ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے۔ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں۔

**جے پور سے امداد**

ہرگوپال تفتہ کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جے پور سے بھی کافی روپیہ ملنے کی امید دلائی گئی تھی لیکن صرف پانسو ملے۔ فرماتے ہیں:—

> تمہارا دعاگو اور امور میں عالی پایہ نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی محتاج ہوں سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پور سے اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے۔ تو میرا قرض رفع ہو جاتا۔ اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور ہو جاتا یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے سو میرے صرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا۔

**پانسو روپے**

یہ پانسو روپے بہ سبیل ہنڈی بھیجے گئے تھے۔ غالب کو ہنڈی جلد نہ پہنچنے کے متعلق بڑا اضطراب تھا۔ اس کے ساتھ فراخ حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ ہنڈی لانے والے کو پچیس روپے انعام دینے کے لئے تیار تھے نیز آنے جانے کے مصارف ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

> بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی میں حیران ہوں وجہ حیرانی کی یہ ہے کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے (۵ ۱۸۵۳ء) وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ لکھ نہیں سکتا۔ جانتا ہوں کہ وہ سینکڑہ پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں انیس روپے کی کون سی

بات اگر مصاف ہر دیو سنگھ (ہنڈی لانے والے کا نام) میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہو اکیس اور پچیس (انعام کے) چون نکال ڈالیں باقی ارسال کریں۔

۲۴ جون ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:-

تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈی پہنچی۔ تم سمجھے بابو صاحب نے پچیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہرحال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے۔ چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ ہتی کاٹ کر روپے لئے قرض متفرق سب ادا ہو گیا سینتالیس روپے نقد بکس میں ہیں۔ اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہ۔

**مزید عطایا** مزید عطایا کے باب میں فرماتے ہیں:-

بندہ پرور بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں سو سو روپے کی۔ ایک میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں۔ اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بہ طریق نذر شاگردی بعد اس کے دو ہنڈویاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلہ کے روپوں کے چار سو۔ اور اس سے علاوہ تین سو۔ اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

**گوالیار کے ساتھ تعلق** معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار سے بھی غالب کو عطیہ کی توقعات تھیں میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی کے نام فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے مقدمہ پنشن کے متعلق آخری فیصلے کا منتظر ہوں فیصلے کی اطلاع ملتے ہی گوالیار کی طرف چل پڑوں گا۔

**پٹیالہ** غالب کے فارسی قصائد میں ایک قصیدہ نرندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کی مدح میں بھی ہے۔ جو غالباً حکیم محمود خاں مرحوم کے بھائیوں کی وساطت سے پیش ہوا ہوگا۔ اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں[۵]

لبے ز درد دل آمادۂ فغاں دارم    فغاں اگر دلستانگی فغاں گیرد

نہ دیدہ و نہ بہ بینی مرا بہ ہیں کہ منم — کسیکہ از غمش آور بہ استخواں گیرد
بجوئی حال من از قال من کہ نکتہ شناس — سراغ آتش سوزندہ از دخاں گیرد
مرا کہ نام مرا بے ادب نہ گیرد کس — فلک نگر کہ بہ بازیچہ ناگہاں گیرد
سپہر اعمی و من گوشہ گیر درہ نشیب — فغاں ز نطق کہ خصمم بدیں نشاں گیرد
حریر فکر مرا ہر نورد صد رنگ است — خوشم کہ دیدہ ور از من بہ امتحاں گیرد
بہ مشتری چہ رسم ترک چرخ در راہ است — کہ جاں ز جامہ و جا ہر سر آستگاں گیرد
من آں متاع گرانمایہ سبک قدرم — کہ گر بہ ہیچ خرد کس ہماں گراں گیرد
دلم کہ چارہ نہ دارد ہمے جز ایں کہ ترا — بجاں خویش ور اندیشہ مہرباں گیرد

والیان ممالک اور امراء کے مشاہروں یا عطیوں کے تذکرے کے بعد غالب کے اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کے ہدایا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

**تفتہ کا ہدیہ**

تفتہ کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ رفروری ۱۸۵۸ء کو ان کی طرف سے سو روپے کی ہنڈی آئی تھی غالب اس کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :-

ایک آدمی رسید لے کرنیل کے کٹڑے چلا گیا اور سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیئے گئے پچاس روپے محل میں بھیج دئے۔ چوبیس روپے باقی رہے وہ بکس میں رکھ لئے۔ (حساب کے مطابق چھبیس باقی رہنے چاہئیں ممکن ہے دو روپے کسی کو انعام میں دئے ہوں)

غالباً اسی ہدیہ کے متعلق "دستنبو" میں فرماتے ہیں :-

میرزا تفتہ . . . . . از میرٹھ سفتہ زر بہ من فرستاد و جامہ و نامہ پیوستہ مے فرستد۔

**انور الدولہ کے ہدایا**

انور الدولہ نواب سعد الدین خاں بہادر شفق رئیس کدورا کالپی بھی وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ غالب ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں۔

سینتیس ۳۷ روپے کی ہنڈی پہنچی اس کا بھی حال سابق کی سی ہنڈی کا سا ہے یعنی

> ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو کالپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی۔ جو روپیہ دیں۔ اگر سرکار کے کارپرداز وہاں سے ساہوکار کو کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں تو مناسب ہے۔

**میر ابراہیم علی خاں کا ہدیہ**

میر احمد حسین مودودی نے غالباً نواب میر ابراہیم علی خاں سونی کی طرف سے پوچھا تھا کہ آیا کچھ روپیہ بھیجا جائے؟ جواب میں لکھتے ہیں:۔

> سید صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں اگر یہی مرضی ہے تو اتحاف و اہدا تکلف محض ہے فقیر بے سوال ہوں اگر کچھ بھیج دیں گے تو رد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں۔ جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔

پھر ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں فرماتے ہیں:۔

> جب نوٹ بھیجیے تو اہل کلکتہ کی طرح آدھا آدھا دو بار کر کے نہ بھیجیے گا میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے۔ ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

انہوں نے غالباً سو روپے کا نوٹ بھیجا تھا اس لیے کہ ۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

> حضرت یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرت احکام متواترہ و ورود اشعار پیہم یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے رہو۔

**میر غلام بابا خاں کا ہدیہ**

نواب میر غلام بابا خاں سورتی بھی وقتاً فوقتاً غالب کی مالی امداد فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ اُردوے معلّٰی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاطع برہان کو دوبارہ چھپوانے کے سلسلے میں غالب نے امداد طلب کی تھی۔ نواب میر غلام بابا خاں نے ایک گھڑی بھیج دی۔ غالب نے اس کے متعلق شکایتی خط میاں داد خاں سیاح کو لکھا جو نواب میر غلام بابا خاں کے مصاحب بن گئے تھے۔[۱] اس کے بعد نواب صاحب نے سو روپیہ بھیج دیا جس کی رسید ستمبر ۱۸۶۵ء

---

[۱] اردوے معلّٰی صفحہ ۱۷۔

کے ایک مکتوب میں ان لفظوں میں بھیجتے ہیں :-

> سو روپے..... صراف سے وصول ہو گئے چھوٹے صاحب (نواب میر غلام بابا خاں) نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمت کی اس صرف میں میرا کام اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا نہ انہوں نے مجھے دیکھا۔ نہ میرا کوئی حق ان پر نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے بنی منظور۔ خیر فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا کروں گا۔

یہ خط سیاح کے نام ہے۔ ایک خط میں میر غلام بابا کو براہ راست رسید بھی بھیجی گئی ہے۔[۵۱]

**محمد علی خاں کا ہدیہ** مولوی ولایت حسین صاحب کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی خاں کی طرف سے ایک موقع پر دو سو روپے وصول ہوئے تھے۔[۵۲]

فتوحات و عطایا کے اس تفصیلی ذکر کے بعد غالب کی مالی و اقتصادی حالت کے متعلق کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر وہ عمر بھر مالی مشکلات میں اُلجھے رہے۔ ان کا قرض غالباً کسی دور میں بھی ختم نہ ہوا۔ کسی جگہ سے روپیہ آتا تھا تو وہ پہلا قرض اتار دیتے تھے لیکن پھر اس بھروسے پر قرض لینا شروع کر دیتے تھے کہ اور روپیہ آجائے گا۔ اول انہیں بڑی مدت تک یہ اُمید لگی رہی کہ ان کی خاندانی پنشن کا سارا بقایا یک مشت مل جائے گا۔ جو سنہ ۱۸۳۵ء میں ان کے حساب کے مطابق دو لاکھ تین ہزار تھا۔ اور اس کے بعد سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی روپے کے لئے کوششوں کے سلسلے میں انہوں نے وکٹوریہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا۔ وہاں سے جنوری سنہ ۱۸۵۷ء میں جواب آیا جو غالب کے لئے بہت دلخوش کن تھا۔ اس طرح وہ سنہ ۱۸۲۷ء سے لے کر سنہ ۱۸۵۷ء تک مسرت افزا توقعات کے چکر میں اُلجھے رہے۔ دراصل میرا خیال ہے کہ فتوحات و عطایا کے سلسلے میں ان کے سامنے صرف دو حقیقتیں تھیں۔ اول بڑے بڑے شعرائے زمانہ ماضی کے ساتھ سلاطین و امرا کا شاندار سلوک۔ دوم اپنی شاعری کا کمال

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۔ [۵۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۲۹۔

ان کے قصائد فارسی شاعری کے نہایت بلند پایہ شعرا کے قصائد سے اگر بہتر نہ تھے تو کمتر بھی نہ تھے۔ اور وہ قصائد ممدوحین کی خدمت میں بھیجتے وقت اسی خیال میں مبتلا رہتے تھے کہ ممدوحین ان کے کمال شاعری کا صحیح اندازہ کریں گے اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھیں گے جیسا دوسرے بڑے بڑے فارسی شعرا کے ساتھ امرا و ملوک نے روا رکھا تھا لیکن ان کی یہ توقع کبھی بھی پوری نہ ہوئی۔ ان کا صرف ایک قصیدہ ہے جس پر نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے پانچ ہزار روپے دیئے لیکن اس رقم میں سے غالب کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔

ان حالات میں ان کا خرچ مسلسل زیادہ رہا اور ان کی آمدنی کسی وقت بھی ان کے مصارف کے ساتھ سازگاری پیدا نہ کرسکی۔

**مالی مشکلات میں افزائش**

سفر کلکتہ کے گرانبہا مصارف کے بعد ان کی مالی مشکلات خاص طور پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ پنشن کا بقیہ روپیہ یک مشت مل جائے گا اور تمام قرض بے باق ہو جائیں گے۔ لیکن مقدمہ نے طول کھینچا جب فیصلہ غالب کے خلاف ہوا اور روپیہ ملنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو معلوم ہوتا ہے کہ دو ساہوکاروں نے غالب کے خلاف دعوے دائر کر دیا تھا۔ اور ڈگریاں لے لیں تھیں یہ ۱۸۳۵ء کی بات ہے جب ولیم فریزر قتل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بلند پایہ افراد کے متعلق یہ دستور تھا کہ قرضخواہ انہیں گھر سے گرفتار کر کے قید نہیں کرا سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ لوگ گھر سے باہر نکلتے تھے تو انہیں پکڑوا کر حوالات میں بھجوایا جا سکتا تھا۔ غالب نے گرفتاری کے خوف سے اس زمانے میں دن کے وقت گھر سے باہر جانا بند کر دیا تھا اور وہ رات کی تاریکی میں سیر کے لئے نکلتے تھے۔ وہ خود شیخ امام بخش ناسخ کو یہ تمام حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> نخستیں شرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات زدند آں بود کہ دو تن از گروہ وام طلباں چنانچہ قاعدہ عدالت انگریزی است ڈگری بحق من از عدالت حاصل کردند چوں فرجام آں است کہ یا زر مندرجہ ڈگری گزاردہ شود یا تن بہ بند و زنداں دادہ آید۔ و دریں بارہ شاہ و گدا برابر

است۔ آرے از بہر نام آوران ایں قدر ہست کہ سرہنگ عدالت بہ کاشانہ شان نتواند اندخت تا خود بہ رہ گذر یافتہ نشوند۔ بہ اسیری تن در دہند چوں گنجائش اداے زر نبود لاجرم بہ پاس آبرو خود را گرہ آوردم و ترک نشاط سواری کردم۔

**قرض کی کوشش**

نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

کس فرستادہ اند جیت و ہیرالال را بہ حضور بخوانند و در انجمن بنشانند۔ و آنگاہ مرا یاد فرمایند تا بیایم و سر قلادۂ گفتگو بکشایم۔ آنچہ گفتہ آید ماحصل آنہمہ حرف و سخن ایں باشد کہ اسداللہ دام پرست شماست و سررشتۂ توانائیش بہ دست شماست۔ حالیا از اندوہ تنگ دستی و لریش در ماندہ بہ کار خویش است۔ دستش بگیرید و بہ یک ہزار روپیہ دیگر بکارش آید سعی شما ضائع نخواہد رفت۔ و سودمند خواہد افتاد۔

اس خط کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ موجود نہیں لیکن اغلب ہے کہ یہ قرض سفر کلکتہ کے لیے لیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ اتنی بڑی رقم کے یک مشت لینے کی بظاہر اور کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور چونکہ خط میں دو ساہوکاروں کا نام آیا ہے۔ شاید یہ وہی دو شخص ہوں جنہوں نے بعد ازاں غالب کے خلاف وہ ڈگری حاصل کی جس کا تذکرہ شیخ ناسخ والے خط میں موجود ہے۔

**۱۸۵۳ء کی حالت**

قرض کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ مثلاً ۱۸۵۳ء میں جے پور سے پانسو روپے آتے تھے تو اس وقت بھی غالب پر پندرہ سو روپیے کا سودی قرض تھا۔ قرض متفرق اس کے علاوہ تھا۔ غدر کے دنوں میں وہ کپڑے بیچ بیچ کر گزارا کرتے رہے۔ اور بے حد تنگ دست ہو گئے تھے۔ اس زمانے کی حالت مختلف خطوط سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک خط میں پنجابی کی مثل لکھتے ہیں:

پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ "پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں"

(مرقومہ ۴ جنوری ۱۸۵۹ء)

**۱۸۵۹ء کی حالت**

ایک اور خط میں جو نومبر ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:-

بھائی! نہ کاغذ۔ نہ ٹکٹ۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتابیں

> کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں غم گین نہ ہونا۔ کل شام کو فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے آج کاغذ کاٹ منگالوں گا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

> جانتے ہو علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو (غالبؔ کا داروغہ) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض ملنے کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غدر سے تین برس بعد جب غالبؔ کی پنشن کا سہ سالہ جمع شدہ روپیہ یک مشت ملا تو غالبؔ کے ذمے سات کم پندرہ سو روپیہ سودی قرض تھا اور گیارہ سو کئی روپے متفرق قرض تھا[۵۱]۔

**آخری ایام** منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔ کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں بھی غالبؔ کا خرچ کم و بیش تین سو روپیہ ماہانہ تھا۔ اور آمدنی صرف ایک سو باسٹھ روپے تھی۔ فرماتے ہیں :۔

> ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد تین سو روپے کا خرچ۔ ہر مہینے ایک سو چالیس کا گھاٹا کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں۔

تین سو روپے کہاں خرچ ہوتے تھے؟ اس کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ ان کے مکان کا کرایہ پانچ چھ روپے ماہانہ سے کبھی زائد نہیں ہوا۔ ملازموں کی تنخواہیں زیادہ سے زیادہ پچیس تیس روپے ہوں گی۔ گھر کا خرچ بھی زیادہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری دور میں بھی وہ پرانے قرض اُتارتے رہتے تھے اور ان کی آمد کا بڑا حصہ مختلف قرضوں کی قسطوں میں جاتا تھا۔

* * *

---

[۵۱] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۷۰۔

# نواں باب

## داستانِ غدر

بہ ناگرفت چناں صرصرے وزید بہ دہر      کزاں بر آئینہ آسماں غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز مغز خاک انگیخت      سیاہ رو سپہے کاندریں دیار آمد
تو گوئی آنچہ من آں را غبارے گویم      ز بہر کشت من ابر تگرگ بار آمد

یوں تو غالب کے الم نامہ حیات کا کوئی صفحہ بھی ایسا نہیں جس کی سیاہی مصیبتوں، پریشانیوں اور دل شکستگیوں پر آہ و فغاں کے دھوئیں سے تیار نہ ہوئی ہو۔ یا جس کے بین السطور کی آرائش کے لئے دل و جگر کے خون کو بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و غم اور فریاد و ماتم کے "قوس عروجی" کا "نقطہ نہایت" "سلطنت مغلیہ کی تاریخ زوال کا وہ خونریز و خونچکاں واقعہ محزنہ ہے۔ جو عام طور پر "غدر" کے نام سے معروف ہے۔

**تیموریوں کا زوال** تیموریہ سلطنت کی بساط جاہ و جلال حقیقتاً عالمگیر اعظم کے آخری سانس کے ساتھ ہی لپیٹی جا چکی تھی مشین اگر انتہائی تیزی کے ساتھ چل رہی ہو تو انجن کے دفعتہً رک جانے کے بعد بھی پہیہ تھوڑی مدت تک بدستور گھومتا رہتا ہے اور مشین کی حرکت جاری رہتی ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کے وجود کی حیثیت مشین کے پہیہ کی اس عارضی گردش سے مختلف نہ تھی جو انجن کے رک جانے اور فعال طاقت کے معطل ہو جانے پر بھی کچھ وقت تک جاری رہتی ہے۔ اور حقیقت ناشناس سمجھتے رہتے ہیں کہ گویا مشین اپنی اصلی حالت میں چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ پہیہ کی رفتار میں سستی پیدا ہوتی گئی۔ خانہ جنگیوں کے تواتر۔ امرا و روسا کی غرض پرستانہ کشمکشوں کے تسلسل، دشمنوں کے ہجوم، جانشینوں کی نا لائقی اور عدم صلاحیت

نے سلطنت کا شیرازہ اس طرح پریشان کردیا تھا کہ اس کے دوبارہ مرتب و مربوط ہونے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی جس طاقت و قوت کی سطوت و قہرمانی سے کبھی ایک دنیا لرزتی اور کانپتی تھی۔ وہ ٹکڑے ہو ہو کر خزاں دیدہ پتوں کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کی رو میں بہنے لگی تھی۔ آخر شاہ عالم ثانی کے عہد میں اس مشین کا پہیہ بالکل ساکن ہوگیا۔ تاہم مشین اپنی جگہ پر نصب تھی جس سلطنت کے حدود کسی زمانے میں کابل و قندھار سے لے کر ایک طرف برما تک اور دوسری طرف راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سلطنت سمٹتی سمٹاتی دہلی کے لال قلعہ کی چاردیواری میں محصور ہوگئی تھی لیکن اس کا نام باقی تھا۔ اور اس بےبسی کے عالم میں بھی یہ حالت تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اقطاع کے مالک اپنی فرمانروائی کے پروانوں پر انہی لاچار و مجبور سلاطین کی مہریں لگوانے کے آرزومند رہتے تھے اس لئے کہ ان مہروں کے بغیر کسی کی فرمانروائی کے موثق سمجھے جانے کی کوئی شکل نہ تھی تخت طاؤس افسانہ بن چکا تھا لیکن جس دیوان خاص کی دیواروں نے تخت طاؤس کے جلال و جبروت کی بہاریں دیکھی تھیں وہ باقی تھا اور تخت طاؤس پر بیٹھنے والوں کے وہ اخلاف بھی زندہ تھے جن کی بےچارگی اگرچہ انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن لال قلعہ کی خاموش اور ساکت دیواروں کے سینوں میں جو داستانیں محفوظ تھیں انہیں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے وہ بے بہرہ نہ تھے۔ جس انجمن کے ساقیوں نے طول و عرض ہند کے ہر حلق میں ڈھائی تین سو برس تک زمردی نگینوں اور لعلی ساغروں کے ذریعہ سے زلال حیات ٹپکایا تھا وہ پریشان ہوچکی تھی ساقی ہمیشہ کے لئے نقاب خاک اوڑھ کر سو چکے تھے۔ خم و سبو ٹوٹ چکے تھے لیکن نیم شکستہ جام سفالیں اب تک باقی تھا جو انجمن کی یاد تازہ کر رہا تھا جس دل نواز ساز کے روح پرور نغموں نے فرغانہ کی بہار آفریں فضاؤں سے اٹھ کر راس کماری تک ہر وجود کو رقص و وجد کی نئی لذت اور نیا ذوق بخشا تھا اس ساز کے پردے پھٹ چکے تھے لیکن ابھی تک تمام کان آہٹ کی طرف لگے ہوئے تھے جس چراغاں تماشہ کی نظر افروز جگمگاہٹ نے روئے زمین ہند کو دریائے نور بنا رکھا

تھا۔ حتیٰ کہ "تارے بھی زمین پر اُتر آتے" تو اس دریائے نور میں بلبلے بننا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے۔ اسے افسردگی کی ہوائے مخالف بجھا چکی تھی لیکن ایک ٹمٹماتا سا دیا باقی تھا جس کی جھلک عہدِ گزشتہ کی ضوافشانیاں اور نورباریاں یاد دلا رہی تھی۔ غالبؔ کے "صریرِ خامہ" کی "نوائے سروش" "نوا" نہ تھی بلکہ اسی بربادی کا "نوحہ" اور اسی تباہی کا "مرثیہ" تھی ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے،
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

اور آخر یہ بھی کہنا پڑا کہ ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے،

بہ ظاہر اس بکھری ہوئی انجمن کے دوبارہ جمنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور شامِ یاس کے بعد صبحِ اُمید و آرزو پھر آتی دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن لال قلعہ کی سطوت کے مٹے ہوئے نقوش بھی بہت سے دلوں کی تسکین کا سامان تھے۔ آہ! کہ قدرت کو تسکینِ قلوب کا یہ بے حقیقت سا سامان بھی پسند نہ آیا اور "غدر" کی بادِ تند نے اس چراغ کو بھی بجھا دیا جس کا سارا فتیلہ قریب قریب جل چکا تھا۔ اور جس کے روغن کا آخری قطرہ چراغ کی جھلملاہٹ کو سنبھالنے میں صرف ہو رہا تھا۔

**بہادر شاہ اور غدر**

میرٹھ کی سپاہ جب اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے دہلی پہنچی۔ اور بہادر شاہ کی مستقل پادشاہی کا اعلان کیا گیا تو ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ سلطنتِ مغلیہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے اور بابر و اکبر و عالمگیر کی سطوت نے پھر خواب سے آنکھیں کھولی ہیں لیکن خود بہادر شاہ کی نظروں کے سامنے حقیقتِ حال زیادہ اچھی طرح بے نقاب تھی۔ مرحوم ظہیر دہلوی اپنی "داستانِ غدر" میں فرماتے ہیں کہ پادشاہ ایک روز تسبیح خا

ہیں سنگ مرمر کے تخت پر تشریف فرما تھے۔ میں (ظہیر مرحوم) حمید خاں جمعدار خاص برداران فتح علی جمعدار کہاران اور حسین بخش عرضی بیگی حاضر تھے۔

> حضور نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور ڈیڑھ سو برس کے بعد حضور کا اقبال یاور ہوا ہے۔ گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنائے فساد مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ میرے پاس ان میں سے ایک چیز بھی موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ مجھ کو کسی سے کیا خصومت تھی ...... میں تو اک گوشۂ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صدراؤں کو ہمراہ لیے ہوئے بیٹھا روٹی کھاتا تھا میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اب جو منجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آ کر بھڑکی فتنہ برپا ہوا فلک غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائیہ کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم نابود ہو جائے گا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آ کر پناہ پذیر ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہو جاتے ہیں جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا دیں گے۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے اس کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو آج کا میرا قول یاد رکھیے[1]

تیموری خاندان کا آخری نام لیوا بے دست و پا ضرور تھا مجبور اور بے بس یقیناً تھا لیکن قدرت کی عطا کی ہوئی بصیرت سے محروم نہ تھا۔ اس کی زبان پر جو کچھ جاری ہوا آخر پورا ہو کر رہا۔

**”دستنبو“** غالب نے غدر کے حالات کے متعلق ایک مستقل رسالہ (دستنبو) لکھا ہے جو ان کی فارسی نثر

---

[1] داستان غدر صفحہ (۹۹ و ۱۰۰)

ہلک جواہر کا آخری در شہوار ہے۔ یہ رسالہ حقیقۃً غالب کا پرائیویٹ روزنامچہ تھا جس میں گھر بیٹھے بیٹھے جو کچھ سنتے تھے قلمبند کرتے جاتے تھے۔ اس رسالے کی تسوید کا کام شروع ہوا تھا تو غالب ذ یا کسی دوسرے شخص کو یہ یقین نہ تھا کہ انگریز ضرور کامیاب ہو جائیں گے اور مخالفین کا قلع نع ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس رسالے کی ترتیب انگریزوں کی خوشنودی ائل کرنے کے لیے شروع ہوئی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رسالے کے حالات و واقعات و غدر کے متعلق غالب کی بے لوث رائے کا مرقع نہ سمجھیں جو ہر قسم کی مصلحت اندیشی یا ترسیدگی سے پاک تھی۔ غدر پر کم و بیش اسّی برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں ملک کی سیاسی فضا کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔ زاویہ نظر اور نقطہ نگاہ میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے نظریات کی صفیں درہم برہم ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ نئے نظریات کے عساکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے آج غالب کی رائے بے لوث نہ سمجھی جائے۔ یا اس کی تصویب میں بار بار تامل ہو لیکن جن حالات میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے رائے کو بے لوث سمجھنے میں تامل کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غالب نے غدر کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کی تاریخ ہی "رستخیز بیجا" نکالی تھی۔ اس کے متعدد وجوہ ذہن میں آتے ہیں:۔

(۱) غالب طبعاً سکون پسند اور امن دوست تھے اور انہیں ہنگامہ آرائی بالخصوص خونریز ہنگامہ آرائی بالکل پسند نہ تھی۔

(۲) دہلی میں یا دوسرے شہروں میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر بیکسی کے عالم میں جو ظلم و ستم ہوئے تھے۔ ان سے غالب کے انسانیت دوست دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔

(۳) جو انگریز مارے گئے تھے ان میں غالب کے دوست، محب اور شاگرد بھی تھے۔

(۴) مغلیہ سلطنت کے احیا کے لیے جو کوشش کی گئی تھی وہ بالکل غیر منظم تھی۔ اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کی تباہی اور سلطنت مغلیہ کے آخری نقش کے محو کے سوا کچھ نہ نکلا۔

(۵) متعدد اکابر مارے گئے۔ ان کے گھر بار لٹے۔ جائدادیں تباہ ہوئیں، اور بچے اونچے

خاندانوں کی بساطیں اُلٹیں۔ اور وہ نان شبینہ تک کے لئے محتاج ہو گئے۔

### دہلی کی تباہی کا مرثیہ

لیکن انگریزوں کی فیروزی و فتح مندی کے بعد دہلی، اہل دہلی، شاہی متوسلین اور دوسرے لوگوں پر جو ظلم و ستم ہوئے ان کے اظہار میں بھی غالب نے تامل نہیں کیا۔ دستنبو میں بھی ان سختیوں اور شدتوں کا ذکر ہے لیکن ان کے اُردو مکاتیب کے دامن کا تو ہر گوشہ ماتم کے آنسوؤں سے تر نظر آتا ہے۔ ذاتی حالات اور مالی پریشانیوں کے علاوہ غالب کے دردمند دل نے جس موضوع کو الفاظ و حروف کا ماتمی لباس پہنانے پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی۔ وہ دہلی کی تباہی تھی۔ دہلی کی تباہی کا یہ پُرشور نوحہ جو اپنی المناکی اور درد انگیزی میں کسی منظوم نوحہ سے کم نہیں چونکہ منتشر و متفرق تھا اس لئے اس کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو سکی میں نے کوشش کی ہے کہ یہ داستان غم مرتب ہو جائے۔ غالب کی حالت یہ تھی کہ جہاں انہیں موقع ملتا تھا اس درد میں چند نالے کھینچ لیتے تھے۔ اور خون کے آنسوؤں سے اپنے دامن تحریر کو رنگین بنا لیتے تھے میں نے ان تمام آنسوؤں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ غالب کے قلب حزیں کی اس آہ و زاری کے آئینہ میں دہلی مرحوم کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ یہ تصویر غالباً کسی اور مرقع میں نظر نہ آ سکے گی۔[1]

### دستنبو کا خلاصہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے غالب کے رسالہ "دستنبو" کے اہم مطالب پیش کر دیئے جائیں۔ اس لئے کہ "دستنبو" کا مستقل موضوع ہی غدر تھا۔ ابتدا میں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ غدر کا سارا زمانہ غالب خانہ نشیں رہے۔ اور وہ تمام حوادث کے شاہد و ناظر نہ تھے بلکہ جو کچھ سُن لیتے تھے لکھ لیتے تھے۔ بے شک حال سنانے والے معتبر ہوں گے یا

---

[1] میں نے یہ حصہ کسولی میں مرتب کیا تھا جبکہ میرے پاس تصانیف غالب کے سوا اور کوئی کتاب نہ تھی لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے "روزنامچہ غالب" کے نام سے حالات غدر کو خود غالب کی تحریرات سے مدون کیا ہے۔ میں نے وہ رسالہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ اولاً اس میں سارے حالات جمع نہیں ہوئے۔ ثانیاً اس کی ترتیب کا انداز و اسلوب اور ہے۔

ممکن ہے غالب مختلف ذرائع سے ہر روایت کی تصدیق کر لینے کے بعد اسے قلمبند کرتے ہوں۔ حالات غدر کا یہ مرقع نہ مفصل ہے اور نہ تمام واقعات تسلسل کے ساتھ اس میں آئے ہیں بلکہ رسالہ بہت مختصر ہے، اور اس میں ذاتی حالات یا دوستوں اور عزیزوں کے حالات کا بھی اچھا خاصہ حصہ ہے۔

**غدر کا آغاز** غدر کا آغاز ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

> درین سال کہ شمارہ آں را بہ آئین بر آورد (یعنی تاریخ نکالنے کے طریق پر) از رستخیز بیجا برآورند و اگر آشکارا پرسی یک ہزار و دو صد و ہفتاد و سہ (۱۲۷۳ھ) شمرند دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ (رمضان المبارک) و یازدہم مئی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفت اچانک در و دیوار بارہ فصیل، قلعہ دہلی بجنبید۔ و آں جنبش زمین را فرا گرفت...... و دراں روز جاں سوز بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بہ شہر آمدند۔ ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و درصدد و بد کشی تشنہ خون انگریز و دیدبانان پاسبان دروازہ ہائے شہر......... ہم پاس نمک و ہم پاس شہر گذاشتند۔ مہمانان ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند۔ آں سواران سرگران و سبک جلو و پیادگان تندخو و تیزرو چوں درہا باز و دربانان را مہمان نواز یافتند دیوانہ وار بہر سو شتافتند و ہر کرا از فرماندہان و ہر کجا آرامش گاہ آن نہاں اکابر یافتند تا از رہ کشتند و پاک نہ سوختند روے ازاں سو برنتافتند۔

**قلعہ دار اور ایجنٹ کا قتل** اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ چند گوشہ نشین فقیر جو انگریزوں کی بخشش کی طفیل معمولی مایحتاج سے بہرہ مند تھے شہر کے مختلف حصوں میں جا بجا آباد تھے۔ ان لوگوں کو رزم و پیکار کے ہنگاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی اور ہوتی بھی تو ظاہر ہے کہ غدر کے ہمہ گیر سیلاب میں ان کی حیثیت محض چند تنکوں کی سی تھی وہ اس فتنہ کے انسداد میں اپنے آپ کو عاجز و معذور سمجھ کر گھروں میں بیٹھ گئے۔

> یکے ازاں ماتم زدگان منم کہ در خانۂ خویش بودم

میں نے شور سنا اور اس کی علت بھی دریافت نہ کر سکا تھا کہ انگریز ایجنٹ اور انگریز قلعہ دار

کے قلعہ میں مارے جانے کی اطلاع ملی۔ ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پہنچنے کا شور مچ گیا۔ پھر تو

> ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندامان (انگریز) ارغوان زار نہ شد ...... ہائے آں جہان داران
> داد آموز دانش افروز نکو خوئے نکو نام و آہ ازاں خاتونان پری چہرہ نازک اندام با رخ چوں ماہ و
> تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکان جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند و
> در خوش خرامی بہ کبک و تدرو خردہ مے گرفتند (عیب نکالتے تھے) کہ ہمہ یکبار بہ گرداب خون فرو رفتند۔

غدر کی غرض و غایت کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن ہنگامہ قتل کو کون جائز قرار دے سکتا ہے؟

**آتش غدر کا اشتعال**

غالب لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے قتل کے بعد باغیوں نے شہر میں جابجا ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ میں باغ شاہی کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا لیا۔ اور شاہی نشیمن کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مختلف مقامات سے خبریں آنے لگیں کہ سپاہیوں نے اپنے سپہ سالاروں کو قتل کر ڈالا ہے۔ بہرحال سپاہیوں اور کسانوں کے جتھے یک دل ہو گئے اگرچہ ان کے درمیان کوئی ساز باز اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا تھا لیکن سب نے ایک مقصد پر کمر باندھ لی۔ گویا جھاڑو کی تیلیوں کی طرح سب ایک کمربند میں بستہ تھے۔ بے شک ہندوستان کو آرائش و آسائش سے بالکل پاک کرنے کے لئے ایسے ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔

> آرے رفت و روب ہند بوم بدانساں کہ آرائش و آسائش اگر جویند بہ اندازہ پر کاہ نیابند
> ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمے خواست۔

**بے نظمی و بے ترتیبی**

معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد دہلی میں عام بے نظمی شروع ہو گئی تھی۔ "داستان غدر" میں جو چشم دید حالات مشتمل ہے۔ اس بے نظمی کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ غالب بھی اس بے نظمی اور انقلاب کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لشکر موجود تھے لیکن لشکر آرا نہ تھے سپاہ حاضر تھی لیکن سپہدار ناپید تھے۔ فرمانرواؤں کی مصیبت اور ہندوستان کی ویرانی پر

کیوں رونا نہ آئے۔

شہرہائے بے شہریار پر از بندہ ہائے بے خداوند چنانچہ باغہائے بے باغبان از درختان ناپرومند۔ رہزن از گیرودار آزاد و بازرگان سود از محصول از تمتع۔ خانہ ہا ویرانہ ہا۔ و کلبہ ہا خوان نعما بگمنامان نہان خانہ نشیں تا خویش را آرایند و شوخ چشمی خویش بہ مردم نمایند منفعت بہ ہر وجہ چوں مژہ ہا خنجرہا آختہ و نیک مردان آسودگی گزیں دیکہ بہ رفتار آیند تا از غارہ بہ بازار آیند ہزار جا سپر انداختہ۔

**روشن گھروں پہ مصیبتیں اور ناکسوں کی شادمانیاں**

پھر فرماتے ہیں کہ چور مال و دولت لوٹ کر امیر بن گئے اور مخمل و ریشم کے بستروں پر استراحت کرنے لگے۔ روشن گھروں کے گھر میں تیل بھی نہ رہا جس سے چراغ جلا سکیں۔ رات کی تاریکی میں انہیں پیاس لگتی تھی تو اس کی روشنی میں کوزہ و پیمانہ کو دیکھ کر پانی پیتے تھے (معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ خود غالب پر گزرا تھا) جو لوگ مٹی فروخت کرنے کے لئے زمین کھودتے تھے وہ زردار بن گئے جو لوگ بزم میں آتش گل سے چراغ روشن کرتے تھے وہ تاریک گھروں میں ناکامی کے داغ سے جلنے لگے۔ قاصدوں نے خط لے جانے ترک کر دیئے۔ ڈاک کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا سارے قاعدے اُلٹ گئے۔ دلیر اپنے سایہ سے ڈرنے لگے سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے پھر کیا یہ صورت حال سزاوار ماتم نہیں تھی اور اس گریہ پر خندہ روا ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ ان مصیبت ناک واقعات سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا تھا تو لوگ ضعف ایمان اور خرابی مذہب کے طعنے دینے لگتے تھے۔

**ہنگامہ عام**

باغی شروع میں جو روپیہ اپنے ہمراہ لائے تھے انہوں نے شاہی خزانہ میں داخل کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف سے سپاہی جمع ہونے لگے۔ تا آنکہ شہر دہلی کے اندر اور باہر سوار و پیادہ کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نہ اتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتا تھا نہ اس کا انتظام کر سکتا تھا لہذا خود لشکر کے قابو میں آ گیا۔

شاہ را درمیان گرفت سپاہ          ویں گرفتن بود گرفتن ماہ

ماہ تو ہیچ گاہ نہ گیرد　　جز مہ چاردہ نمی گیرد
شاہ ماہ گرفتہ را ماند　　نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

گویا پادشاہ کی حیثیت اس چاند کی سی تھی جس کے گرد ہالہ پڑا ہوا ہو۔ باغی جہاں سے گزرتے تھے جیل خانوں کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ رہائی یافتہ قیدی پادشاہ کے حضور میں آ کر سرداری کی درخواستیں کرتے تھے اور صوبیداری کے آرزومند ہوتے تھے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ہر خواہشمند کو بار اور ہر پناہ طلب کو پناہ کیوں دیئے جاتے ہیں۔

**باغیوں اور انگریزوں میں لڑائی**

انگریزوں کے قبضے میں صرف وہ پہاڑی رہ گئی تھی جو شہر سے جانب مغرب واقع ہے اور زیادہ دور نہیں۔ انہوں نے اسی پہاڑی پر دمدمے اور مورچے بنا کر توپیں چڑھا لیں۔ ادھر باغیوں کے قبضے میں جو توپیں آئیں انہوں نے شہر کی فصیل پر جا بجا نصب کردیں لڑائی شروع ہوگئی۔ رات دن پتھروں کی طرح گولے برسنے لگے۔

**حکیم احسن اللہ خاں پر مصیبت**

حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پروردہ نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پروردہ نے اپنی بددیانتی کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی غرض سے یہ افواہ اڑا دی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے بہی خواہ ہیں اور ان کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں پادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغی قلعہ میں پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا اور اس طرح مظلوم کی جان بچائی۔ باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا۔ مکان کو آگ لگا دی سارا مکان جل کر خاک ہوگیا۔ دیواریں دود آلود ہوگئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں مکان کے ماتم میں سیاہ پوش ہیں۔

**لکھنؤ، رام پور اور فرخ آباد کے حالات**

دہلی سے باہر کے حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تفضل حسین خاں رئیس فرخ آباد نے پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی۔ خان بہادر خاں نے بریلی میں

لشکر جمع کیا۔ ایک سو ایک اشرفی اور نقرئی ساز و سامان سے آراستہ گھوڑا اور ہاتھی بارگا شاہی میں بہ طور نذر بھیجے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور دل سے انگریزوں کے دوست تھے لیکن ہمسایوں کے طعنوں اور شر انگیزیوں سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی مصلحتاً پادشاہ کی خدمت میں زبانی پیام ارسال کیا۔ لکھنؤ سے کچھ انگریز بھاگ کر محفوظ جگہوں پر پہنچ گئے۔ جو باقی بچے وہ بیلی گارد میں حصار بند ہو گئے۔ شرف الدولہ نے ان انگریزوں کے وجود سے بے پروا ہو کر واجد علی شاہ کے ایک دہ سالہ فرزند کو تخت پر بٹھایا۔ چونکہ ابتدا میں شاہان اودھ پادشاہان دہلی کے وزیر تھے اور اس وجہ سے انہیں غازی الدین حیدر کے ابتدائی زمانے تک "نواب وزیر اودھ" کا لقب حاصل تھا اس لئے) شرف الدولہ نے اس لڑکے کو بھی پادشاہ ہند کا وزیر قرار دیا اور اپنے لئے وزیر کے "پیشکار و دستیار" کا لقب تجویز کیا۔ پادشاہ کے لئے ایک گرانبہا نذر بھیجی جس میں دو گھوڑے اور دو ہاتھی تھے ایک زریں کلاہ تھی جو رنگ رنگ کے نایاب گوہروں سے مزین تھی۔ نیز الماس کے بازوبندوں کی جوڑی اور بعض دوسری چیزیں تھیں

### کشمیری دروازے پر انگریزوں کا حملہ

یہ حالات لکھنے کے بعد غالب دفعتہً ۱۴ ستمبر کے واقعات پر پہنچ گئے۔ جبکہ انگریزی سپاہ نے کشمیری دروازہ پر حملہ کیا اور باغی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چار مہینے میں شہر کی جو حالت رہی اسے سرسری طور پر بیان کر چکے تھے۔ قلعہ کے حالات سے تفصیلاً وہ آگاہ نہ ہو سکے اس لئے کہ غدر کے زمانے میں باہر ہی نہیں نکلے تھے۔ سرسری حالات جو ان تک پہنچے ان کا ملخص اوپر درج ہو چکا ہے۔ انگریزی حملے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

مئی گر ز دہلی کل برد داد    ستمبر ستم برد آورد داد
پس از چار ماہ و پس از چار روز    فروزندہ شد مہر گیتی فروز
تہی گشت دہلی ز دیوانگاں    بہ مردی گرفتند فرزانگاں

ہر چند از یازدہم مئی تا چاردہم ستمبر چہار ماہ و چہار روزہ درنگ است پس از انجا کہ اندازہ

بست و کشاد کار بدیں رنگ است کہ شہر بہ روز دوشنبہ از دست رفت و ہم بہ روز دوشنبہ باز بچنگ آمد۔ تواں گفت کہ از دست رفتن و بدست آمدن شہر ہماں در یک روز بودہ است۔

قبضے میں آیا

یعنی ۱۱ مئی کو پیر کے دن شہر پر باغیوں کا قبضہ ہوا اور ۱۴ ستمبر کو پیر ہی کے دن انگریز دوبارہ اس پر قابض ہوئے۔ لہٰذا اگرچہ چار ماہ اور چار دن کی مدت گزر چکی تھی لیکن دن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ شہر جس دن قبضے سے نکلا اسی دن دوبارہ قبضے میں آیا۔

**انگریزی فوج کی زیادتیاں** یہاں تک باغیوں کی چیرہ دستیوں اور ستم انگیزیوں کا بیان تھا۔ اب انگریزوں کی زیادتیوں کی کیفیت سنئے۔ غالب لکھتے ہیں کہ فتح مند لشکر شہر میں داخل ہوا تو لوگ بلا امتیاز قتل ہونے لگے۔ معزز اصحاب نے گھروں کے دروازے بند کر لئے۔ ان کے نزدیک آبرو بچانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ شہر میں جو باغی رہ گئے تھے انہوں نے مقابلہ کیا۔ دو تین روز کشمیری دروازہ سے لے کر چاندنی چوک تک ہر کوچہ رزمگاہ بنا رہا۔ اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ یہ تینوں دروازے باغیوں کے قبضے میں تھے۔ جب انگریزوں نے غصے اور غیظ کے عالم میں شہر کے اندر داخل ہو کر چند بے نواؤں کو مارنا اور چند گھروں کو جلانا روا رکھا۔ تو اس اظہار خشم و کین سے سب پر خوف طاری ہو گیا۔ بے شمار چھوٹے بڑے، نادار و خاکسار مذکورہ بالا تینوں دروازوں کے راستے شہر سے باہر جانے لگے۔ اور باہر کی چھوٹی چھوٹی بستیوں یا مقبروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ بعض نے وہاں بھی دم نہ لیا بلکہ مصیبتیں اٹھاتے اور سختیاں سہتے دوسرے مقامات کی طرف نکل گئے۔

**ذاتی حالات** اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرا مکان شہر کے اندر کشمیری دروازہ اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اور دونوں دروازوں سے تقریباً یکساں فاصلہ پر ہے۔ لوگ جوق جوق شہر سے نکلنے لگے لیکن میرے دل میں نہ گھبراہٹ پیدا ہوئی اور نہ میں اپنی جگہ سے ہلا۔

گفتم کہ چوں گنہگار نیستم بہ سرزنش سزاوار نیستم نہ انگلیسیاں بے گناہ کُش نہ آب و ہوائے شہر ناخوش۔ مرا چہ اُفتادہ کہ در اندیشہ ہائے تباہ افتم و افتاں و خیزاں بہ راہ افتم در گوشہ بے توشہ با خامہ سیاہ جامہ ہم زبانم و ہم از مژہ شورابہ بار۔ و ہم از رگ خامہ خوننابہ فشان[۵]

بُریدہ ستم و بے برگ خدایا تا چند
بہ سخن شاد شوم کایں گہر از کان من است

**دہلی پر انگریزوں کا قبضہ**

۱۸ ستمبر کو شہر و قلعہ پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا۔ غالب لکھتے ہیں کہ اس کے

غوغائے زد و کُشت و گیر و دار بدیں کوچہ نیز رسید و ہمہ را از بیم دل دو نیم شد باید دانست کہ ایں کوچہ جز یک راہ و بیش از دہ دوازدہ خانہ ندارد و جز دو چاہ دریں کوئے نیست۔ بیشتر از زن و مرد بدیں نورد کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد را پشتوارہ بر دوش بدر زدند و تنے چند کہ بجا ماندہ اند بہ ہم داستانی من ..... در از درون بستند و پیرامن آں سنگ بہ سنگ بہم پیوستند۔ تا کوچہ چنانکہ بسر بستہ بود در بستہ نیز شد۔

**مہاراجہ پٹیالہ کی سعی**

اسی کوچہ میں شریف خانی خاندان مقیم تھا حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خاں کی اولاد میں سے تھے سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے محاصرہ دہلی و فتح دہلی میں انگریزوں کی پوری امداد کی تھی اور عہد لے لیا تھا کہ فتح کے بعد اس کوچے پر پہرہ بٹھا دیا جائے گا تا کہ انگریزی لشکر اہلِ کوچہ کو گزند نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر کو مہاراجہ کے سپاہی اس کوچہ کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے۔

**شہر کی حالت**

غالب لکھتے ہیں کہ ۱۵ ستمبر سے شہر کے تمام مکان اور دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ گندم فروش تھا جس سے دانہ خریدیں نہ دھوبی تھا جس سے کپڑا دھلوائیں نہ حجام تھا جس سے اصلاح بنوائیں۔ نہ خاکروب تھا جس سے مکان صاف کرائیں جب تک دروازہ کوچہ کھلا تھا۔ چیزیں لے آتے تھے لیکن جب دروازہ بند کر کے پتھر چن دیئے گئے تو جو کچھ پاس تھا اسی پہ مدارِ قوت لایموت رہ گیا۔ یہ سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو دو راتیں اور دو دن تشنگی اور

گرسنگی میں گزارے۔

**پانی کی تلاش** جب مہاراجہ کے پہرہ دار آ گئے تو انہوں نے بتایا کہ کوچہ میں چاندنی چوک تک تو پھر سکتے ہو اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ دروازہ کھولا۔ اور مختلف گھروں کے آدمی ڈول، مشک، پکھال وغیرہ لے کر پانی لانے کے لئے نکلے۔ غالب کے دو ملازم بھی ساتھ تھے میٹھا پانی دور تھا اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا ناچار نیم شور پانی لے واپس آئے۔ جو لوگ پانی لانے کے لئے گئے تھے انہوں نے واپس آکر بیان کیا لشکریوں نے چند مکانوں کے دروازے توڑے لیکن نہ آٹا ملا نہ گھی میسر آیا۔

بہ درستی کہ زندانیاں نہ زندگی میگزرانیم نہ کس مے آید کہ گفتارش بگوش خوردو نہ خود بروں رویم کہ نادیدہ دیدنیہا نگرد ہر آئینہ مے توانم گفت کہ گوشہائے ماگراست و چشمہائے ماکور و بیروں ازاں گو نگوئے و کشمکش نان ماشیریں است و آب ماشور روزے ناگہاں ابر آمد و باراں بارید چادرے بستیم و سبوہا نہادیم و آب گرفتیم گویند ابر آب از دریا بردارد و بروے زمین فرو بارد و دریں بار ابر گرانمایہ۔۔۔ آب از چشمہ زندگی آورد ہر آئینہ آنچہ سکندر در پادشاہی جست و نیافت ایں تلخ کام شورابہ آشام در تباہی یافت۔

یہ غالب کی حالت تھی جس کے کوچے کی حفاظت کے لئے مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی متعین تھے کہ پینے کو پانی میسر نہیں آتا تھا۔ مینہ برسا تو چادر باندھ کر اس میں مینہ کا پانی جمع کیا اور مٹکا بھرا اس سے اندازہ کیجیے کہ ان غریبوں اور مسکینوں کی کیا کیفیت ہوگی جن کا کوئی محافظ و نگراں اور پاسبان و یاور نہ تھا۔ حق یہ ہے کہ دہلی والوں نے جس طرح انسانی زندگی کے بہتر سے بہتر دور دیکھے اسی طرح بدتر سے بدتر دوروں میں سے بھی انہیں گزرنا پڑا۔ ان کی نگاہوں نے جہاں عظمت و جلال کے درخشاں مناظر میں صدیوں غواصی کی وہاں ان کے سروں پر سے نادر شاہی ترکتاز اور غدر کی ہنگامہ آرائی کے خونی سیلاب بھی گزرے۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان مسکینوں نے کیسے کیسے دکھ سہے ہوں گے اور کیسی کیسی سختیاں

اُٹھائی ہوں گی۔

غالب نے ضمناً اپنے خاندانی سوانح، اپنے بھائی کی دیوانگی، ان کے گھر بار کی غارتگری اور ان کی موت کے حالات بھی لکھے ہیں۔ انگریزی فوج کے ظلم اور زیادتیاں بیان کرنے میں غالب نے تامل نہیں کیا لیکن لکھتے ہیں کہ خود انگریزوں پر جو سختیاں ہو چکی تھیں ان کے انتقام میں اگر وہ دہلی میں کتوں اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تو بجا ہوتا تاہم انہوں نے اپنے غصے کو ضبط کیا۔ اور جو زیادتیاں کیں ان کی نسبت یوں سمجھ لو کہ جب کسی جگہ کو جنگ کے بعد فتح کرتے ہیں تو اس جگہ کے آدمیوں پر لازماً اس نوع کی سختیاں ہوتی ہیں۔

**اہل شہر کی پریشانیاں**

پھر فرماتے ہیں:-

> از فرو ماندگان شہر بسیارے را بروں راندہ اند و اندکے ہم چنیں در بند بیم و امید فرو ماندہ اند، در بارہ بیابان گردان سیغولہ نشین ہیچ زبان نیست مگر درو بیروں رفتگان و درون نہفتگان را درماں نیست۔ کاش درونیاں و بیرونیاں را از مرگ و زیست یک دگر آگہی بودے تا بے تابی و پراگندگی روئے نہ نمودے۔

**غالب انگریز کرنل کے پاس گئے**

۵ اکتوبر کو چند گورے کوچے کے دروازے کے پاس کی دیوار کود کر اندر آ گئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی روک تھام موثر نہ ہو سکی وہ دوسرے گھروں کو چھوڑ کر غالب کے مکان میں آ گھسے لیکن انہوں نے سامان کو ہاتھ نہ لگایا۔ بلکہ غالب کو باقر خاں، حسین علی خاں، چند ملازمین اور دوسرے ہمسایوں سمیت کرنل براؤن کے پاس لے گئے جو غالب کے مکان سے دو تیر پرتاب کے فاصلے پر قطب الدین سوداگر کے مکان میں مقیم تھے کرنل نے نام پتہ اور حالات پوچھ کر اسی روز انہیں واپس کر دیا۔

**خاندان لوہارو کی مصیبتیں**

امرائے شہر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شہر فتح ہوا تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بھی اپنے اہل و عیال سمیت تین ہاتھیوں اور چالیس گھوڑوں کے ساتھ لوہارو کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دو تین روز آرام

کی غرض سے مہرولی میں ٹھہرے لیکن اس اثنا میں لشکریوں نے ان کا سارا سامان لوٹ لیا۔ اور صرف تین ہاتھی باقی رہ گئے وہ بے سروسامانی کے عالم میں دوجانہ پہنچے جہاں حسن علی خاں رئیس دوجانہ نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو پادشاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ کمشنر دہلی کو ان کے حالات کی اطلاع ملی تو امین الدین اور ضیاء الدین کو اپنے پاس بلالیا۔ اور درشت گفتگو کی لیکن نرم جواب سن کر کچھ نہ کہا اور دیوان خانساماں کے پہلو میں قلعہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جو سامان ساتھ لے کر نکلے تھے وہ مہرولی میں غارتگروں کی نذر ہوا۔ دہلی میں ان کے مکان میں پتھروں اور اینٹوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی۔ زر و سیم اور گستردنی و پوشیدنی کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

**دوسرے رؤسا کی گرفتاری**

دو تین روز بعد عبدالرحمن خاں والی جھجھر کو پکڑ لائے اور دیوان عام میں ٹھہرایا۔ ۳۰ راکتوبر کو احمد علی خاں والی فرخ نگر کو لے آئے۔ ۲ رنومبر کو بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ پکڑے آئے۔ ۷ رنومبر کو راجہ بلب گڑھ گرفتار ہو کر آئے۔ دہلی کے ماتحت سات جاگیرداریاں تھیں۔ لوہارو۔ جھجھر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ، فرخ آباد، دوجانہ اور پاٹودی پانچ جاگیردار پکڑے آئے بقیہ دو معرض بیم میں تھے۔

**حسام الدین حیدر خاں کے خاندان کی تباہی**

مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں حسین مرزا مشہور کے معزز آدمیوں میں سے تھے اپنے بھرے گھر کو چھوڑ کر زن و فرزند سمیت باہر چلے گئے تھے۔ ان کا گھر لٹ گیا۔ نہایت بیش بہا ساز و سامان غارت کر اٹھالے گئے بعد ازاں مکان کو آگ لگا دی گئی جو کچھ باقی بچا تھا وہ نذر آتش ہو گیا۔

**بادشاہ اور شہزادے**

شہزادوں اور پادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

> از شہزادگاں بیروں ازیں نتواں سرود کہ رندے را اژدہائے مرگ بہ دہان زخم گلولۂ تفنگ فرو بردہ چندے را در جسم بندہائے قوی بہ پھانسی کشاکش رسن رواں در تن فسرد و افسردہ چندازاں بپای زنداں نشین اند و شمردہ چندازاں دودماں آوارۂ روئے زمین۔ بر بادشاہ ارک آرامگاہ

کہ ماتم زدہ تاب و توان است فرمان گیرودار بہ انداز باز پرس روان است۔

یعنی شہزادے یا گولی سے مارے گئے یا پھانسی دیے گئے۔ جو باقی بچے وہ یا تو قید ہو گئے یا چھپ چھپا کر بھاگ نکلے اور آوارہ و سرگردان پھر رہے ہیں۔ بادشاہ ضعیف و ناتوان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے رؤسا کو ایک ایک کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ غالب کس درد سے لکھتے ہیں:۔

گوئی بدانسان گشتند کس نیارد گفت خوں بختند۔

**مسلمانوں پر سختیاں**

اب مسلمانوں کی کیفیت سنئے۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کو شہر کے اند آباد ہونے کی اجازت مل گئی لیکن غالب فرماتے ہیں کہ

مسلمانان از خانماں آوارہ را اند بسکہ از رستن سبزہ در و دیوار خانہ ہائے آناں سبز است

ہر دم از زبان سبزہ سر دیوان ایں نوا بہ گوش می خورد کہ جائے مسلماناں سبز است۔

مسلمانوں پر سختی کی کیفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص نے حاکم شہر کے پاس شکایت کی کہ شریف خانی خاندان کا مکان مہاراجہ پٹیالہ کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی جائے پناہ بن گیا ہے۔ ممکن ہے اس میں باغی بھی چھپے بیٹھے ہوں۔ ۳ر فروری ۱۸۵۸ء کو سپاہیوں کا ایک دستہ اس مکان پر پہنچا اور حکیموں کو ساٹھ آدمیوں سمیت ساتھ لے گیا۔ ۵ر فروری کو حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰی خاں اور ان کے عم زاد بھائی عبدالحکیم عرف کالے حکیم صاحب رہا ہو کر آ گئے۔ چند روز کے بعد چند اور آدمی چھوٹ آئے۔ بقیہ اپریل میں رہا ہوئے۔

**۲۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے حالات**

۲۷ر فروری کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

چوں روز شب گشت و از آں شب سہ بہرہ گزشت درد دل داد خواہاں بر ماہ شب افزو بدانساں راہ گرفت کہ نگرندگاں بے خواست فغاں بر داشتند کہ ماہ گرفت ..... داد شیداہا رنجور را بار و آزردہ مندان آنچہ در راز نہار دادند تا دانی کہ دریں شہر زنداں از شہر بیرون است زاخانہ

اندروں دریں ہر دو جا آنما یہ مردم راہم درآوروند کہ پنداری پیکر در پیکر ہے خزد۔ شمار آناں کہ ازیں ہر دو بندی خانہ در روزہائے جداگانہ بہ بخشش ریسماں جان باختہ اند فرشتہ جانستانے داند۔

غدر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے لیکن غالب ۲۶ فروری ۱۸۵۸ء کے حالات میں لکھتے ہیں:-

مسلمان در شہر از ہزار کس افزوں نیابی نامہ نگار (غالب) نیز دراں ہزار یکے است۔

گویا پانچ ماہ دس روز گزر چکنے کے بعد بھی مسلمانوں پر سختی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں ان کی تعداد ایک ہزار سے افزوں نہ تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان اس قدر دور نکل گئے تھے کہ گویا وہ دہلی کے باشندے ہی نہ تھے بہت سے شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پہ گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے بخت کی طرح سوئے پڑے تھے۔

قیمتی اشیا لٹ گئیں

غالب امیر آدمی نہ تھے۔ ان کا گزارہ پنشن اور تنخواہ پر تھا۔ آمدنی کے یہ دونوں ذریعے غدر کے ساتھ ہی مسدود ہو گئے تھے۔ اثاثہ بیت میں سے جو قیمتی چیزیں پاس تھیں۔ ان کی کیفیت سن لیجیے۔

کہ بانو (بیگم صاحبہ غالب) بے آنکہ بمن گوید چیزہائے گراں ارز از زیور و رخت ہر چہ داشت نہانی در خانہ کالے صاحب پیرزادہ فرستاد تا در آنجا در نہانخانہ نگاہ داشتند و در بہ گل انباشتند چوں لشکر آرایان شہر را کشودند و لشکریان تہیان یغما یافتند از دراں آں راز بامن در میان بیگم نہاد کار از دست رفتہ بود و رفتن و آوردن را گنجائی نہ ماندہ۔ تن در دم و خود را بداں فریفتم کہ چوں رفتنی بود نیک است کہ از خانہ من نہ رفت۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ پنشن کا سر رشتہ گم ہے۔ اوڑھنے بچھونے کی چیزیں بیچ بیچ کر تن پروری کر رہا ہوں دوسرے روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے ختم ہو جائیں گے تو برہنگی اور گرسنگی دونوں کا شکار ہو جاؤں گا۔

بہادر جنگ اور لوہارو والوں کا فیصلہ

بہادر جنگ خاں رئیس بہادر گڑھ کا فیصلہ ۵ جون کو ہوا ان کی

ریاست چھن گئی۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن مقرر ہوئی اور انہیں لاہور روانہ کر دیا گیا۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں بے گناہ ثابت ہوئے اور ان کی ریاست واپس مل گئی لیکن یہ واقعہ غالب کی ”دستنبو“ میں مذکور نہیں اس لئے کہ ”دستنبو“ میں جولائی تک کے واقعات ہیں اور امین الدین و ضیاءالدین کی جاگیر جولائی کے بعد واگزار ہوئی۔

**ناقابل بیان مصیبتیں** اب اُردو مکاتیب میں غدر کے واقعہ ہائلہ کی مرثیہ خوانی ملاحظہ فرمائیے۔ ابتدائی تحریرات اگرچہ بہت مجمل ہیں لیکن بے حد درد انگیز ہیں مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں اور غدر کے متعلق اُردو میں غالب کی غالباً یہ پہلی تحریر ہے:۔

> میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں کسی محکمہ میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض بازپرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پھر ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

> انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں۔ کچھ لکھ سکتا ہوں یا لکھنے کے قابل ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا۔ اور اب میں جو لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں بس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم ہم جیتے ہیں زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔

۹ر جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک مکتوب میں دہلی کے حالات کی بے یقینی اور بے اطمینانی کی طرف یوں اشارے فرماتے ہیں:۔

> جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال اطفال جیتا ہوں بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں قلم ہاتھ میں لئے پر جی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے۔ مگر کچھ لکھ نہیں سکتا اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

**ہولناک انقلاب** غدر ایک زلزلہ تھا جس نے سب کچھ زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ غالب کے دل پر اس انقلاب کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ ہنود کے عقیدے کے مطابق

سمجھنے لگے تھے کہ جون بدل گئی ہے جنم تبدیل ہو گیا ہے ۔ ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے ۔ اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے ۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے ۔ شعر کہے ۔ دیوان جمع کئے ۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص ۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا ۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا ۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلّی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا

پھر اپنی حالت لکھتے ہیں کہ میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں جو دیوار بہ دیوار حکیموں کے گھر ہیں جو راجہ نرندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کے ملازم ہیں ۔

راجہ نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بوقت غارت دہلی یہ لوگ محفوظ رہیں گے ۔ چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی یہاں آبیٹھے ۔ اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں ۔

**ہمہ گیر ویرانی** شہر کی بے آبادی اور ویرانی کی کیفیت بیان فرماتے ہیں :۔

مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے ۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے ۔ جاگیر دار پنشن دار دولت مند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ۔ مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے ۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں ۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں ۔

**غدر سے بے تعلقی** قلعہ کے ساتھ غالب کا بھی ویسا ہی تعلق تھا جیسا کہ دوسرے ملازمین کا لیکن غالب نے غدر میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ سرے سے قلعہ ہی نہیں گئے ۔ مگر دلچسپی ملاحظہ ہو کہ اپنی بے گناہی اور ارباب جرم و بغی کے ساتھ بے تعلقی کے ضمن میں اپنے تعلق و رابطہ دربار شاہی کو بھی بے حقیقت ظاہر کر رہے ہیں فرماتے ہیں :۔

ہیں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعین ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے ہاں سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے گئے (مثلاً لوہارو والے) یا پکڑے ہوئے (مثلاً جھجر، بلب گڑھ بہادر گڑھ فرخ نگر والے) آئے ہیں، میری کیا حقیقت ہے۔

**مارشل لا**

شہر کی ویرانی کا نوحہ ایک اور جگہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں :-

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست (مارشل لا) یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ ہی نہیں دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

**قلزم خون میں شناوری**

چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا۔ نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ مال و آبرو میں کوئی فرق نہیں آیا۔

**انگریز افسروں سے نہ ملے**

غالب نے غدر کے بعد خود بھی کسی انگریز افسر سے ملنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ دار و گیر کے زمانہ میں اکثر اشخاص اپنے بچاؤ کے لئے جھوٹے افسانے بنا بنا کر حکام کے ہاں اعتبار حاصل کرنے کی کوششیں کرنے لگے تھے۔ جھوٹے مخبروں کا بہت زور ہو گیا تھا۔ اور بہت سے آدمی ان مخبروں ہی کی غلط بیانیوں کے باعث پھانسی پا گئے۔ غالب لکھتے ہیں

فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں بلایا نہیں گیا دار و گیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز پرس

> ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں جیسا بلایا نہیں گیا۔ خود بھی بروئے کار نہیں آیا کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی مئی سے پنشن بند ہے، کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

**مسلمان ہدف ستم تھے**

جیسا کہ ”دستنبو“ میں بیان ہو چکا ہے مسلمانوں پر سب سے بڑھ کر سختی تھی۔ غالب فرماتے ہیں :-

> واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

یعنی شہر سے باہر نکلنے میں ہندو اور مسلمان برابر تھے لیکن آبادی میں ہندوؤں کے ساتھ رعایت کی گئی۔ اور مسلمانوں پر بہ دستور سختی اور شدت جاری رہی۔ غالب ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

> ابھی دیکھا چاہیئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔

**بلا اجازت قیام کی ممانعت**

غدر کے بعد کچھ مدت تک یہ حالت تھی کہ نہ باہر سے کوئی شخص بلا اجازت شہر میں آسکتا تھا اور نہ بلا اجازت خاص قیام کر سکتا تھا۔ اسی زمانے میں چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی نے غالب سے ملنے کے لئے دلی آنے کا قصد کیا۔ لیکن چودھری صاحب کے چچا نے انہیں روک دیا۔ چودھری صاحب نے غالب کو یہ کیفیت لکھی اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

> آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی گمان نہ کیجیے گا کہ دلی کی عملداری میرٹھ، آگرہ یا بلاد شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے ہو وہ ویسا ہی عمل کرے۔

دہلی والوں پر جو مسلسل سختیاں ہو رہی تھیں ان کی کیفیت ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

> رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً برے

ٹھہر گئے ہیں۔ یہ داغ ان کی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

میر مہدی مجروح نے پنشن کے متعلق پوچھا۔ انہیں لکھتے ہیں :-

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔

**شہر سے باہر کے مکانوں کا انہدام**

مسلمانوں کو مدت تک شہر میں آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ناچار ان میں سے بعض نے شہر کے باہر مکان بنانے شروع کئے لیکن حکم ہوا کہ یہ مکان منہدم کردیئے جائیں۔ غالب لکھتے ہیں :-

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو۔ . . . . . آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون سی صورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک للہ والحکم للہ۔

**شہر کی آبادی کی افواہ**

اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء میں افواہ اڑی تھی کہ جنوری ۱۸۵۹ء سے سب لوگوں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ غالب کہتے ہیں :-

خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے اور سارے شہر میں شہرہ ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے۔ اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔

یہ افواہ غلط نکلی۔ کافی دیر کے بعد پہلے یہ حکم ہوا کہ صرف مالکان مکان شہر میں آباد ہوں

کرایہ دار آباد نہ ہوں۔ بعد ازاں کرایہ داروں کو بھی آبادی کی اجازت ملی غالب ۹ نومبر ۱۸۵۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آ رہیں مگر سرکار کو کرایہ دیں

شہر کے دروازوں پر پہرے

انگریز ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے لیکن جنوری ۱۸۵۹ء تک شہر کے دروازوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے۔ تین چار روز کے بعد واپس آئے تو ایک خط میں مجروح کو لکھتے ہیں؎

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ان حالات کا اندازہ کیجئے اور سوچئے کہ اہل شہر کی کیا کیفیت ہو گی۔

ایک اور خط میں جو اواخر مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے لکھتے ہیں:۔

اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایہ کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہو گئے تھے۔ کہ پھر وہ

قاعدہ مٹ گیا اب خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔

**مسلمانوں کے املاک** دسمبر ۱۸۵۹ء کے آخر میں مسلمانوں کی املاک واگزاشت ہوئیں غالب لکھتے ہیں:

مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے جن کو کرایہ پر ملی ہیں ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ یکم جنوری سنہ ہے۔ پہر دن چڑھا ہے کہ تم کو (میر مہدی مجروح کو) یہ خط لکھ رہا ہوں اگر مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پا کر چاہو یہیں رہو چاہو چلے جاؤ۔

**شراب ناپید تھی** غالب کے لئے غدر کے بعد ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ شراب نہیں ملتی تھی یا بہت گراں ملتی تھی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

نہ کہیں جانے کا ٹھکانا ہے نہ کوئی میرے پاس آنے والا وہ عرق جو بقدر ضرورت طاقت بنائے رکھتا تھا میسر نہیں۔

۱۲؍ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں بابو گوبند سہائے کو لکھتے ہیں:۔

دو قسم کی انگریزی شراب ایک نوکاس شیلن اور ایک اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں سے تم دریافت کرو ان کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بہ طریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں ..... جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔

Department of Compensation

**محکمہ معاوضہ** کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک محکمہ معاوضہ قائم ہوا تھا۔ غالب اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے قائم ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ رعیت کا مال جو کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب دہ یک (یعنی دس روپے میں سے ایک روپیہ) سرکار سے ہوگا یعنی ہزار میں سے ایک سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری

ہے وہ ہدر اور بحل ہے اس کا معاوضہ نہ ہوگا ۔

ظاہر ہے کہ کالوں کے ہاتھوں وہی لوگ لٹے ہوں گے جو انگریزوں کے وفادار تھے یا جن پر وفاداری کے شبہ کی گنجائش تھی۔ ان کو معاوضہ ملا۔ جو لوگ گوروں کے ہاتھوں لٹے وہ زیادہ تر بے گناہ تھے زیادہ تر بے قصور تھے۔ اکثر وہ تھے جنہوں نے غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کا گناہ محض یہ تھا کہ وہ دہلی کے باشندے تھے اور غدر ہو جانے پر بھی انھوں نے دہلی کی سکونت ترک نہ کی۔ مثلاً خود غالب کے بھائی کا مکان لٹا۔ غالب کی بیگم صاحبہ کا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں لٹیں۔ لوہارو والوں کا گھر لٹا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی انگریزوں سے باغی نہ تھا اور نہ غدر میں کسی نے حصہ لیا لیکن ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہ ملا۔

**دوستوں کی مفارقت کا قلق**

غالب کو ایک بڑا رنج اس بات کا تھا کہ ان کے اکثر دوست اور ملنے والے غدر میں مارے گئے یا تباہ ہو گئے۔ وہ فرماتے ہیں :-

> کوئی نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا ۔

پھر لکھتے ہیں :-

> بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی ملک عدم ہو گئے سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں جو دو چار باقی رہے ہیں خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں ۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

> ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں۔ اور کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غمخوار نہیں اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

> سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں (غدر میں) تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچا ہو گا۔

دہلی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ غالب بہت معزز تھے۔ تمام حکام ان سے دوستانہ ملتے تھے لیکن غدر میں ہر شے منقلب ہو گئی۔ غالب فرماتے ہیں :۔

> نہ وہ حکام جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ جن سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں یا حافظ و یا حفیظ ورد زباں ہے۔

**فقیر و صاحب اسلحہ پر پابندی**

جب خاص پابندیاں اٹھ گئیں اور شہر میں آمد و رفت کی اجازت ہو گئی تو فقیر اور صاحب اسلحہ اس آزادی سے مستثنیٰ تھے۔ غالب لکھتے ہیں :۔

> فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو وہ نہ آئے۔ باقی ہندو مسلمان عورت مرد سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے۔ چلا آئے۔ مگر بغیر اجازت کے رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔

**شہر میں کون تھا**

اسی زمانے میں منشی شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق آگرہ نے اخبار نکالا تھا اور غالب سے خریدار مہیا کرنے کی استدعا کی تھی۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے :۔

> یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں بہت سخی ہو گئے تو جنس پوری دیں گے۔ کاغذ (اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔

غالب کے کمالات نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضمناً بعض نہایت اہم باتیں

فرما جاتے ہیں۔ مثلاً خریداری اخبار کے ضمن میں مہاجنوں کے کیرکٹر کا پورا نقشہ چند الفاظ میں کھینچ دیا۔ ایک اور خط میں اسی قسم کی خواہش کا جواب یوں دیتے ہیں:-

> مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں[۵۱]، نواب حامد علی خاں[۵۲]، حکیم احسن اللہ خاں[۵۳]، سو ان کا یہ حال کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے آفتاب عالمتاب کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ مکرر حالات دربار شاہی کیوں لیں گے۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں۔

**ٹکٹ** دہلی کی فتح کے بعد اول کسی کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت نہ تھی پہلے ہندوؤں کو اجازت ملی بہت دیر بعد مسلمان مکان داروں کو اجازت ملی۔ پھر کرایہ داروں کو بھی اجازت ملی کہ شہر میں رہیں لیکن کرایہ سرکار کو دیں۔ اس دوران میں ٹکٹ بھی جاری ہو گئے تھے جن کے بغیر شہر میں جانے یا باہر نکلنے یا پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ٹکٹ قیمتاً ملتے تھے اور ہر شخص کی حیثیت کا اندازہ کر کے ٹکٹ کی قیمت کا تعین حاکم کی رائے پر موقوف تھا۔

---

[۵۱] نجابت علی خاں والی جھجھر کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے بڑے بھائی فیض محمد کی ریاست کے زمانے میں ہی نیل رہے فیض محمد کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے بیٹے فیض علی خاں مسند نشین ہوئے تو ان میں حسن علی خاں میں اختلاف ہو گیا۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ انگریزی حکومت نے صلح کرائی حسن علی خاں کا تین ہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہوا جو ریذیڈنسی کی معرفت انہیں ملتا تھا اور وہ دہلی میں مقیم ہو گئے۔ غدر کے دنوں میں کبھی کبھی بادشاہ کے پاس جاتے تھے جب انگریز دہلی پر قابض ہوئے تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے کچھ مدت روپوش رہے اور یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو واپس آئے۔

[۵۲] نواب حامد علی خاں اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر شاہ اودھ کے داماد تھے ان کی بیوی کو باپ کے ترکہ سے نو لاکھ روپیہ ملا تھا۔ حامد علی خاں دہلی چلے آئے۔ روپیہ شاہی خزانہ میں جمع کرا دیا جس کا سود ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ وہ بہادر شاہ کے وزیر بھی بن گئے تھے۔ غدر کے بعد چودہ مہینے حوالات میں رہے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔

[۵۳] دہلی کے مشہور امرا میں سے تھے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں میں نے بھی دیکھے فارسی عبارت یہ ہے "ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ" مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے کل اتوار تعطیل ہے پرسوں دوشنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں

منشی تفتہ کو لکھتے ہیں :-

یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔

تھانوں پر حکم پہنچ گیا تھا کہ دریافت کرو کون کون بے ٹکٹ مقیم ہے :-

سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے۔ اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ عبارت یہ کہ اسد اللہ پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالہ والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے وقت میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا اب حاکم وقت کو اختیار ہے" پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں ان دنوں دوجانہ میں تھے۔ انہوں نے لکھا کہ دوجانہ آجائیے۔ لیکن غالب نے جواب دیا کہ ٹکٹ کے بغیر باہر نکلنا غیر ممکن ہے پھر میں کیوں کر آؤں[۵۱]۔ یوسف مرزا کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ٹکٹ موقوف ہو گیا[۵۲]۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۰ء سے پہلے کا نہیں لیکن اس کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔

---

[۵۱] اردوئے معلٰی صفحہ ۱۸۳ [۵۲] اردوئے معلٰی صفحہ ۲۷۱۔

**سکوں کا الزام**

باغیوں کی حمایت کے متعلق غالب کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ تھی لیکن کسی شخص نے کہہ دیا کہ غالب نے بہادر شاہ کے سکے کہے تھے۔ حالانکہ یہ سکے ذوق نے شاہ مرحوم کی تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۳۷ء میں کہے تھے اور یہ اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر علی نے اپنے اخبار میں جس کا نام اردو اخبار تھا چھاپ دیئے تھے۔ غالب کو غدر کے بعد اردو اخبار کے فائل کی ضرورت پیش آئی تاکہ اس قاطع شہادت کی بنا پر اپنی بے گناہی ثابت کر سکیں۔ زمانہ اتنا نازک تھا کہ حکام جس کے خلاف شرکت غدر کا الزام سن لیتے تھے۔ اسے جلد سے جلد سزا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ غالب چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

> مولوی باقر علی دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار مہینے میں چار بار نکلتا ہے۔ بیشتر "دہلی اردو اخبار" بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھتے ہیں اگر احیاناً آپ کے یا آپ کے کسی دوست کے پاس جمع ہوتے چلے آئے ہیں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق جن میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر ہو اور میاں ذوق کے دو سکے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا بجنسہ میرے پاس بھیج دیجیے۔ معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں۔ اور ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے بعد یہ سکے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً چار پانچ مہینے کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے۔ کہ اگر یہ مثل کسی اور شہر میں کوئی صاحب آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس کا علم ہو تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔

چودھری صاحب نے بہت کوشش کی لیکن اخبار نہ مل سکے۔ غالب نے "جام جہاں نما" والوں کو کلکتہ بھی لکھا لیکن "دہلی اردو اخبار" کا مطلوبہ فائل وہاں سے بھی نہ ملا اور اضطراب بہ دستور باقی رہا۔ چودھری صاحب ہی کو لکھتے ہیں :-

> سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب، کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دو نو

سکے ایک وقت میں لکھے گئے ہیں ..... ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں سے تھے انہوں نے "دلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا، پنشن بھی گیا۔ اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی ہے اس کا گلہ کیا ہے۔

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور است
بیداد نبود آنچہ بماز آسماں رسد

یوسف میرزا کو بھی اردو اخبار کی تلاش کے لیے لکھتے ہیں[1]:—

**اپنے دل کو تسلی دینے کا طریق**

بہر حال یہ معلوم ہے کہ غالبؔ نے سکّے نہیں کہے تھے لیکن بصورت عدم دستیابی ثبوت و شہادت غالبؔ نے اپنے دل کی تسلی کے لیے بعض عذرات تلاش کر لیے یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:—

میں نے سکہ نہیں کہا اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار (عفو عام) بھی اسے مٹا نہ سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا۔ اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

آخری فقرے میں کیسا بلیغ نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ بہنوئی کو اپنی بیوی کے بھائی کی موت یا مصیبت پر کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو لیکن وہ اس رنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو سالے کو بہن کے خاوند

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۷۔

ہبت و آفت نازل ہونے کی حالت میں ہو سکتا ہے۔ غالب اپنے خطوں میں اس
کے بلیغ جملے عموماً بلا تکلف لکھ جاتے ہیں۔

کا انتظام | فتح دہلی کے بعد پہلی مرتبہ شہر میں چنگی خانے مقرر ہوئے تھے۔ غالب فرماتے ہیں:

> شہر کا حال جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی[1] کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:-

> پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ رنومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنامل، ہیش داس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بہ طریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس نہیں جس پر محصول نہ ہو۔

ی گرانی | اس زمانے میں غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ غالب اس گرانی کی کیفیت ان لفظوں
ں بیان فرماتے ہیں:-

> غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔

ذرا اپنے زمانے کی حالت کو سامنے رکھ کر اس گرانی کا اندازہ فرمائیے۔ غالب ان
خوں کی بنا پر جو ہمارے نزدیک اعلیٰ درجے کی ارزانی کے نرخ ہیں فرماتے ہیں کہ "میوہ کے
ول اناج بکتا ہے" انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد ایسا دور آنے والا ہے جس میں گرانی کے
نرخ انتہائی کشائش کے نرخوں کے مقابلے میں بھی ارزاں ہوں گے۔

چراغاں | یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو دہلی میں چراغاں کا حکم ہوا غالب فرماتے ہیں:-

> فقیر بھی اس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پایا اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

مختلف عمارتوں کا انہدام | انگریزوں کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد جگہ جگہ سے شہر منہدم ہونا شروع
ہو گیا تھا۔ نئی نئی سڑکوں کی تجویزیں تھیں۔ ریل کی سڑک بننے کی افواہ تھی۔ غالب بربادی کا جو منظر

---

[1] لہ ٹاؤن ڈیوٹی۔

پہلے دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد انہدام شہر ان کے قلب حزیں کے لئے کیوں سخت قلق انگیز نہ ہوتا۔ چنانچہ ان کے مکاتیب انہدام شہر پر رنج کے تذکروں سے لبریز ہیں لیکن اس رنج کا تفصیلی اظہار صرف انہی لوگوں کے نام کے خطوں میں ہے جو یا تو خود دہلی کے رہنے والے تھے یا اس کے مختلف حصوں سے پوری واقفیت رکھتے تھے بقیہ خطوں میں تفصیلی ذکر موجود نہیں۔

**جامع مسجد کے گرد میدان** میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :۔

> جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دار البقا[لہ] فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے۔

**کشمیری کٹرہ گر گیا** پھر فرماتے ہیں :۔

> کشمیری کٹرہ گر گیا ہے وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھڑیاں دور و یہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔

**دکانوں کا انہدام اور کنوئیں کی بندش** ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ خشت خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر دیا۔

**دہلی کے ہنگامے** ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

> بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

میر مہدی نے اپنے آنے کا ذکر کیا تھا انہیں لکھتے ہیں :۔

---

[لہ] جامع مسجد کے پاس مفتی صدر الدین آزردہ کی قائم کی ہوئی درسگاہ تھی۔

تم آتے ہو تو چلے آؤ جان نثار خاں کے چھتے کی اور خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھتے جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا اور جامع مسجد کے گرد ستر گز کا میدان نکلنا سن جاؤ۔

**غبارِ چشم کی علت** میر مہدی کی آنکھیں دکھنی آگئی تھیں۔ غالب اس آزار کو بھی دہلی کے انہدام کا نتیجہ قرار دیتے ہیں :۔

تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اڑی اس کو آپ نے ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔[۵]

**اہلِ دلی کی زبان** میر مہدی مجروح نے ایک غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی جس کے مقطع کا مصرعہ یہ تھا ع

میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے

اس مصرع نے غالب کے سارے درد کا تار چھیڑ دیا فرماتے ہیں :۔

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی "میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے" ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"قاری کا کنواں بند ہو گیا لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس طرف کو کئی بانس نشیب تھا

---

[۵] غالب کا روزنامچہ غدر خواجہ حسن نظامی صاحب نے مرتب فرمایا ہے اس میں اس اقتباس کو غالب کی حبِ وطن کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے اور میر مہدی مجروح کے نام کے خط کو غالب کی مستقل تحریر ظاہر کرنے کے لیے آخری فقرہ میں سے "آپ نے" کے مخاطب کو حذف کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ غالب کو دہلی سے انتہائی محبت تھی لیکن اس کا ثبوت وہ نہیں جو خواجہ صاحب نے پیش فرمایا۔ یہ آنکھیں میر مہدی کی دکھنی تھیں نہ کہ غالب کی۔ آشوبِ چشم کی اس شاعرانہ توجیہ کے پیدا کنندہ یقیناً غالب تھے لیکن اس کے مورد مجروح تھے۔

اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا پنجابی کٹرہ دھوبی کٹرہ رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رامجی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ، و حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر کا صحرا ہو گیا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

**شہر نہیں کیمپ ہے**

یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دہلی والے اب بھی اس شہر کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔

اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

دہلی میں جو خوفناک تغیر ہوا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر کیا کہا جا سکتا تھا کہ اب یہ شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ عزیز الدین کو لکھتے ہیں:۔

صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی تھی۔ قاسم جان کی گلی خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے گھر میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ..... لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔

**اہل فوج اور اہل قلم والوں کا اختلاف**

بعض حصوں کے انہدام میں فوجیوں اور سول والوں کا اختلاف بھی تھا مثلاً غالب فرماتے ہیں:۔

فیل خانہ فلک پیرا۔ لال ڈگی سے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ الٹوا دیا ہے۔ اہل فوج (ملٹری والے) ڈھایا چاہتے ہیں۔ اہل قلم (سول والے) بچاتے ہیں پایان کار دیکھیے کیا ہو۔

**آغا باقر کا امام باڑہ** آغا باقر کا امام باڑہ ایک مشہور قدیم عمارت تھی لیکن وہ بھی ڈھادی گئی۔ غالب لکھتے ہیں:-

آغا باقر کا امام باڑہ اس کے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے۔ ایک بنیا قدیم رفیع مشہور اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں وہ سڑکیں دوڑتی ہیں ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک محل ان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگ بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔

پھر متفرق عمارتوں کے انہدام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کیوں ہیں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے شہر کو لے کے کیا چولہے میں ڈالوں۔

**سڑکوں کی افواہیں** انہدام عمارات کے وقت عجیب افواہیں تھیں کہا جاتا تھا کہ سڑکیں نکالیں گی غالب فرماتے ہیں:-

شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی کچھ بھی نہ ہوا مر مٹ کر ایک جان نثار خان کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔

نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:-

میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے..... ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

**شاہی خاندان کے افراد** شاہی خاندان کے افراد کی مصیبتیں قابل بیان نہیں غالب ایک موقع پر لکھتے ہیں:-

معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف تھے پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان ہیں کسبیاں۔

غالب نے "دستنبو" آگرہ میں چھپوائی تھی۔ اس کی چند جلدیں حکام کی نذر کے لیے عمدہ بنوائی

منظور تھیں۔ تفتہ کو لکھا کہ آگرہ میں جلدیں بھی بنوا دو۔ تفتہ نے غالبًا جواب دیا کہ جلدیں اپنے سامنے دلی میں بنوا لیجیے۔ اس پر لکھتے ہیں:۔

> میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو
> یہاں جلد بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں۔

**تیشہ اور کلند کی طغیانی** ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

> یہاں شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔

**دہلی اور لکھنؤ کا مقابلہ** ایک مکتوب میں لکھنؤ اور دلی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> بھائی لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری (یعنی ملکی حکومت) میں ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ و فساد (غدر) سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ امرا و شرفا سے حکام کی ملاقاتیں۔ قدر و تعظیم و توقیر۔ پنشن کی تقسیم علی العموم۔ آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال نرمی اور تلطف سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

گویا دلی میں نہ حکام امرا و شرفا سے ملنا پسند کرتے تھے۔ نہ ان کی مناسب توقیر و تعظیم کی طرف متوجہ تھے۔ نہ پنشن داروں کو پنشنیں ملتی تھیں۔ نہ آبادی کا حکم عام تھا اور نہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور تلطف کا برتاؤ مرعی تھا۔

سیف الحق سیاح سنہ ۱۸۶ء کے وسط میں لکھنؤ گئے تھے۔ انہوں نے غالبؔ کو لکھا تھا کہ لکھ میں بھی عمارتیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ جواب میں غالب لکھتے ہیں:۔

> لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم یاد رکھو کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہوگا۔ یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی۔ بازار اچھے نکل آئیں گے جو دیکھے گا داد دے گا۔ اور دلی کے

فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے۔ سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر بہت سختیاں ہونے لگی تھیں۔ غالب نے لکھنؤ کے مقابلے میں بھی اس کیفیت کو درد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں:-

> وہاں (لکھنؤ) کے صاحب کمشنر بہادر نے جو دیکھا کہ عملہ میں ہنود بھرے ہوئے ہیں اہل اسلام نہیں ہیں۔ ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ تو آفت دلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔

**مولانا فضل حق خیرآبادی**

غدر کے الم نامہ کا ایک خونچکاں باب اکابر علم و جاہ کی مصیبتیں ہیں۔ غالب کے مکاتیب میں اس کے متعلق بھی کافی مواد موجود ہے۔ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی دور آخر میں معقول کے امام تھے۔ ان کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ جب عدالت دہلی کی سررشتہ داری سے مستعفی ہوئے تو نواب فیض محمد خاں والی جھجر نے پانسو روپیہ ماہانہ کی تنخواہ ان کے لئے مقرر کردی[1] جب دہلی سے ان کی روانگی کا وقت آیا۔ تو بہادر شاہ اس زمانے میں ولیعہد تھے انہوں نے مولانا کو طلب کر کے دوشالہ ملبوس خاص ان کے کندھوں پر رکھ دیا آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے:-

> شہا مے گویند کہ من رخصت مے شوم مرا جز اینکہ بپذیرم گزیر نیست اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بہ زبان نمے رسد الا بہ ہزار جر ثقیل[2]۔

غدر کے بعد مولانا بھی باغیوں کی اعانت سے متہم ہوئے اور انہیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ غالب یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:-

> مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا ٹاپا

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۸ [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۷ ۔

ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میاں داد خاں سیاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو غالب انہیں ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

ہاں خاں صاحب آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی۔ وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ گزارا کس طرح ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق نے انڈمان ہی میں وفات پائی غالب نے "نامہ غالب" میں ایک موقع پر مولانا کے ایک رسالہ سے اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے "فخر الفضلا، ختم العلما، امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق رحمۃ اللہ علیہ" گویا "نامہ غالب" کی ترتیب کے وقت مولانا فضل حق کا انتقال ہو چکا تھا۔

**مفتی صدر الدین آزردہ**

مفتی صدر الدین صاحب آزردہ دور آخر کے نہایت فاضل بزرگ تھے۔ دینی علوم کے فیضان کا وسیع سلسلہ آپ کی ذات گرامی سے جاری ہوا۔ آپ دہلی کے صدر الصدور تھے ایک موقع پر غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش ہوا۔ غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر جواب دعوے میں یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مرحوم مسکرائے۔ غالب کے خلاف ڈگری دے دی لیکن ڈگری کا روپیہ اپنی جیب سے ادا کر دیا۔

مفتی صاحب کے ساتھ غالب کے تعلقات نہایت گہرے تھے غدر میں ان پر بھی آفت نازل ہوئی یہ داستان خود غالب ہی کی زبان سے سنیئے :۔

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے کورٹ میں

---

؎ عود ہندی صفحہ ۱۴۵

مقدمہ پیش ہوا روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی واگزاشت شدہ جائداد کا کرایہ صرف چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔ لیکن ان کی نیک دلی اور غربا پروری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض متعلقین کی اولاد کی پرورش بھی اپنے ذمے رکھی تھی۔ اور اس ذمہ داری سے انقلاب روزگار کے بعد افلاس کے عالم میں بھی انہوں نے کنارہ کشی گوارا نہ فرمائی۔ غالب لکھتے ہیں :۔

> اگرچہ یہ امداد (کرایہ) ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ ایک بی بی تیس چالیس مہینے کی آمد لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں (یعنی ۸۰ برس کے قریب عمر ہے) خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔

۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ دسمبر کو حضرت مفتی صاحب پر فالج گرا تھا۔[1] پانچ چھ برس اسی حالت میں گزرے۔ سنہ ۱۲۰۴ھ میں زینت آرائے وجود ہوئے تھے "چراغ" تاریخ ولادت تھی۔ اکاسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۸۵ھ میں یہ چراغ علم و فضل خاموش ہو گیا۔ اعلٰے درجے کی کشائش کا دور بھی انتہائی سلامت روی میں گزارا اور زندگی کے آخری بارہ سال بھی جو شدید مصیبتوں کے سال تھے صبر و استقلال کے ساتھ گزارے رحمہ اللہ تعالےٰ۔ جامع مسجد کے پاس "دار البقاء" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کر رکھی تھی جو غدر کے بعد تزئین شہر کی اسکیموں کے سلسلے میں منہدم کر دی گئی۔

### نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

غالب کے ایک نہایت عزیز دوست اور مخلص قدرداں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ تھے

---

[1] اردوئے معلٰے صفحہ ۳۴۳

جو ایک بلند پایہ امیر ہونے کے علاوہ زہد و اتقا، علم و فضل اور ذوق شعر و سخن کے اعتبار سے دور آخر کے ایک نہایت گرانمایہ وجود تھے نواب صاحب مرحوم عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضے خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کی تو نواب مرتضے خاں بہادر کو حسن خدمات کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ بہ طور جاگیر عطا ہوا تھا ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد کا علاقہ جو راجہ لکھنو دس راستے کی ملکیت تھا خرید لیا۔ نواب مرتضے خاں کا انتقال ہوا تو ہوڈل پلول کی جاگیر واپس لے لی گئی اور اس کے عوض ارکان خاندان کی پنشنیں مقرر کر دی گئیں جو ۱۸۵۷ء تک جاری رہیں۔ جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مرتضے خاں نے اپنی زندگی ہی میں نواب مصطفےٰ خاں کے نام منتقل کر دیا تھا[لہ] ۱۲۵۵ھ (مطابق ۱۸۳۹ء) میں نواب صاحب نے حج کا سفر اختیار فرمایا جس کے تفصیلی حالات ان کے سفرنامہ موسوم بہ "رہ آورد" میں مرقوم ہیں۔ غدر کے دنوں میں وہ جہانگیر آباد میں تھے جب فتنہ و فساد کی ہمہ گیری کے باعث یہ مقام خطرے میں پڑ گیا تو نواب صاحب سب کچھ چھوڑ کر اپنے دوست عبد اللطیف خاں کے پاس خان پور چلے گئے۔ ٹھاکروں نے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ جما لیا۔ نواب صاحب کے عالی شان محلوں میں آگ لگا دی۔ سارا قیمتی سامان جلا کر خاک کر ڈالا۔ حتیٰ کہ ان کا گراں بہا کتب خانہ بھی شعلوں کی نذر ہو گیا حسن اتفاق سے رام پور کی فوج اس راستے سے گزری اور اسے حالات کا علم ہوا تو اس فوج نے ٹھاکروں کو شکست دے کر جہانگیر آباد پر نواب صاحب کو دوبارہ قبضہ دلایا لیکن نیرنگی روزگار ملاحظہ ہو کہ یہ تمام نقصان اور مصیبتیں اٹھا چکنے کے بعد نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا وہ گرفتار ہو گئے اور نہ محض ان کی جائداد ہی ضبط ہوئی بلکہ سات سال کی قید کی سزا بھی ہو گئی۔ غالب لکھتے ہیں:۔

مصطفےٰ خاں کا حال سنا ہوگا خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جاتے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں۔

جنوری ۱۸۵۹ء میں ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ غالب فرماتے ہیں:۔

---

[لہ] ملخصاً از مقدمہ کلیات حسرتی و شیفتہ مرتبہ جناب نظامی بدایونی۔

نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ لاچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا چار دن وہاں رہا پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔

مختلف رؤسا

دہلی کے ماتحت رؤسا کی کیفیت دستنبو کے رو سے بیان ہو چکی ہے۔ اُردو مکاتیب میں لکھتے ہیں:-

آگے کے درباروں میں سات جاگیردار رہتے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجھر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں (اول الذکر چار)، جو باقی رہے ان میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر، اگر ہانسی حصار کے کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین نہیں ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم، مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

میکش

غالب کے ایک عزیز شاگرد میر احمد حسین میکش تھے۔ اس بیچارے کا کوئی جرم اور کوئی قصور نہ تھا۔ غالب ۱۷ فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں میکش کے متعلق لکھتے ہیں:-

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آ گیا ہے دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

اسی حالت میں وہ غریب گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا پا گیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:-

> احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں مخنوق ہوا یعنی پھانسی پا گیا، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

ایک خط میں غالب اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے میکش کا تذکرہ خاص طور پر فرماتے ہیں۔

> اس چرخ کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے ایک گوشہ و توشہ تھا چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎
>
> سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
> اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

> کل سے میکش مجھ کو بہت یاد آتا ہے سو صاحب اب تم (میر مہدی مجروح) ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں۔ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔

**غلام فخرالدین**

علی بخش خاں رنجور کے صاحبزادے اور غالب کے بھائی میرزا یوسف خاں کے داماد غلام فخرالدین خاں بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ بہادر شاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم تھے اور بادشاہ کے حکم کے مطابق وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:

> غلام فخرالدین خاں کی دو روبکاریاں ہوئی ہیں صورت اچھی ہے خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

حکیم غلام نجف خاں نے غلام فخرالدین خاں کی رہائی پر لکھا تھا کہ دوبارہ زندگی پائی۔ غالب لکھتے ہیں:

> ہاں غلام فخرالدین خاں کی رہائی زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔

**بہادر شاہ**

بہادر شاہ غفران مکان سے متعلق غالب کے اردو مکاتیب میں صرف دو جگہ ذکر ہے اول میر مہدی مجروح نے پوچھا تھا کہ "دستنبو" میں بہادر شاہ کے دہلی سے رخصت ہونے کے حالات کیوں نہیں لکھے۔ غالب فرماتے ہیں:

بھائی میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا ان کو جاگیر اگست میں ملی بادشاہ اکتوبر (۱۸۵۸ء) میں گئے کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔

دوسری جگہ بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ہے :۔

۷ نومبر (۱۸۶۲ء) مطابق ۱۴ جمادی الاوّل سال حال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دیکھنے کو یہ چند الفاظ ہیں لیکن ایک ایک لفظ کی تہ میں درد اور حزن کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔

شاہی خاندان

شاہی خاندان کے افراد کے متعلق بعض تحریرات اوپر گزر چکی ہیں مثلاً بہت سے شہزادوں کا مارا جانا بعض کا قید ہونا۔ جو تلوار سے بچے تھے ان کا پانچ پانچ روپے پنشن پانا۔ خواتین کا گوناگوں مصائب میں مبتلا ہونا۔ غالب ان حالات [illegible] بے حد متاثر تھے۔ اور معمولی سا بہ ل جانے پر بھی اپنے اس درد کے اظہار کے لئے مضطرب رہتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنی کتاب "سنبلستان" چھپوا کر غالب کو بھیجی۔ اس کی چھپائی بہت خراب تھی۔ غالب نے چھپائی کی خرابی ہی کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بدحالیوں کے ذکر کا ذریعہ بنا فرماتے ہیں :۔

اجی میرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بُری کہانی ہے .... اس کہانی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے۔ اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پائنچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقہ خوبرو ہے مگر بدلباس ہے۔

تاج محل بیگم

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

تاج محل بیگم بہادر شاہ مرحوم (مرزا قیصر اور مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی

نوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی، دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔

مرزا الٰہی بخش

**دوسرے اکابر و احباب کے اور خود اپنے حالات یوں بیان فرماتے ہیں:-**

مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں، دیکھئے کیا ہو۔ حکیم جی کو (حکیم احسن اللہ خاں) ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں ع

تو بیکسی و غریبی نگر کہ مے پُرسد

> نہ جزا نہ سزا، نہ نفرین نہ آفرین، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی اور رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے اس کی کچھ فکر نہیں۔

**ایک اور خط میں مرزا الٰہی بخش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-**

میرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہے سلطان جی میں رہتے ہیں عذر کر رہے ہیں، دیکھئے یہ پھر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

حکیم حسن اللہ خاں

**حکیم احسن اللہ خاں کے متعلق حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-**

میاں تم کو مبارک ہو کہ حکیم پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا۔ اور ان کو حکم ہوگیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جان کے مکان میں آ رہے ہیں.... جی ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از روئے احتیاط نہیں جا سکتا۔

**بعض دوسرے اشخاص کے متعلق فرماتے ہیں:-**

میرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اس وقت سنا ہے کہ وہ خاں صاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔ قدم شریف میں وہ رہتے ہیں آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالہ گئے ہیں بہ مقتضائے وقت

اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں۔ اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانہ میں مردانہ

تلف اکابر

پھر فرماتے ہیں :-

ہے ہے کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین احمد خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے اور بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین (ابن شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں) کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے۔ وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین صاحب کی قرار پا کر ضبط ہوئی۔ اور نیلام کا روپیہ سرکار میں داخل ہوا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں۔ وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

خاندان فخر عالم

شیخ کلیم اللہ جہان آبادی اپنے زمانے کے بہت بڑے اور مشہور اہل اللہ تھے۔ ان کا مقبرہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان میدان میں ہے۔ بادشاہی کے زمانے میں مقبرے کے آس پاس ایک اچھا گاؤں آباد تھا جس میں شیخ مرحوم کی اولاد رہتی تھی۔ اسی خاندان میں مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ مرید تھے جن کے پوتے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں تھے۔ کالے میاں بہادر شاہ کے پیر تھے۔ میر ابراہیم علی خاں سورتی نے شیخ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اور قطب الدین

ابن مولانا فخر الدین کے حالات طلب کیے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:-

> خداوند نعمت کیا تم دہلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بہ دستور سمجھتے ہو جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو۔ ایں دفترا گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد، وقصاب در راہ مرد، بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا کچھ تبرکات بھی تھے اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں، کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہوگا۔

**حسام الدین حیدر کے فرزند**

مبارز الدولہ ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ دہلی کے ایک بہت بڑے امیر تھے۔ سنا گیا ہے کہ اصلاً لکھنؤ کی طرف کے تھے لیکن دہلی میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بلی ماروں میں جہاں غالب رہتے تھے ان کی عظیم الشان حویلی تھی۔ نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ نامی تخلص فرماتے تھے۔ ان کے ساتھ غالب کے روابط بہت گہرے تھے انہوں نے ۱۸۴۶ء میں وفات پائی[1]۔ ان کے بیٹے معین الدولہ عمدۃ الامرا صفدر الملک سید ذوالفقار الدین حیدر نظارت خاں بہادر ذوالفقار جنگ جو حسین مرزا کے نام سے مشہور ہیں غالب کے گہرے دوست تھے۔ حسین میرزا آغا حیدر میرزا ناظر بہادر شاہ کے داماد تھے اور ناظر صاحب کی وفات کے بعد نظارت کا کام حسین میرزا ہی کے حوالے ہوا تھا[2]۔ غدر میں ان پر جو آفت نازل ہوئی اس کی کیفیت "دستنبو" کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر شہر سے

---

[1] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۱۱۹ [2] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۸۶۔

نکل گئے۔ ان کا مکان بے طرح لوٹا گیا۔ اس کے بعد مکان کو آگ لگا دی گئی۔ مظفر الدولہ الور سے پکڑے آئے اور گوڑگانوہ میں گولی مار کر شہید کر دیئے گئے۔ حسین مرزا بیچارے سراسیمہ حال پھر رہے تھے۔ اسی اثنا میں غالب کو اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

> حسین مرزا صاحب کیوں بیمار ہوتے۔ خدایا ان آوارگان دشت غربت کو جمعیت تو جب چاہے عنایت کر۔ مگر تصدق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ حسین مرزا کی ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ یہ شدت غم و رنج کی خوبیاں ہیں۔

**حسین مرزا کی امداد**

ایک وقت تھا کہ غالب حسین مرزا کے والد کی وساطت سے قرض لیتے تھے لیکن جب حسین مرزا پر آفات و مصائب کا سیلاب آیا اور وہ بیچارے پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے تو غالب حصول قرض کے لئے حسین مرزا کے متوسل بنے۔ ایک خط میں وہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں:۔

> ابھی چنّی لال تمہارا قرضخواہ آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں۔ کہ سو دو سو روپیہ تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کھیت ہیں پانی دو تو اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا پتہ لکھوا کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے راجی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ بھیج دے تو کیا کہنا ہے۔ اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے۔ اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے

یوسف مرزا نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے اور مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدولہ حسین مرزا (جن کو غالب بعض اوقات ناظر جی لکھتے ہیں) کے بھانجے تھے۔ یوسف مرزا نے غالباً مصائب کے عالم میں اپنے نانا نانی کی خوشحالی کے زمانے کا ذکر کیا تھا

---

ل کلیات نثر فارسی صفحہ ۸۶۔

غالب انہیں لکھتے ہیں

نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں مظفرالدولہ کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلّٰی ہے یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔

**ہجوم رنج وغم**

پھر یوسف مرزا ہی کو لکھتے ہیں :-

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ میں، قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفرالدولہ، میر ناصرالدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا اُنیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے۔ مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ..... یہاں اغنیاء و امراء کے اولاد و ازواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں!

**سچی ہمدردی**

حسین مرزا نے ایک موقع پر پریشان ہو کر لکھا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ اس پر غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

تمہارے ماموں (حسین مرزا) کی دستخطی تحریر سے جو میرا حال کیا ہے۔ وہ کس زبان سے ادا

کروں۔ سب ہے حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا سرانجام نہ ہو سکے! بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی۔ عہدہ نہ سہی، حلقہ نہ سہی سو ڈیڑھ سو روپیہ ورماہہ مقرر ہو جاتا کیا مشکل تھا دلی کے آدمی خصوصاً امرا شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی۔ حیدرآباد بہت بڑا گھر ہے مگر بے ذریعہ و واسطہ کیوں کر جائے، ادھر جائے تو کس سے ملے۔ ناچار وہیں رہو کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے۔

آخری فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین مرزا کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں واجد علی شاہ کے ہاں کوشش کر رہے تھے۔ غالباً اس بنا پر کہ حسین مرزا کے والد لکھنؤ کے تھے۔

**فرخ آباد کی ریاست ضبط**

غدر کے بعد فرخ آباد کی ریاست بھی ضبط ہو گئی تھی اور تفضل حسین خاں والی فرخ آباد کی جاں بخشی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں چنانچہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:—

مجھ کو رشک آتا ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر یعنی انڈیمان کے قیدیوں پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا اہاہاہا

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

**عام تباہی**

ایک اور مکتوب میں عام تباہ حالی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

امرائے اسلام میں سے اموات گنو حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان[1] بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین احمد خاں) کی سرکار سے

---

[1] بخشیوں کا خاندان دہلی کا بہت بڑا خاندان تھا۔

تجہیز و تکفین ہوئی۔ راجا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی[1] مقتولوں میں آ گیا ہے اس کے پاس ایک پیسا نہیں ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے[2] صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ[3] کے پانسو روپے کے املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھیے کیا ہو۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔

لوہارو والوں کے اموال و اماکن کے لٹ جانے کا حال اوپر عرض کیا جا چکا ہے غارت زدہ اشیا کی بیش بہائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے صرف کتب خانہ کی قیمت کا اندازہ بیس ہزار روپے تھا[4] جن میں غالب کی اپنی نظم و نثر کے مجموعے بھی شامل تھے۔

**حامد علی خاں** نواب حامد علی خاں دہلی کے ایک بہت بڑے رئیس تھے۔ بہادر شاہ کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ یہ اعتماد الدولہ میر فضل علی وزیر نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے داماد تھے۔ اور اعتماد الدولہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے تھے۔ غدر میں ان پر بھی آفتیں نازل ہوئیں ان کی ساری جائداد ضبط ہو گئی۔ غالب ایک جگہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں:۔

> مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو۔ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا باغ کی صورت بدل گئی محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں اب پھاٹک و رستہ تا سرکوچہ دکانیں گرا دی گئیں سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا مگر یہ دیکھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے، سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا ہے۔

ایک اور خط میں غالب فرماتے ہیں کہ حامد علی خاں کرایہ کے مکان میں مع اپنی ممنوعہ

---

[1] مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں [2] نواب غلام محی الدین خاں عرف بڈھے صاحب دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن تھی۔ تین سو روپے ماہانہ بھرت پور سے ملتے تھے پانسو روپے ماہانہ کرایہ تھا [3] حکیم رکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے تھے وہاں سے پکڑے آئے لیکن بے قصور [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۲

ی رہتے ہیں۔

**م سختیاں** دہلی میں غدر کے بعد عام سختیوں کا دور شروع ہو گیا تھا کہ کسی کو بے انصافی کی تلافی ا توقع نہ رہی تھی۔ غالب حسین مرزا کو لکھتے ہیں:—

> تم اب تک سمجھے نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے جو احکام کہ دلی میں ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا کوئی مرافعہ نہیں۔

**ب لطیفہ** غالب نے انگریز حکام کی بے خبری اور ناواقفیت احوال اہل ہند کے متعلق ایک عجیب لطیفہ لھا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں یا جن کی جائدادیں نبط کی گئیں ان کے مفروضہ یا حقیقی جرائم کا امتحان کرنے والے اور ان پر حکم لگانے والے لوگ یسے تھے۔ دہلی کے آدمیوں میں ایک حافظ محمد بخش تھے جو "حافظ مموں" کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ی غدر میں پکڑے گئے لیکن بے گناہ ثابت ہو کر رہائی پا گئے۔ بعد ازاں انہوں نے املاک ی واگذاشت کے لئے درخواست دی۔ ان کا قبضہ و تصرف ثابت تھا۔ صرف حکم کی دیر تھی لیکن جب مقدمہ پیش ہوا مثل سامنے آئی تو

> حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ مموں کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ "مموں" "مموں" مشہور ہوں۔ (صاحب نے) فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ مموں بھی تم۔ سارا جہان بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں مموں اپنے گھر چلے آئے۔

**جامع مسجد** غدر کے بعد جامع مسجد بھی سرکاری قبضے میں چلی گئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ شہر پر انگریزوں کے حملے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے جامع مسجد سے نکل کر حملہ کیا تھا اور انگریزی فوج کو مار کر پیچھے ہٹا دیا تھا۔ یا اس وجہ سے کہ انگریزوں کے دل میں خیال بیٹھ گیا تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لئے جہاد کی خاص وعظ گاہ ہے۔ بہرحال بعض انگریزوں نے تجویز پیش کی تھی کہ مسجد کو گرجا بنا لیا جائے۔ مسلمان کوششیں کر رہے تھے کہ مسجد واگذار کر دی جائے۔

غالب ایک مکتوب میں سیاح کو لکھتے ہیں :-

> مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی ہیں یقین ہے کہ واگزاری کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے ہنوز بہ دستور پہرہ لگا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

اس خط پر دن اور تاریخ درج ہے یعنی "صبح سہ شنبہ ۲ ذی قعدہ و ۶ مئی" سال درج نہیں نیز اسی خط میں سیاح کو سورت پہنچنے پر مبارکباد دی گئی ہے۔ غالب کے مختلف مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح جون ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں تھے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء میں بنارس اور اکتوبر ۱۸۶۱ء اور نومبر ۱۸۶۱ء میں وہ کلکتہ میں نظر آتے ہیں۔ ۱۶ اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ سیاح سورت میں نواب میر غلام بابا خاں کے پاس تھے۔ میرا خیال ہے کہ اوپر کا خط مئی ۱۸۶۲ء مرقومہ ہے۔ گویا غدر سے پانچ برس بعد تک مسجد جامع پر سرکاری قبضہ تھا۔

دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

> مسجد جامع واگزاشت ہو گئی نیچلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنائیں انڈا، مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش مولوی صدرالدین تفضل حسین خاں تین یہ سات اور

**شہر کی بربادی** | قاضی عبدالجمیل بریلوی نے اسی زمانے میں غالب سے نثر و نظم کے مجموعے مانگے جواب میں غالب فرماتے ہیں :-

> یہ شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ امکنہ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ مل جائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا

اکابر شہر اور خود غالب کی مصیبتوں کے اور بھی کئی مرقع ہیں لیکن وہ غالب کی پنشن کی بنا بیان میں پیش ہوں گے۔

**مزید مصیبتیں** | سوئے اتفاق یہ کہ غدر کے بعد دہلی پے بہ پے مصیبتیں نازل ہوتی رہیں مثلاً ایک تو ہیضہ پھیل گیا ایک تو

کے باعث کال پڑا۔ ایک مرتبہ برسات اتنی شدت سے ہوئی کہ بہت سے مکان گر گئے۔ اور فصلیں خراب ہوگئیں غالبؔ دلی کی تمام مصیبتوں کا تذکرہ مجملاً اور برسات کا تذکرہ مفصلاً ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

برسات کا نام آگیا سو پہلے تو مجملاً سنو۔ ایک[۱] غدر کالوں کا، ایک[۲] ہنگامہ گوروں کا، ایک[۳] فتنہ انہدام مکانات کا، ایک[۴] آفت وبا کی، ایک[۵] مصیبت کال کی، اب[۶] یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو اگر کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھنے لگتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکانات گر گئے سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ "ان کال" تھا کہ مینہ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا یہ "پن کال" ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

پانچ لشکر

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :۔

پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[1] کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں، ایک بڑا لڑکا (باقر علی خاں) ایک داروغہ (کلو) خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

وبا

میر مہدی نے غالبًا پوچھا تھا کہ اب ہیضے کی کیفیت کیا ہے اس کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدرانداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ‖ ایک مرگ ناگہانی اور ہے،

---

[1] خاکیوں سے مراد انگریزی فوج ہے۔ اور یہ تشبیہ انگریزی فوج کی وردی کے رنگ پر مبنی ہے۔

**وفات کی پیشگوئی** غالب نے اپنے متعلق پیشگوئی کر رکھی تھی کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں مر جائیں گے۔ بلکہ ایک قطعہ تاریخ بھی خود ہی مرتب کر لیا تھا ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بہ پرسند در کدامیں سال　　مرد غالب بگو کہ غالب مرد

لیکن یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ اور وہ بچ رہے اسی سال ہیضے کی وبا پھوٹی تھی۔ غالب کو اپنی پیشگوئی کے خلاف نہ مرنے کا ایک دلچسپ عذر ہاتھ آ گیا۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا (ہیضہ) دیکھا جائے گا۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ۱۲۷۷ھ میں نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا[۵۱] اسی زمانے میں صاحب عالم مارہروی نے غالب کی مدح میں چند اشعار کہہ کر بھیجے تھے۔ انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ وبائے عام میں صرف اس لئے جیتا بچا کہ آپ کی مدح کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہو سکوں[۵۲]۔

**غالب کا قطعہ** دلی پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شہر کی جو حالت ہوئی تھی اس کا نقشہ غالب نے چند اردو اشعار میں بھی کھینچا تھا لیکن یہ اشعار ان کے مطبوعہ اردو دیوان میں شامل نہ ہو سکے البتہ نسخہ حمیدیہ میں اردوئے معلیٰ سے لے کر شامل کر دیئے گئے ہیں چونکہ یہ اشعار غالب کے دوسرے کلام کے خلاف عام اشاعت نہیں پا سکے اس لئے میں انہیں یہاں درج کرتا ہوں۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۰ [۵۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۱۔

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا		وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ چل کر کیا کیے شکوہ		سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم		ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

غدر کے سلسلے میں غالب کے ماتم و عزاداری کی یہ داستان غم میری رائے میں کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس داستان کا ایک حصہ ابھی باقی ہے جو غالب کی پنشن کی بندش سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے قارئین کرام آیندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں گے لیکن دوبارہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ان کے تاثرات کا نہایت صحیح مرقع ہے انہوں نے انگریزوں کی بے جا خوشامد نہیں کی اور ان کی خاطر کسی سختی یا شدت کی پردہ پوشی نہیں کی۔ جہاں انہوں نے "کالوں" کی سختیوں اور دراز دستیوں کی مذمت کی وہاں "گوروں" کی زیادتیوں کو بھی صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے میں تامل نہیں کیا۔ غدر کی وجہ سے دہلی پر جو آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔ وہ اوپر کے خونچکاں مرقع میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہیں۔ جہاں بے گناہ انگریزوں بالخصوص بچوں اور عورتوں کا قتل غالب کے لیے اذیت افزا تھا وہاں اکابر و رؤسا و عوام دہلی کی بربادیوں، پادشاہی خاندان کی الم ناکیوں نے بھی انہیں بے طرح تڑپایا اور ان کے ساز تاثرات سے ایسے خون آلود نغمے پیدا کیے جن کو سن کر آج بھی کوئی ذی احساس اور ذی تاثر انسان اشکباری سے فارغ نہیں رہ سکتا۔ آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب شاعر تھے کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنے تاثرات و احساسات کی ہمہ گیری کے باعث کائنات انسانیت کے شاعر تھے۔ یونیورسل شاعر تھے۔ اور ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ ایک مخصوص گروہ اور مخصوص جماعت

کے مخصوص تاثرات کی تابعیت قبول کریں۔ ان کی نظروں میں زیادتی اور تجاوز عن الحدود ہر حال میں برا تھا خواہ اس کے مرتکب ہندوستانی ہوتے تھے یا انگریز۔ اور الم نامہ غدر کے ہر ورق پر غالب کی یہ خصوصیت آشکارا نظر آرہی ہے۔

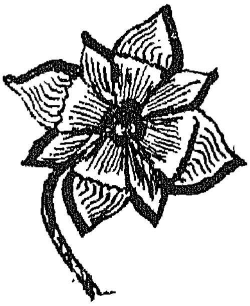

۲۲۷ ک، ا ریحانہ ذکی

# دسواں باب

## پنشن کے حصول کیلئے سعی و سفارش

پُر تہیدستم و بے برگ، خدایا تاچند
سخن شاد و شوم کاین گہر از کان من است

غالب کی درد انگیز اقتصادی حالت کا مرقع علیحدہ پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کے وسائل آمد بہت محدود تھے۔ اور خرچ اچھا خاصا امیرانہ تھا۔ غدر کے آغاز میں ان کی مستقل آمدنی کے دو ہی ذریعے تھے۔ اول قلعہ کی تنخواہ جس کی مقدار پچاس روپے ماہانہ تھی۔ دوم خاندانی پنشن جو ساڑھے سات سو روپیہ سال یا ساڑھے باسٹھ روپے مہینہ تھی۔ یہ دونوں تنخواہیں غدر کے ساتھ ہی بند ہو گئی تھیں۔ پہلی اس لئے کہ نہ غدر کے بعد غالب گھر سے نکلے۔ نہ قلعہ سے کوئی سروکار رکھا۔ نہ اس ہنگامہ آرائی میں کسی کو یہ خیال آ سکتا تھا کہ ایک خانہ نشیں شاعر یا مورخ کے واجبات باقاعدہ ادا ہونے چاہئیں جب غدر ختم ہوا تو وہ بساط ہی الٹ چکی تھی جس کے ساتھ قلعہ کی تنخواہ وابستہ تھی۔ دوسری تنخواہ اس لئے بند ہوئی کہ وہ سرکار انگریزی سے ملتی تھی اور انگریزوں کی حکومت دہلی سے اٹھ چکی تھی۔ غدر کے بعد غالب کو پنشن ملنی چاہئے تھی لیکن ان پر باغیوں کی طرفداری کا الزام عائد ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۷ء کی جو پنشن مئی کی پہلی یا دوسری تاریخ کو ملی ہو گی غالب وصول کر چکے تھے۔ ۱۱ مئی کو غدر ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اپریل ۱۸۶۰ء تک پورے تین برس غالب اس سے محروم رہے۔ مئی ۱۸۶۰ء میں تین برس کا روپیہ اکٹھا ملا۔ پنشن کے ساتھ خلعت و دربار بھی بند ہو گئے تھے ان کی بحالی میں مزید دو برس صرف ہوئے۔

غالب کی بیگم صاحبہ نے اپنا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں غالب سے مشورہ کئے بغیر کالے صاحب کے مکان کے تہ خانہ میں رکھوا دی تھیں۔ وہ انگریزی سپاہ کی غارت گری کی نذر ہو گئیں۔ کپڑوں یا دوسری چیزوں میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ فروخت کر کے کھا لیا۔

جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں مرحوم والی رام پور نے سو روپے ماہانہ کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن غالب اس سے قبل ڈیڑھ برس کی مدت میں کافی قرض لے چکے تھے۔ رام پور کا وظیفہ ان کے احتیاجات کی وسعت کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔

یوں تو غالب کی زندگی کا کوئی دور بھی کشائش، فراغت بال اور اطمینان کا دور نہ تھا لیکن غدر کے بعد کے تین سال بڑی ہی مصیبت کے سال تھے پنشن سے بھی زیادہ غالب کو خلعت اور دربار کی بندش کا قلق تھا۔ جسے وہ اپنے ذاتی اعزاز اور خاندانی وجاہت کا زوال سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے مکاتیب کا ساز درد و الم بہ طور خاص دل انگیز نغموں سے لبریز رہا۔

**حکام سے بے تعلقی** غدر میں پہلے باغیوں کے ہاتھوں پھر انگریزی فوج کے ہاتھوں شہر پر جو مصیبتیں نازل ہوئی تھیں۔ ان سے غالب کے دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے ابتدا میں انگریزی حکام کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ ہرگوپال تفتہ کو ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں رقم فرماتے ہیں :-

> کسی حاکم سے نہیں ملا کسی کو خط نہیں لکھا کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

> مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ قید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔

**پنشن کے لئے سلسلہ جنبانی**

جب رنج والم میں بہ تقاضائے مرور زمان تخفیف ہوئی اور احتیاجات نے تنگ کیا تو غالب نے پنشن کے حصول کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کردی لیکن انہیں ہر طرف سے مایوسی نظر آتی تھی۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال۔ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کو پنشن سے بھی بڑھ کر خلعت و دربار کا قلق تھا۔ مجروح نے غالباً لکھا تھا کہ پنشن کے لئے گورنر جنرل کے پاس مرافعہ کرنا چاہئے جواب میں لکھتے ہیں :-

بے مے نکند در کف من خامہ روانی

سرد است ہوا آتش بے دود کجائی

میر مہدی صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی نہیں۔ ہائے آتش سیال (شراب) کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ہائے غضب ہائے غضب۔

میاں تم پنشن پنشن کہہ رہے ہو۔ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں۔ صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار خلعت کے لالے پڑے ہوئے ہیں تم کو پنشن کا فکر ہے۔

ایک خط میں فرماتے ہیں :-

میرا دربار اور خلعت دریا برد ہو گیا۔ نہ پنشن کی توقع نہ دربار و خلعت کی صورت نہ سزا نہ انعام۔ نہ رسم معمولی قدیم۔

**دوسرے پنشن داروں کے حالات**

بعض دوسرے پنشن داروں کے اور اپنے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اسے کوئی دن ہوئے حیدر خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔

حوالات میں ہے۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو ۔۔۔۔ جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں بن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی بہنوں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بہ طریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا۔ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۳۵ برس کی پنشن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا اس وقت کلو (داروغہ) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

**پنشن کے لیے سعی کی روداد**

اب پنشن کے لیے سعی کی روداد ملاحظہ فرمائیے:۔

عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری اس پہ دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کواغذ ضمیمہ سائل کو بھیج دی جائے۔ اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چارلس سانڈرس کو لکھا۔ اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کی پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اس کو دیکھیں گے۔

**"دستنبو" کی طباعت میں عجلت کی غرض**

غالب نے "دستنبو" کے چھپوانے میں بھی اسی غرض سے عجلت کی

کتاب کے ذریعے سے حکام کے ساتھ تجدید روابط کی معقول صورت پیدا ہوجاتے۔ چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی) کو ایک خط میں لکھتے ہیں: —

> راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بہ دستور جاری ہوگئی ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب وشمال (آگرہ والے) کو نسخۂ "دستنبو" بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی شعر تحسین عبارت و قبول صدق "ارادت و مودت" بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہار تہنیت و مدح بھیجا گیا۔ اس کی رسید آگئی وہی "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب اور کاغذ افشانی انداز۔ بعد ایک قصیدہ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں۔ بتوسط چیف کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ۔ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔ جب ملے گی حضرت کو اطلاع کردی جائے گی۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے کوتوال سے غالب کے متعلق کیفیت طلب کی گئی تھی۔ فرماتے ہیں: —

> پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی اس نے اچھی لکھی۔

خوش اعتقادی

غالب بڑے خوش اعتقاد تھے۔ صاحب نے بلایا۔ اچھے انداز میں گفتگو کی۔ اور غالب کو یقین ہوگیا کہ اب پنشن ملنے والی ہے۔

> ہفتے کے دن ساتویں اگست ۱۸۵۸ء کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا کچھ سہل سوال مجھ سے کئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پہلے بھی ملتے ہیں یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے

حالانکہ اس کے بعد بھی پنشن کے حصول میں کم و بیش پونے دو برس صرف ہوئے۔ "دستنبو" کے مختلف نسخے مختلف حکام کے پاس پہنچے اور رسیدیں آنے لگیں تو پھر غالب کی کشت امید میں آبیاری کا سامان ہوا۔ اوائل مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: —

> صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا پنجشنبہ ۳ فروری

> کو میں گیا صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی، کرسی دی، بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمہارے باب میں لکھتے ہیں ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت سے گیا تھا۔ وہ پڑھوا دیا پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے۔ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک کتاب میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے۔ اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ خوش اعتقادی کی بنا پر غالب نے اپنی استفسارات کو نئی خوشگوار امیدوں کا مبنیٰ بنا لیا فرماتے ہیں:۔

> دیکھو میر مہدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر کتابوں سے کیا اطلاع پنشن کی پرسش سے کیا مدعا۔ یہ استفسار بہ حکم گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی کی ہے۔

ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتابیں لے کر گئے لیکن سانڈرس صاحب باہر چلے گئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ کتابیں ان کے منشی کے حوالے کر دی جائیں[۵۴]۔ ایک دن کے وقفے کے بعد غالب پھر ملاقات کے لئے گئے۔ سانڈرس صاحب نے بہت التفات سے باتیں کیں۔ غالب نے گورنروں کے سرٹیفکیٹ دکھائے میکلوڈ صاحب کے نام ایک خط لکھوا کر لے گئے تھے۔ وہ سانڈرس صاحب کو دیا کہ "دستنبو" کے ساتھ میکلوڈ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ پھر پنشن کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اجرٹن صاحب سے ملو[۵۵]۔ اس تحریر کا آخری حصہ غالب کی خوش اعتقادی کا ایک اور دلچسپ مرقع ہے یعنی وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب تمام مراحل طے ہو چکے ہیں۔ تمام تکلیفیں اور مصیبتیں ختم ہو چکی ہیں، صبر و ثبات کی آزمائش ہو چکی

---

[۵۴] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۱۳۶ [۵۵] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۱۳۷

ہیں کہتے کہ پنشن ملنے والی ہے۔ بلکہ اس انداز میں پنشن کا ذکر فرماتے ہیں کہ گویا سارا ان کی جیب میں پہنچ چکا ہے۔

> دیکھو سید (میر مہدی)، اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح بچایا، بائیس مہینے تک (ابتدا مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اواخر فروری ۱۸۵۹ء تک) بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس حکمت سے کہ وہ آج سلطنت دہندہ ہے میرے نفقہ کا حکم بھجوایا حکام سے مجھ کو عزت دلوائی، میرے صبر و ثبات کی داد لی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا

لیکن اس کے بعد بھی غالب پر تنگی، عسرت اور فاقہ مستی کے کم و بیش چودہ مہینے گزرنے ے تھے۔

**روں کے حالات کی جستجو** اس زمانے میں غالب مختلف افسروں کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت مضطرب رہتے تھے۔ غالباً اس خیال سے کہ شاید کوئی ایسا افسر آجائے جو ان کا ناسا ہو اور حکومت میں ان کے متعلق کوئی اچھی رپورٹ پیش کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ ن کے مکاتیب میں مختلف دوستوں سے مختلف افسروں کے متعلق جابجا استفسارات ملتے یں مثلاً منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں :—

> وہ نمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا اس میں ایڈمنسٹن صاحب کے لفٹنٹ ہونے کی اور بہت جلد آگرہ آنے کی خبر لکھی تھی[۵]۔ یہاں مجھ کو کئی باتیں پوچھنی ہیں ایک تو یہ کہ چیف سکرٹری گورنر جنرل کے تھے۔ جب یہ لفٹنٹ گورنر ہوئے تو اب چیف سکرٹری کون ہوگا یقین ہے کہ ولیم میور صاحب اس عہدے پر مامور ہوں پس اگر یونہی ہے تو ان کے محکمہ میں چیف سکرٹر کون ہوگا۔ دوسری یہ کہ میر منشی ان کے تو وہی منشی غلام غوث خاں رہ گئے.... تیسری یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میر منشی ایک بزرگ تھے بلگرام کے رہنے والے۔

---

[۵] سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن ۱۹ جنوری ۱۸۵۹ء سے لے کر ۲۷ فروری ۱۸۶۳ء تک صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہے

منشی سید جان خاں آیا اب بھی وہی ہیں یا ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں۔ ان سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں وہ اور جو نہ معلوم ہوں ان کو معلوم کرکے مجھ کو لکھئے اور جلد لکھئے اور ضرور لکھئے ۔

ایک خط میں خواجہ غلام غوث خاں بیخبر سے اس قسم کے متعدد استفسارات کئے ہیں مثلاً گورنر جنرل کا چیف سکرٹری ڈیڈمنسٹن کی جگہ کون ہوا؟ لفٹننٹ گورنر کے سکرٹری کا کام کس کے حوالے کیا گیا؟ گورنر جنرل کا دورہ کب شروع ہوگا؟[1]

**دستنبو کی رسیدوں پر خوشی**

غالب "دستنبو" کے نسخے جا بجا بھیجتے جاتے تھے اور جہاں سے رسید آتی تھی خوش ہو جاتے تھے۔ جہاں سے کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی پژمردہ ہو جاتے تھے۔ خواجہ غلام غوث خاں بیخبر نے اطلاع دی تھی کہ لفٹننٹ گورنر کے نام جو پارسل بھیجا تھا وہ مل گیا۔ اس پر خوش ہو کے لکھتے ہیں :-

> اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشت خشک سے کرے یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس سے خبر پا کر بخت کی رسائی کا سپاسگزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط معاً اس خط کے ساتھ بھیجا گیا۔ اور ہر گونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے۔ کس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ بحکمہ ایک ڈاک ایک دونوں پارسل دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا۔ جب تک حضرت اس سررشتے سے معلوم کرکے نہ لکھیں .....

ایڈمنسٹن صاحب گورنر بن کر آگرہ آ گئے تو غالب نے انہیں بھی "دستنبو" بھیجی۔ نیز گورنری ک تہنیت میں ایک فارسی قصیدہ بھیجا۔ ان کی طرف سے جواب میں ایک فارسی خط آیا جو کتاب کی رسید اور نظم کی تحسین پر مشتمل تھا بعد ازاں غالب نے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر رابرٹ منٹگمری کوبھ ایک قصیدہ مشتمل بر تہنیت و مدح بھیجا لیکن فرماتے ہیں کہ

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۱ ۔

پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں، دیر آید درست آید
اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے

لی کی مخالفانہ رپورٹ

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے سررشتۂ نظم و نسق سے غالب کے حق میں اچھی ٹ نہیں ہوئی تھی بلکہ لکھا گیا تھا کہ وہ پنشن کے مستحق نہیں لیکن صدر کے حکام نے پنشن ظوری دے دی۔ غالب خود فرماتے ہیں :-

گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دے دیا۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللّٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللّٰہی۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص گو پنشن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے۔

رجنرل کا حکم

۷ ر مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی پنشن کے چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو۔ تاکہ حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بہ طرز مناسب ہو گی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا

جن جن لوگوں کے لئے پنشنوں کی منظوریاں ہو چکی تھیں یا جن کے حق میں اچھی رپورٹیں ہو چکی تھیں اور توقع تھی کہ انہیں ضرور پنشنیں مل جائیں گی انہیں ساری چڑھی ہوئی رقمیں ملنے سے قبل ۱۸۵۹ء میں قریباً ایک ایک سال کی رقمیں یک مشت علی الحساب مل گئی تھیں غالب روری ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

علی بخش خاں پچاس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ بائیس مہینے کے از مئی ۱۸۵۷ء تا جنوری ۱۸۵۹ء گیارہ سو ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔
غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار بائیس مہینے کے بائیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو

ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں اس کو اٹھارہ سو روپے ملے یعنا جمعدار دس روپے مہینے کا سکہ لہر سال بھر کے ایک سو بیس روپے لے آیا۔ اس طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔

مدد خرچ کی شرط

اس کا نام "مدد خرچ" تھا اور اس کے حصول کے لئے اقتصادی بے مقدوری کے اظہار کے واسطے چار گواہ پیش کرنے پڑتے تھے۔ جب فروری ۱۸۵۹ء میں دوسرے پنشن داروں کو "مدد خرچ" ملا تو غالب نے بھی اس کے لئے کوشش کی تھی۔ خطوں پر خط حکام کو لکھے۔ بڑی دیر کے بعد کوتوال کے نام حکم آیا کہ:۔

> اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترہ جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے گا۔

غالب کو اس وقت کچھ نہ ملا۔ اور پورا ایک سال گزرنے کے بعد پنشن کی منظوری ہوئی صرف دفتری کارروائی کی تکمیل باقی تھی۔ کمشنر نے حکم دیا کہ اگر علی الحساب سو روپیہ لینا چاہو تو لے لو۔ غالب نے اس وقت بھی سال بھر کے روپے کا مطالبہ کیا لیکن جواب ملا جب سارا روپیہ جلد ملنے والا ہے تو اتنی بڑی رقم علی الحساب لینے کی کیا ضرورت ہے۔

تین سال کا روپیہ مل گیا

غرض ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو غالب کو تین سال کا روپیہ یک مشت ملا۔ اور آیندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کا حکم ہوا۔ ۶ مئی ۱۸۶۰ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوا۔ سات سو پچاس پاتا ہوں تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے رہے دو ہزار روپے میرا مختار کار ایک بنیا ہے۔ اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب جو

دو ہزار روپے لایا اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجئے سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کرایا گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا وہ کہتا ہے کہ پندرہ سو میرے دے دو پانسو سات باقی تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دیتے تو باقی نو سو رہتے آدھے تو لے آدھے مجھے دے پرسوں چوتھی (۴ مئی ۱۸۶۰ء) کو وہ روپے لایا کل تک قصہ نہیں چکا میں جلدی نہیں کرتا دو ایک دن بیچ میں ہیں۔ ہفتے بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔

بالکل یہی تفصیل میر مہدی مجروح کے نام کے خط میں موجود ہے[1]۔ مختار کے ساتھ فیصلے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو دینے باقی رہے اور اٹھاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مختار نے اپنے قرض کے سود میں کمی کر دی تھی۔ یا اس کا تھوڑا بہت روپیہ باقی رہ گیا تھا۔ اور غالبؔ نے اسے عام "حقوق" میں شامل نہیں کیا تھا۔

**خوشی کی دو وجہیں** پنشن کے ملنے کی ایک خوشی تو یہ تھی کہ روپیہ مل گیا تھا اور غالبؔ کو قرضخواہوں سے کم از کم تھوڑی مدت کے لئے ضرور نجات مل گئی تھی۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ عزت رہ گئی حاسدوں کے لئے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

> بات رہ گئی پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست سب شاد ہو گئے جیسا ننگا بھوکا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔

**خلعت و دربار** پنشن کا قضیہ طے ہو گیا تھا لیکن غالبؔ کے خاندانی اعزازات کی ایک بڑی چیز جو انہیں پنشن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ دربار و خلعت کی عزت تھی۔ اس عزت کی بحالی کے لئے غالبؔ

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۴۴۔

مزید دو برس جد و جہد کرنی پڑی ۔

گورنر جنرل نے سنہ ۱۸۶۰ء کے آغاز میں میرٹھ میں دربار کیا تھا۔ غالب اس امر کے متوقع تھے انہیں بھی دربار میں بلایا جائے گا لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ مناسب انتظار کے بعد وں نے خود درخواست کی کہ سابقہ قاعدے کے موافق انہیں بھی دربار میں بلایا جائے۔ جواب ا کہ نہیں ہوسکتا۔ دربار کے بعد گورنر جنرل دہلی آئے تو غالب معمول کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچے ولوی اظہار حسین صاحب میر منشی سے ملے، چیف سکرٹری کو اطلاع کرائی۔ جواب ملا کہ فرصت نہیں وسرے روز پھر گئے۔ اور اطلاع کرائی لیکن میر منشی صاحب نے جواب دیا کہ "ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو"۔

غالب فرماتے ہیں :-

> اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری (۱۸۶۳ء) میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

> میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں اپنے نام کا ٹکٹ (کارڈ) صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں ہیں گدائے مبرم اس حکم سے ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے میں نے قصیدہ حسب معمول بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ آپ یہ چیزیں ہمارے

---

یہی قصیدہ ہے جس کے متعلق یوسف میرزا کو لکھتے ہیں کہ "دو مہینے دن رات خون جگر کھایا۔ اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا محمد افضل مصور کو دے دیا وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا"۔ . . اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا کیا ہے"۔

پاس نہ بھیجا کرو۔

**جیون لال کا روزنامچہ**

میرا خیال ہے کہ نہ محض غالب بلکہ بعض دوسرے اکابر پر بھی غدر میں شرکت یا باغیوں سے اخلاص کا جو الزام لگا تھا اس کی بنا ر و اساس منشی جیون لال کا روزنامچہ تھا۔ منشی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غدر کے زمانے میں دہلی میں انگریزوں کے خاص جاسوس تھے اور شہر کے حالات کے متعلق روزانہ رپورٹیں مرتب کر کے بھیجا کرتے تھے۔ انہی رپورٹوں کا مجموعہ ان کا روزنامچہ ہے۔ اس میں جو حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض بداہتہً غلط ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر غالب کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انہوں نے انگریزوں پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں بہادر شاہ کے روبرو قصیدہ پڑھا۔ حالانکہ غالب نے ایک لمحہ کے لئے بھی گھر کے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ یا کم از کم وہ اپنے کوچے سے باہر نہیں گئے تھے۔

**اعزازات کی بحالی**

بہ ہر حال پنشن کھل گئی لیکن دربار و خلعت کی بحالی کے سلسلے میں تحقیقات ہوتی رہی۔ جب غالب بے گناہ ثابت ہوئے تو مارچ سنہ ۱۸۶۳ء میں خلعت و دربار بھی بحال ہو گئے۔ غالب لکھتے ہیں:-

> دوشنبہ ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاس کونسل حکم لکھا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔

دوسرے دن سر رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بلا کر خلعت دے دیا اور کہا کہ اگر گورنر جنرل کے دربار انبالہ میں شرکت کرو گے۔ تو وہاں بھی خلعت ملے گا۔ غالب اگرچہ لفٹننٹ گورنر صاحب سے کہہ آئے تھے کہ وہ انبالہ کہاں جائیں گے[۵۲] لیکن باوجود عدم انتظام مصارف

---

[۵۱] غدر کی صبح و شام صفحہ ۱۶۹ [۵۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۶ و ۱۱۷۔

وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے اس سے چند ماہ قبل ان کے ہاتھ پر پھنسی نکل آئی تھی جس نے سخت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی اور انہیں اپنا ارادہ سفر فسخ کرنا پڑا[۵۱]۔

گویا لارڈ کیننگ نے دربار و خلعت بند کیا تھا اور ان کے جانشین نے آکر بحال کر دیا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بیان فرماتے ہیں کہ غالب کی پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم نے خاص کوشش فرمائی تھی[۵۲]۔

خواجہ حالی نے "حیات جاوید" میں سر سید کے بیان کی بنا پر تحریر فرمایا ہے۔ کہ غالب رام پور کے پہلے سفر سے واپس ہوتے ہوئے مراد آباد پہنچے تو اس زمانہ میں سر سید مراد آباد میں صدر الصدور تھے آئین اکبری کی تقریظ کے زمانے سے سر سید کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ اس لئے غالب نے نہ رام پور جاتے وقت مراد آباد میں سر سید کو اطلاع دی تھی اور نہ آتے وقت انہیں مطلع کیا لیکن سر سید کو اطلاع مل گئی تو وہ غالب کو سرائے سے اٹھا کر مکان پر لے گئے۔ غالب پالکی سے اترے تو ان کے ہاتھ میں بوتل تھی جسے انھوں نے سر سید کے مکان میں ایسی جگہ پر رکھ دیا۔ جہاں ہر ایک آتے جانے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سر سید نے بوتل اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دی۔ غالب کو بوتل اپنی جگہ پہ نظر نہ آئی تو وہ بہت گھبرائے لیکن سر سید نے اطمینان دلایا کہ بوتل موجود ہے۔ اور دوسری جگہ رکھی ہوئی ہے۔ غالب نے اس کے دیکھنے پر اصرار کیا تو سر سید نے اندر سے جا کر دکھا دی۔ غالب نے بوتل اٹھائی تو دیکھ کر کہا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے کہ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند
چوں بہ خلوت مے روند آں کار دیگر مے کنند

دو ایک دن سر سید کے مکان پر ٹھہر کر غالب دہلی چلے آئے[۵۳]۔ خواجہ حالی نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد باہمی کشیدگی رفع ہو گئی۔ چونکہ اس زمانے میں غالب پنشن کی بندش کی وجہ سے بہت مضطرب تھے

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱ [۵۲] الہلال جلد ۴ نمبر ۲۴ صفحہ ۸ [۵۳] حیات جاوید صفحہ ۶۶ ۔

ممکن ہے سرسید نے اس ملاقات کے بعد ہی پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے لئے کوشش شروع کر دی ہو۔ پنشن غالب کو سنہ ۱۸۶۰ء میں مل گئی اور دربار و خلعت سنہ ۱۸۶۳ء میں بحال ہوئے۔ چونکہ پنشن حکام دہلی کی رائے کے خلاف صدر کے احکام کی بنا پر بحال ہوئی تھی۔ اس لئے اغلب ہے کہ اس بحالی میں سرسید کی سعی سب سے بڑھ کر موثر ہوئی ہو۔

**غالب اور غدر** مناسبت مضمون کا اقتضا یہ ہے کہ غالب نے لارڈ کیننگ، رابرٹ منٹگمری اور بعض دوسرے انگریزوں کے قصیدوں میں اپنے متعلق اور غدر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے۔

لارڈ کیننگ کے قصیدے میں فرماتے ہیں ؎

بہ کودکی شدہ ام ریزہ چین خوان نوال    نہالم از ثمر پیش رس بہ بار آمد
ولے ازاں ہمہ مال و منال توقیعی    کم است آنچہ بہ تحویل خاکسار آمد
زیک دو جرعہ فزوں فرو دریخت بہ حلق    قدح بہ دست من از دست رعشہ دار آمد
بہ پیریم ز تقاضائے طبع اوج گرائے    خیال مدح شہنشاہ روزگار آمد

پھر فرماتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا۔ وہاں سے خوشنودی کے خط آئے لیکن آسمان کہہ رہا تھا کہ دیکھیں تو کس طرح گوہر مقصود حاصل کرتا ہے۔ اسی اثنا میں غدر برپا ہو گیا ؎

بہ ناگرفت چناں صرصرے وزید بہ دہر    کزاں بہ آئینہ آسماں غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز مغز خاک انگیخت    سیاہ روسیہے کاندریں دیار آمد
تو گوئی آنچہ من آں را غبارے گویم    ز بہر کشت من ابر تگرگ بار آمد
دریں جگر گسل آشوب کز صعوبت آں    سپاہدار سپہری بہ زینہار آمد
گواہ دعویٔ غالب بہ عرض بے گنہی    ہمیں بس است کہ ہر گونہ رستگار آمد

---

خطاب و خلعت و پنشن ز شاہ مے خواہم    ہم از نخست بدیں داعیہ اصرار آمد
پس از سہ سال کہ در رنج و پیچ و تاب گذشت    سر گزارش اندوہ انتظار آمد

منٹگمری کے قصیدے میں لکھتے ہیں:-

دگر ایں فتنہ کہ برخاست ز انبوہِ سپاہ    بہ زبانے کہ قلم راست سراسر دارد
چوں دریں شہرِ ستم بہرہ کہ نامش دہلی ست    دیدم آشوب کہ ہنگامۂ محشر دارد
بندہ مے خواست کہ بیروں رود اما بوجود    نتوانست کہ از گوشہ قدم بر دارد
ماند و آئینِ وفا داشت دراں عہد ہنوز    نیز آں قاعدہ با خویش مقرر دارد
جز ثنا ہائے و دعا ہائے کہ ہمے گفت نگفت    وانچہ مے گفت دریں وقت ہم از بر دارد
دگر ایں نیز قصور ست کہ تدبیر نہ کرد    چہ کند آں کہ نہ گنجینہ نہ لشکر دارد
بود با بندہ دراں روز و ہم امروز بجاست    خشت و خاکے کہ ازاں بالش و بستر دارد
خود بریں قول کہ ماتم زدہ و مردہ دل است    دو گواہ از لبِ خشک و مژۂ تر دارد
بہ گواہانِ دگر نیز گر افتد حاجت    دمِ سرد و رخِ زرد و تنِ لاغر دارد
از تو جز داد نخواہم کہ در آئینِ وداد    ایں چنیں کار نہ پاداش نہ کیفر دارد
ہوسِ کارِ دگر نیست بہ جز شعر و شراب    اینت حرفے کہ لبم با لبِ ساغر دارد

اس قصیدے کے آخر میں بھی یہی لکھتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ لکھ کر بھیجا وہاں سے دو خوشنودی نامے آئے نیز گورنروں نے خط بھیجے۔

ایڈمنسٹن صاحب کے قصیدے میں فرماتے ہیں :—

از حضرت شہنشہ[۱] خاطر نشانِ من بود    در مزدِ مدح سنجی صد گونہ کامرانی
ناگہ ز تند بادے[۲] کاں خاست در قلمرو    برہم زد آں بنا را نیرنگِ آسمانی
در وقتِ فتنہ بودم غمگین و بود با من    زاری و بے نوائی پیری و ناتوانی
حاشا کہ بودہ باشم باغی بہ آشکارا    حاشا کہ کردہ باشم ترکِ وفا نہانی
از تہمتے کہ بر من بستند بدسگالاں    حکام راست با من یک گونہ سرگرانی
در پیریم ازیں غم جز مرگ چارہ نبود    خود پیر گشتمے من بودے اگر جوانی
دارم شگرف حالے از مرگ و زیست ہاں    جاں گرچہ ہست شیریں تلخ است زندگانی

---

۱۔ وکٹوریہ ۲۔ غدر۔

# گیارھواں باب

## عوارض اور وفات

ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے ز غالب رنجور خستہ تن یاد آر

خواجہ حالی مرحوم غالب کی شکل و صورت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے انہیں جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوشرو لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے، قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ لیکن آخری عمر میں خوراک کی قلت اور امراض کے ہجوم کی وجہ سے وہ بہت نحیف و کمزور ہو گئے تھے۔ تاہم چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس لئے اس حالت میں بھی تناور و توانا معلوم ہوتے تھے۔

حلیہ | غالب نے خود ایک خط میں جو میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام تھا۔ اپنی تصویر الفاظ میں کھینچی تھی جس سے ان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں زمانوں کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا (یعنی عالم جوانی میں) تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول
> شیخ علی حزیں ۵

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا، منہ پر ڈاڑھی، سر پہ بال، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا۔

یہ مکتوب ۱۸۵۹ء کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس کے آخر میں جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کو "دستنبو" نذر بھیجنے کا ذکر ہے۔ "دستنبو" کی طباعت نومبر ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اور ایڈمنسٹن صاحب جنوری ۱۸۵۹ء میں لفٹنٹ گورنر بنے۔

اس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ:-

(۱) غالب کشیدہ قامت تھے۔
(۲) ان کا رنگ چنپئی تھا۔
(۳) جوانی میں ڈاڑھی منڈاتے تھے۔
(۴) جب سر اور ڈاڑھی میں سفید بال آ گئے تو سر منڈانا شروع کر دیا اور ڈاڑھی چھوڑ دی۔
(۵) جوانی میں مسّی استعمال کرتے تھے۔
(۶) باسٹھ تریسٹھ برس کی عمر تک ان کے آگے کے دو دانت اُکھڑ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسّی کا استعمال ترک کر دیا تھا۔

**ابتدا میں صحت بہت اچھی تھی**

غالب کی صحت شروع میں بہت اچھی تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تحریرات میں بیماریوں اور رنجوریوں کا ذکر قریباً ناپید ہے۔ صرف مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ بوندیل کھنڈ کے نام کے ایک خط میں جو کلکتہ جانے کے دوران میں لکھا گیا

تھا۔ یہ ذکر ملتا ہے کہ انہیں باندہ کے قیام کے دوران میں بخار آ گیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

> منت الحمد کہ زحمت صداع (دردِ سر) وحمی (بخار) ہم از بانعدام اثرے در طبع نگزاشتہ ضعف اگر باقی است تردّدے نیست۔ چہ این رفیقے است کہ از وطن کمر بہمرہی بستہ است۔

**تپ لرزہ** اردو خطوط میں سب سے پہلے بیماری کا ذکر منشی ہرگوپال تفتہ کے نام کے ایک خط میں آیا ہے جو ۲ مارچ ۱۸۵۴ء کا مرقومہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۲۶ فروری ۱۸۵۴ء کو بعارضہ تپ لرزہ بیمار ہوئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

> میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔ اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ دن کو کھانا میسر ہے نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس طرفہ کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھاتے ہرگز بھوک نہیں لگی۔ اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ غالب حفظ صحت کے لئے مسہل بھی لے لیا کرتے تھے تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> میں مسہل میں ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں حفظ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے

**قولنج** مئی ۱۸۵۸ء میں قولنج کا سخت حملہ ہوا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا۔ مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنّا اور آلو بخارہ کا افشردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو (۲۴ مئی ۱۸۵۸ء) بعد دوا پینے کے تم کو خط لکھا ہے یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

**چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا**

دسمبر ۱۸۵۸ء میں قلم بناتے وقت چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

> قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے بہرحال اب اچھا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کی صحت شراب نے تباہ کی۔ ان کا جسم طبعاً قوی تھا۔ جوانی کے عالم میں شراب کے بُرے اثرات دبے رہے لیکن جب زندگی کا آفتاب نصف النہار سے آگے بڑھ کر زوال کی طرف مائل ہوا۔ اور بڑھاپا آنے لگا تو غالب کی جسمانی طاقت گھٹتی گئی اور بیماریاں بڑھتی گئیں مختلف آزار مستقل و پائدار ہوتے گئے۔ حتّٰی کہ غالب کی زندگی کے آخری نو دس سال کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کو اپنی صحت کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی اطمینان نصیب ہوا۔ اور غالباً جسمانی و مالی پریشانیوں کے اسی ہجوم کے باعث وہ آخری عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔

**۱۸۶۰ء**

۱۸۶۰ء سے ان کے خطوں میں ضعف، نقاہت، قلت غذا اور ہجوم امراض کا ذکر ایک عام چیز بن گیا تھا۔ میاں سیف الحق سیاح کو ۳۱ر دسمبر ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں ہائے کیا کسی کا اچھا شعر ہے ؎
>
> اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
> مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

**۱۸۶۱ء**

ستمبر ۱۸۶۱ء کے ایک مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

> روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے۔ اور یہی حال دیوان خانہ میں آ کر ہوتا ہے والی

رام پور سے مرشدزادہ کی شادی میں بلایا تھا یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔

سیّاح کو نومبر ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

ان دنوں صحت دماغ اور دوران سر میں اتنا مبتلا ہوں کہ والی رام پور کا بہت سا کلام بھی یونہی دھرا ہوا ہے۔ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

۱۸۶۱ء کے اواخر میں ہاتھ پر پھوڑا ہو گیا تھا جس نے نہایت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی اور اس کے علاج میں ہندوستانی جراحوں سے مایوس ہو کر غالب نے انگریزی ڈاکٹر کی طرف توجہ کی میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:۔

رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر پھنسی ہوئی پھنسی پھوڑا بنی پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا جو بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بہ قدر ایک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔

۱۸۶۲ء ۱۳ مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں:۔

چھٹا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی پھوڑا پک کر پھوٹا اور پھوٹ کر ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ استرے سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے افاقت کی صورت نظر آنے لگی ہے۔

اس کے بعد اپنی پنشن کے کھلنے، جمع شدہ روپیہ ملنے اور دربار و خلعت کے بحال ہونے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر فروری ۱۸۶۲ء میں لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے انہوں نے چپراسی بھیج کر بلایا۔

میرا یہ حال ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پھوڑوں نے بڑھ کر عارضہ فساد خون کی شکل اختیار کر لی تھی اور غالب کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ بالخصوص ٹانگوں کے پھوڑے بہت تکلیف دہ ہو گئے

تھے ۔ یہ تکلیف کافی دیر تک غالب کے لئے وبال جان بنی رہی ۔

سنہ ۱۸۶۳ء ۱۶ ؍ اگست سنہ ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

> ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں ۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ۔ طاقت نے جواب دے دیا ۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں ۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اٹھ بیٹھتا ہوں کھانا کھاکر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں ۔ حاجتی پلنگ کے پاس رہتی ہے اتر کر پیشاب کیا جاتا ہے ۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے ۔ طشت چوکی سہی مگر کبھی قدم جانا پھر آنا کیا آسان ہے ۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی ۔ اب نجات چاہتا ہوں ، بہت جیا ۔ کہاں تک جیوں گا ۔

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :۔

> شور و اورام مرض خاص اور رنج عام یہ ایک اجمال دوسرا اجمال سنو کہ مہینا بھر سے صاحب فراش ہوں ۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے ۔ پر کیا امکان ہے جو جا سکوں صبح کو نو بجے کھانا یہیں آجاتا ہے پلنگ سے کھسل پڑا ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا ۔ پھر ہاتھ دھوئے کلی کی ۔ پلنگ پر جا پڑا ۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے ۔ اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا ۔ اور پڑ رہا ۔ مدتوں سے یہ مرض ہے ۔ کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے ۔ اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بہ دم تقاضائے بول کو دیکھو ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو مسلسل بول کا عارضہ تھا جو ذیابطیس پر دال ہے ۔ پھوڑے پھنسیوں کا جسم پر نکلنا اور مدت تک اچھا نہ ہونا بھی اسی کا موید ہے ۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

> پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو ایک پھوڑا داہنے پہنچے میں جس کو ساعد کہتے ہیں ۔ دو پھوڑے بائیں پہنچے میں ۔ یہ سہل ہیں بائیں پاؤں میں کف پا

و پشت پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔ روادعات و محللات (مادہ کو ہٹانے اور تحلیل کرنے والی دوائیں) سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیم کا بھرتا باندھتے جب پکے پھوڑے تب مرہم لگاتے۔ کہو کف پا میں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا

پھر چودھری صاحب ہی کو لکھتے ہیں:—

برس دن سے فساد خون کے عوارض میں مبتلا ہوں پھوڑے اور آلام سے لد رہا ہوں۔ برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہوگئی نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی۔ اور پھوڑے تو خیر مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب دو پھوڑے ہیں کھڑا ہوا اور پنڈلیوں کی ہڈیاں چرانے لگیں۔ اور رگیں پھٹنے لگیں۔ بائیں پانو پر کف پا سے جہاں وہ پھوڑا ہے پنڈلی پر ورم ہے۔ رات دن پڑا رہتا ہوں پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے کھسل پڑا بعد رفع حاجت پھر لیٹ رہا۔ اسی صورت سے روٹی کھاتا ہوں۔ اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف، خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں دو خط چودھری صاحب کے آئے اور ایک خط شاہ عالم کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے (یعنی صاحب عالم مارہروی) . . . جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا جب یہ عبارت لکھی ۔

ایک خط میں فارسی شاعری کی مختلف طرزوں پر بحث کرتے ہوئے اُردو کے چند اچھے شعر نمونۃً لکھے ہیں جن میں ایک شعر میر تقی کا ہے۔ دوسرا سودا کا تیسرا حاتم کا اور چوتھا مومن کا پھر لکھتے ہیں

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش ہاں بیشتر یہ تیر نشتر موجود ہیں۔ مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا آئے بیٹھا ہوا ہوں دم بہ دم پانو کے ورم کی ٹیسیں ہوش اُڑائے دیتی ہے۔

قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کے نام کے ایک خط میں بھی ان آلام کا ذکر ہے[۵۱]۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے مرنے کی پیشگوئی کی تھی۔ اور تاریخ وفات بھی نکال لی تھی۔ سوء اتفاق سے اسی سال دلی میں ہیضہ کی وبا شائع ہوئی۔ غالب نے اپنی پیشگوئی کی تغلیط پر

---

[۵۱] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۸

ایک دوست کو از راہ تفنن یہ بات لکھی تھی کہ وبائے عام میں میرے لئے مرنا باعث ہتک تھا۔ قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں :-

۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ میں لکھا گیا تھا) ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں کوئی شغل کوئی اختلاط۔ کوئی مجمع پسند نہیں کتاب سے نفرت جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں گزنم

نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے کہ بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک چلا گیا ہے۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ کھانا دیوانخانہ میں منگا لیتا ہوں لیکن پیشاب کو کیوں کر نہ اٹھوں۔ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اٹھ کر بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانہ کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی آغاز فتق مزید علیہ باستزادہ ع

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرعہ بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

پھوڑوں اور پھنسیوں سے شفا یاب ہوئے تو ضعف اور بھی بڑھ گیا۔ قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں :-

اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ اور ضعف کیوں کر نہ ہو برس دن سے صاحب فراش ہوں ستر برس کی عمر ہے۔ جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا سن کہاں جو اب پھر تولید دم صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنون احسان

۱۸۶۵ء

مختلف خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۱۸۶۵ء تک فساد خون یا احتراق خون کے امراض میں مبتلا تھے۔ مثلاً حکیم غلام نجف خاں صاحب کے نام کے ایک خط میں پھوڑوں اور ناطاقتی کا ذکر ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ قبض انتہا کو پہنچ گیا ہے۔

نواب انوار الدولہ بہادر کو لکھتے ہیں :-

نہ تپ نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ ان سب سے بدتر ایک صورت پیدا ورتا یعنی احتراق کا مرض مختصر یہ کہ سر سے پانو تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑے پر ایک زخم ہر زخم ایک غار ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب، راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا ہوں گا۔ کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اٹھا تڑپا کیا پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں یہ تین حصے دن یوں گزرے پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا نئے سرے سے روح قالب میں آئی اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔

اسی خط میں آگے چل کر اپنی حالت یوں بیان کرتے ہیں :-

حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اٹھے۔

نواب انوار الدولہ نے کسی سے سنا تھا کہ غالب کا انتقال ہو گیا ہے اس واقعہ کا انہوں نے غالباً اپنے خط میں بھی ذکر کر دیا تھا غالب لکھتے ہیں :-

آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مسئلہ میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ در صورت مرگ ہم مردہ اور در حالت حیات ہم زندہ ؎[۵]

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن،
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہا ست

---

[۵] اردوئے معلی صفحہ ۱۷۹، ۱۲۷۳ھ میں غالب کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تھی ذکا حیدرآبادی نے تاریخ وفات بھی کہہ ڈالی تھی (ملاحظہ ہو خاش خماش صفحہ ۲۰۹)

۱۸۶۵ء میں ان کی مجبوری و معذوری بہت بڑھ گئی تھی۔ ۲۴ جولائی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> تین برس عوارض، احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی ...... میں اپنی زبان سے کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا، بہرا، اپاہج، بدحواس، ناتوان فلک زدہ آدمی ہوں۔

اکتوبر ۱۸۶۵ء میں غالب نواب کلب علی خاں مرحوم کے جشن مسند نشینی میں شرکت کی غرض سے رام پور گئے تھے۔ واپسی پر مرادآباد پہنچ کر بیمار ہو گئے اور پانچ روز وہاں صدر الصدور صاحب کے مہمان رہے۔

۱۸۶۶ء تدریجاً ان کی تکلیفیں عمر کی زیادتی کے ساتھ بڑھتی گئیں۔ اواخر ۱۸۶۶ء میں نواب میر غلام بابا خاں سورتی نے سورت آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے جواب میں ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:۔

> بہ سواری ریل روانہ ہونے کی ہوس دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ ان سب ضعفوں پر ضعف طالع کیوں کر قصد سفر کروں تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں (یعنی ریل کے سفر میں)، گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں کی دعوت جشن میں شرکت کے لئے تھی۔ اس کے متعلق ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

> بھئی میں بہرا ہوں گانا کیا سنوں۔ بوڑھا ہوں ناچ کیا دیکھوں۔ غذا چھ ماشے آٹا۔ کھانا کیا کھاؤں بمبئی سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو ۱۲ مئی کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

---

۱؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۳۔

آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا بہت جیا اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

تم میری بابت پوچھتے ہو۔ مگر میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں رعشہ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے مردے کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔

اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا بالکل مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں نہ روٹی نہ بوٹی نہ پلاؤ نہ خشکہ۔ آنکھوں کی بینائی میں فرق۔ ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔

۴؍ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں:۔

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر (ایک چھٹانک) شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا

اور پڑا رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخوابی نہیں ہوتا۔ بعد ادائے بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔

ان خطوط سے ظاہر ہے کہ احتراقِ خون کے مرض میں جو کم و بیش تین برس مسلط رہا غالب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ذیابطیس کا عارضہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ رات دن میں بیس پچیس بار پیشاب کی حاجت ہوتی تھی۔ کانوں سے بہرے ہو چکے تھے۔ بصارت بہت کم ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک آنکھ کی بینائی کلیتہً زائل ہو چکی تھی۔ غذا کی مقدار بے حد گھٹ گئی تھی۔ قبض کی شکایت شدید تھی اور وقتاً فوقتاً قولنج کا سخت دورہ ہوتا تھا۔ ہاتھوں پہ رعشہ طاری تھا۔

۱۸۶۷ء اب ۱۸۶۷ء کی کیفیت سنیے۔ ۲۲؍اپریل کے ایک خط میں منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں ۔۔۔۔ جس دن ذرا افاقہ پاؤں گا ان سب کو بغور دیکھوں گا

جون ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں۔ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا لکھتے ہیں:۔

میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی ۷۳ تہتر برس کی عمر انا للہ و انا الیہ راجعون

پھر لکھتے ہیں:-

سترا بہترا اردو ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے پس میں اخرف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر دوپہر کو گوشت کا پانی سرِ شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

سنہ ۱۸۶۸ء ۹۔ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں:-

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمہ گری کی شرح کے بعد ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دل آتا ہے بس اللہ ہی اللہ ہے۔

اسی حالت میں سنہ ۱۸۶۸ء ختم ہوا۔ اور سنہ ۱۸۶۹ء شروع ہو گیا۔ غالب اگرچہ ہمہ تن مجموعۂ امراض بن چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کون سا مرض بنا۔

مرض الموت خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ مرنے سے چند روز پیشتر یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ بے ہوش ہو جاتے۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوتا پھر بے ہوش ہو جاتے۔ وفات سے ایک روز پیشتر خواجہ حالی عیادت کو گئے۔ تو کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔ نواب صاحب نے حالت پوچھی تھی اس کے جواب میں لکھوایا:-

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

اسی خط میں ایک شعر بھی لکھوایا تھا جس کا صرف ایک مصرعہ خواجہ حالی کو یاد رہا ع

نہ کرد ہجر مدارا بہ من سر تو سلامت

آخری عمر میں اپنا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

**وفات** غرض ۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق آخر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو ادب و شعر کا یہ درخشاں آفتاب جس کی عالمتابی دہور ماضیہ کے لئے سرمایہ ناز اور قرون آیندہ کے لئے منار ہدایت تھی ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تمام اکابر شہر جنازے میں شریک ہوئے شیعہ حضرات اپنے طریق پر مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نے جو غالب کے مذہبی خیالات و مسلک کے سب سے بڑھ کر راز دان تھے۔ اس کی اجازت نہ دی۔ اور تمام مراسم طریق اہل سنت کے مطابق ادا کئے۔ دہلی دروازہ کے باہر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب نواب الٰہی بخش خاں معروف کے مزار کے پاس دفن کئے گئے۔ برد اللہ تعالیٰ مضجعہ۔ حالی۔ مجروح اور دوسرے شاگردوں نے پر درد مرثیہ لکھے۔

**مزار** غالب جس احاطہ میں مدفون ہیں۔ اس میں کم و بیش چوبیس قبریں ہیں احاطہ کے ارد گرد قریباً پانچ فٹ اونچی دیوار ہے۔ تمام قبروں کے متعلق ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس کس کی ہیں لیکن اتنا یقینی طور پہ معلوم ہے کہ غالب کے علاوہ اس احاطہ میں نواب الٰہی بخش خاں معروف۔ میرزا علی بخش خاں رنجور۔ نواب زین العابدین خاں عارف۔ میرزا باقر علی خاں کامل اور بیگم صاحبہ غالب بھی دفن ہیں بقیہ قبریں بھی یقیناً اسی خاندان کے افراد کی ہوں گی۔

غالب کی قبر پہ چونے کا پلستر ہے۔ سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر ؎

رشک عرفی و فخر طالب مرد    اسد اللہ خان غالب مرد

کے علاوہ میر مہدی مجروح کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں — تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح — ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

### درستی مزار کی کوششیں

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم جب اپنے مشہور اخبار "کامریڈ" کو کلکتہ سے دہلی لائے تھے۔ تو انہوں نے مزار غالبؔ کے لئے چندے کی تحریک فرمائی تھی افسوس کہ حضرت مولانا اپنی وسیع سیاسی مصروفیتوں کے باعث اس تحریک پر پوری توجہ نہ فرما سکے۔ حال میں خواجہ حسن نظامی صاحب اور بعض دوسرے اربابِ علم و ادب نے "غالبؔ سوسائٹی" کی بنیاد رکھی ہے جو مزار غالبؔ کی درستی کے علاوہ ایک غالبؔ ہال بھی بنانا چاہتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اس باب میں سعی بلیغ فرما رہے ہیں۔ غالبؔ کے احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا جسے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی (خازن غالبؔ سوسائٹی) نے اپنے پاس سے معقول قیمت دے کر خریدا اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔

ایک اور قطعہ زمین بیگم صاحبہ حکیم محمد واصل خاں مرحوم (برادر کلاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم) نے حکیم محمد احمد خاں صاحب کی سفارش سے عطا فرمایا۔ غالبؔ ہال کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت بتائی جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب فراہمی زر میں مصروف ہیں۔ متناسب رقم جمع ہو جانے پر مزار کی توسیع بھی کی جائے گی اور ہال کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا جائے گا۔

◆

# بارھواں باب

## اخلاق و عادات اور متفرق حالات

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد        بہ ہر بار زر پیل بارم دہد
کہ تا پیل زانجا بر انگیزمے        زرش بر گدایاں فرو ریزمے

غالب کے اخلاق کا باب بہت وسیع ہے لیکن ان کی نظم و نثر کے سمندر میں سے ان شہوار موتیوں کو اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہے۔ اگر راستے کی دشواری سے بے پروا ہو کر اس منزل کو طے کرنے کا قصد کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا دفتر تیار ہو جائے گا جس میں غالب کی نظم و نثر کے اکثر حصے بہ ترتیب مختلف شامل کرنے پڑیں گے۔ بلکہ بعض حصوں کو مختلف عنوانوں کے ماتحت کئی کئی مرتبہ نقل کرنا پڑے گا۔ لہٰذا میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس لذیذ حکایت کے چند نمایاں عنوانات اختصار کے ساتھ پیش کر دوں تا کہ شخص غالب کا ایک عام خاکہ آنکھوں کے سامنے آ جائے۔

**سادہ دل و راست گفتار** غالب نے ایک فارسی خط میں سراج الدین احمد خاں کو لکھا ہے:

للہ الحمد کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند ہرچہ در دل داشتم بہ زبان باز گفتم۔[1]

ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آ گئی ہے۔

**ایثار و کرم** اُردو مکاتیب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا،

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۱۰۴۔

نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں ہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

یہ شاعری نہیں سخن طرازی نہیں مبالغہ آرائی نہیں۔ بلکہ حقیقت و واقعیت ہے اور غالب کی داستان حیات کا ہر ورق اس پہ گواہ ہے۔

اسی طرح مثنوی "ابر گہربار" میں بہ سلسلہ مناجات اللہ تعالے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے کردار و افعال کا حساب نہ لے۔ اگر محاسبہ ناگزیر ہو تو پھر مجھے بھی اجازت دے تاکہ جو جو حسرتیں دل میں باقی رہیں انہیں تفصیل سے بیان کر دوں۔ تیرے محکمہ عدل و انصاف کی طرف سے جو جرم میرے ذمے ثابت ہو۔ اس کے مقابلے میں حسرتوں کی ایک صف کھڑی کر دوں۔ اس طرح تجھ پر آشکارا ہو جائے گا کہ میرے جرموں کے مقابلے میں میری حسرتیں زیادہ ہیں۔ اس ضمن میں اپنے جذبات و دواعی کو نہایت موثر طریق پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم      پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی      نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست      بہ ہنگامہ پرواز ہوشم ازوست
من اندوہگین و مے اندہ ربائے      چہ کردم اے بندہ پرور خدائے
حسابے ورامش و رنگ و بو      نہ جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند      دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ      بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانہ      نہ دستاں سرائے نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط      نہ غوغائے رامشگراں در رباط

……………………

بے نواؤں سے ہمدردی | پھر فرماتے ہیں کہ زندگی میں جو کچھ مجھ پر گذری اسے کیا بیان کروں بیان

کرنے کا وقت ہی نہ رہا۔ بہاریں آئیں لیکن میں بے سرو سامانی کا ماتمی رہا۔ افق پر شادمانی افزا بادل چھائے لیکن میرا جام سفالیں شراب سے خالی رہا۔ اگر عیش کا کوئی لمحہ نصیب بھی ہوا تو اس کی حیثیت رقص بسمل کی سی تھی۔ رشتہ درست ہوا تو گوہر ٹوٹ گیا۔ شراب مہیا ہوئی تو پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

بہ گیتی درم بے نوا داشتی ولم را اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد بہ ہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے زرش بر گدایاں فرو ریزمے

گویا اگر دولت اور صلہ کی خواہش تھی تو اپنی ذات کے لئے، اپنی آسائش کے لئے اور اپنی راحت کے لئے نہ تھی بلکہ آرزو یہ تھی کہ بادشاہ بلائے، ہر مرتبہ ہاتھی پر لاد کر زر و جواہر عطا کرے۔ غالب ہاتھی کو لے کر باہر نکلیں اور زر و جواہر فقیروں پرساتے جائیں۔

**پیکر حسن اخلاق**

خواجہ حالی اپنے مشاہدات کی بنا پر فرماتے ہیں :-

> مرزا (غالب) کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے۔ اور وہ (غالب ان کی تعمیل کرتے تھے۔ مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا.... اگرچہ

مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہوگئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔

**فراخ حوصلگی** خواجہ حالی نے ان کی فراخ حوصلگی کے دو واقعات لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انہیں لفٹننٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا۔ لفٹننٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام لینے کے لئے آئے۔ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے چپراسیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھا دیا اور خلعت مع رقوم جواہر بغرض فروخت بازار بھیج دیا جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب چپراسیوں کو انعام دے کر رخصت کیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہوگئی تھی چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے ملنے آئے۔ غالب نے انہیں کبھی مالیدہ یا جامہ وار کے چغوں کے سوا نہیں دیکھا تھا چھینٹ کا فرغل دیکھ کر غالب کا دل بھر آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا لیکن دوست کی دلداری کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسے طریق پر سلوک کیا جائے کہ اسے اپنی بیچارگی اور بےبسی کا احساس نہ ہو۔ اور پیش کردہ ہدیہ کو قبول کرتے ہوئے عار نہ آئے۔ غالب نے اس غرض کو مدنظر رکھ کر چھینٹ کے فرغل کی بے حد تعریف کی۔ پوچھا کہ یہ چھینٹ کہاں سے لی ہے۔ اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی کا فرغل بنوا دیا جائے۔ دوست نے بلا تکلف کہا کہ اگر آپ کو یہ بہت پسند ہے تو یہی لے لیجیے۔ غالب نے کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ابھی چھین لوں لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ اس کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا نیا چغہ انہیں پہنا دیا۔ ایک نازک دل اور نازک احساسات والے

شاعر کی شان دوست نوازی ایسی ہی ہونی چاہیے تھی ۔

**احسان لینا گوارا نہ تھا**

غالب کسی کا ذرا سا احسان بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ "دستنبو" ا کے گھرے دوستوں اور شاگردوں (حقیر، مہر اور تفتہ) کے زیر اہتمام ان کے دیر ہ نیاز مند (منشی شیو نرائن) کے مطبع میں چھپی تھی پچاس جلدوں کی قیمت رائے امید سنگھ اندو والے نے ادا کر دی تھی۔ ان میں سے بیشتر جلدیں غالب کو مل گئی تھیں۔ ان جلدوں کے ا غالب نے "دستنبو" کی جتنی جلدیں منگائیں قیمت بھیج کر منگائیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

> میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈی بھیج کر بارہ جلدیں اور جنتری ان سے منگوائی۔ پھر ان کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو ان کے ہاتھوں سے وہیں سے بھجوا دیں اور اس کے بعد اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سر دھنے بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں۔ مگر نقد۔ قرض میں نے نہیں منگوائیں ۔

اسی طرح انہوں نے اپنی کلیات کے جتنے نسخے منشی نولکشور سے منگوائے۔ ان کی قیمت ادا کی

**دوستوں کی خدمت**

دوستوں کی ہر خدمت کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تعریف میں قصیدے لکھے تھے۔ غالب نے تفتہ کو ان کا صلہ دلوایا۔ وہ خود تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

> تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں ان کو میں نے تمہارے فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے یہ کون؟ یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب۔ دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں وہ آخر دسمبر ۱۸۶۲ء یا اوائل جنوری میں حاضر ہوں گے ۔

**ہندستانی شعرا کا انگریزی تذکرہ**

دوستوں کی امداد میں کبھی انہوں نے تامل نہ کیا۔ ان کی آرزو ہمیشہ یہ رہی کہ جو لوگ ان سے وابستہ تھے وہ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ دہلی کے مستقل ڈپٹی کلکٹر

رخصت لے کر پہاڑ پر گئے اور ان کی جگہ ریٹی گن صاحب عارضی طور پر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے انہیں ہندوستانی شعرا کا ایک انگریزی "تذکرہ" لکھنے کا خیال تھا۔ غالب سے بھی مدد مانگی۔ غالب نے نواب ضیاء الدین احمد خاں سے شعرا کے "تذکروں کی سات کتابیں مستعار لے کر ریٹی گن صاحب کو بھجوائیں اور زندہ شعرا کے حالات خود لکھ کر ان کے پاس بھیج دیئے۔ ان میں منشی ہرگوپال تفتہ کے حالات بھی لکھے تھے۔ ریٹی گن صاحب نے غالباً خود بھی تفتہ کو خط لکھا تھا۔ تفتہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر غالب خود ریٹی گن صاحب کے پاس جا کر سفارش کریں گے تو ان کے متعلق زیادہ اچھے الفاظ لکھے جائیں گے۔ انہوں نے ایک خط کے ذریعہ سے غالب پر اپنا یہ خیال ظاہر بھی کر دیا تھا لیکن اس اثنا میں ریٹی گن صاحب عارضی ڈپٹی کلکٹری کی مدت پوری کر چکنے کے بعد عدالت خفیفہ کے جج ہو گئے تھے۔ اور شہر سے باہر فاصلے پر رہنے لگے تھے۔ غالب تفتہ کی خاطر پھر بھی ان کے پاس جانے کے لئے تیار تھے۔ وہ خود تفتہ کو لکھتے ہیں۔ کہ ریٹی گن صاحب کے منشی مظہر الحق صاحب آئیں گے ان سے

> حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری فلاح کا موجب ہوگا تو ضرور (ریٹی گن صاحب کے پاس) جاؤں گا۔

### سفارشوں کے لئے مستعد

سفارشوں کے بارے میں وہ بڑے مستعد تھے۔ نواب میر علی نقی خاں بڑے عالی خاندان آدمی تھے۔ نواب ذوالفقار خاں اور نواب اسد خاں عالمگیری کی اولاد میں سے تھے۔ وہ نوکری کی جستجو میں نکلے تو غالب نے سید بدر الدین احمد کو سفارشی خط لکھا۔ فرماتے ہیں:۔

> آپ ان کی (علی نقی خاں کی) تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ اور سب حال ان پر ظاہر کریں۔ اور انہیں اہلی سرکار سے ملا دیں۔ اور بابو صاحب سے جو ان کو ملوائیے تو میرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجئے۔ کیا خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر ہو جائیں۔ اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آئے

خاں
نواب اسد خاں عالمگیر کے وزیر تھے۔ اور فرخ سیر ان کا بٹھایا ہوا تھا۔ جب فرخ سیر نے ذوالفقار

کو مار ڈالا تو از روئے کتب تواریخ ظاہر ہے کہ سلطنت کیسی برہم ہو گئی۔ اور خود فرخ سیر پر کیا گزری۔ قصہ کوتاہ ان کی تقریب میں جو مدارج آپ صرف کریں گے اور جس قدر آپ ان کی بہبود کی کوشش کریں گے احسان مجھ پہ ہوگا۔

**تواضع اور انجاح مقاصد خلق** صاحب عالم مارہروی نے غالبًا لالہ گوبند پرشاد صاحب کو سفارشی خ دے کر بھیجا تھا۔ اور غالب کو براہ راست بھی لکھا تھا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

> لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دنیا دار نہیں فقیر خاکسار ہوں تواضع میری خو ہے انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ انشاءاللہ العزیز وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔

خط کشیدہ الفاظ سے غالب کے کمال حسن اخلاق اور جذبہ خدمت خلق کی حیثیت نہایت اچھی طرح آشکارا ہو سکتی ہے۔

**قیدیوں کی سفارش** نواب انور الدولہ نے غالبًا دو قیدیوں کے لئے سفارشی خط طلب کیا تھا۔ انہ لکھتے ہیں کہ حکم بہ طیب خاطر بجا لاتا ہوں مگر یہ فرما دیجے کہ کیا لکھوں اور خط کس کو بھیجوں نیز سفارش مقصود کیا یہ ہے کہ قیدی ہندوستان میں رہیں اور انڈمان نہ جائیں یا یہ ہے کہ کالا گار ہا ہو جائے آخر میں فرماتے ہیں:۔

> بہر حال اس خط کے ساتھ ایک اور لفافہ آپ کے نام کا روانہ کرتا ہوں۔ اس میں صرف ایک خط موسومہ منشی صاحب (جن کے پاس سفارش بھجوانی منظور تھی) ہے کھلا ہوا۔ اس کو پڑھ کر میاں امیر الدین کے پاس بھیج دیجے گا مگر گوند لگا کر دینی بند کر کے) اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کا خط لکھ کر میرے پاس بھیجیے اور لکھ بھیجیے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کہاں بھیجوں۔

**دوست نوازی** نواب حسین مرزا کی ہر چیز غدر میں تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے بھائی مظفر الدولہ مار جا چکے تھے۔ انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

اگر کہوں کہ میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں۔ یہ کہنا تکلف محض ہے کون کسی کی جان مانگتا ہے کون جان دیتا ہے مگر جو فکر مجھ کو تمہاری ہے۔ اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ انشاء اللہ اوائل ماہ آئندہ یعنی نومبر میں (خط ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے) تیرہ (ضیاء الدین احمد خاں) والا مقدمہ درست ہو جائے۔

اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ نواب حسین مرزا کے ساہوکار کو مختلف طریقوں سے سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ نواب صاحب کو کچھ اور روپیہ بھیج دے۔

منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:-

میاں عبدالحکیم بہت نیک بخت اور اشراف اور ہنرمند آدمی ہیں۔ دلی گزٹ میں حرفوں کے چھاپے کا کام کرتے تھے چونکہ وہ چھاپہ خانہ اب آگرہ میں ہے۔ یہ بھی وہیں آتے ہیں۔ تمہارے پاس حاضر ہوں گے ان پر مہربانی رکھنا۔ وہ شہر بیگانہ ہے ان کو تمہاری خدمت میں شناسائی رہے گی۔ تو اچھی بات ہے صحافی کا کام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر دہلی گزٹ میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بہ شرط گنجائش اپنے مطبع میں رکھ لینا۔

**امیر مینائی مرحوم** منشی شیو نرائن نے ایک رسالہ "معیار الشعراء" کے نام سے نکالا تھا جس میں مختلف شعرا کی غزلیں چھپتی تھیں۔ امیر مینائی مرحوم و مغفور نے بھی اپنا کلام بغرض اشاعت بھیجا تھا لیکن منشی شیو نرائن نے "معیار الشعراء" میں ایک عبارت شائع کر دی کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ان کا کلام چھاپا نہیں جائے گا۔ غالب نے "معیار الشعراء" میں یہ عبارت دیکھی تو فوراً منشی شیو نرائن کو لکھا کہ:-

یہ میرے دوست ہیں۔ امیر احمد ان کا نام ہے۔ اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں۔ اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے تمہارے پاس بھیجیں۔ اور اس کے (غالب کے) لکھنے سے ان کا (امیر مرحوم کا) نام اور ان کا حال معلوم ہوا...... اس کو "معیار الشعراء" میں چھاپ کر ایک ورقہ

یا چار روپیہ دے کر رام پور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر لکھو کہ در رام پور بر در دولت حضور رسیدہ بجنسہ مولوی امیر احمد برسد" اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔

شعرا معاصرانہ رقابتوں کے لئے خاص طور پر رسوا ہیں۔ بالخصوص جب ان کا دائرہ تمتع ا
ایک ہو تو ایک دوسرے کی شہرت و ناموری کے لیے کوششوں کی توقع ہی نہیں رکھنی جا
لیکن غالب کی ذات ایسی رقابتوں سے بالکل بالا تھی۔ اگرچہ امیر مرحوم بھی غالب کی طر
سرکار رام پور کے متوسل تھے لیکن غالب کو ان کی تعریف و تحسین میں قطعاً تامل نہیں ہوا
یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ غالب کے رقعات میں دوستوں اور متوسلوں کی امداد کی
مثالیں بہت ملتی ہیں۔ یوسف علی خاں عزیز ان کے ایک مخلص شاگرد تھے متعدد خطوط میں
ان کے محاسن بیان کئے ہیں خود بھی باوجود قلت مداخل ان کی امداد میں دریغ نہیں فرماتے

دوستوں کی فرمائش

دوستوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں وہ بڑے سرگرم تھے ان کے پاس مہریں بنوا
اور نگین کندہ کرانے کی فرمائشیں بہت آتی تھیں خطوط میں ان فرمائشوں کی تکمیل کا ذکر
کئی جگہ آیا ہے۔ دہلی سے جوتے اور ٹوپیاں بھی دوستوں کو بھیجتے رہتے تھے۔

انکسار

غالب اپنی مدح و ستائش سے بہت گھبراتے تھے ان کے دوست اور شاگرد ان کی
مدح میں قصیدے لکھتے تھے۔ تو جواب میں حد درجہ کا انکسار فرماتے تھے صاحب عالم مارہروی
کی ایک مدحیہ نظم کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان بارگاہ سے بھلا کہلواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت تھی (یعنی صاحب عالم کا مدحیہ قصیدہ) کہ اس وبائے عام میں جیتا بچا اللہ اللہ اس کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبے کو پہنچایا کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا ورنہ بندہ خدائی کا دعویٰ کرنے میں محابا نہ کرے گا۔

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے تعریف میں قصیدہ لکھ کر بھیجا ان کو لکھتے ہیں :۔

اگر مجھے قوت ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔

ایک اور خط میں قاضی صاحب ہی کو لکھتے ہیں:-

وہ رباعی جو آپ نے اس ننگ آفرینش کی مدح میں لکھی اس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب۔

تیسرے خط میں لکھتے ہیں:-

مجھے کیوں شرمندہ کیا میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں۔ مگر اچھوں کا شیوہ ہے بروں کو اچھا کہنا اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجا لاتا ہوں:-

تفتہ نے یگانۂ روزگار استاد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہیں اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا بہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ دکان بے رونق کے خریدار ہو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

میرزا تفتہ کیا کہنا ہے نظیر کا پتہ ہے نہ غالب کا مداح (تفتہ) شائستہ صد ہزار آفرین اور ممدوح (غالب) سزاوار صد نفریں۔

**مروت** مروت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور آلام جسمانی کا ہجوم تھا۔ لیکن جو لوگ بلا واقفیت و شناسائی بھی ان کے پاس کلام بھیج دیتے تھے۔ اس کو بغیر دیکھے اور اصلاح کئے واپس نہیں فرماتے تھے۔ تکلیف کی حالت میں چھوٹوں بڑوں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ مثلاً جن دنوں ضعف دماغ اور دوران سر میں مبتلا تھے۔ ان دنوں جہاں عام شاگردوں کا کلام نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہاں نواب رامپور کے کلام کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا تھا حالانکہ وہ سرکار رامپور سے مستقل وظیفہ پاتے تھے ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اپنی بیچارگی کی کیفیت "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار" میں چھپوا دی تھی۔ اور خطوں کے جواب یا اصلاح اشعار سے معذرت

چاہی تھی لیکن لوگ بہ دستور انہیں خط بھیجتے تھے نیز اشعار اصلاح کے لئے آتے تھے اور وہ شرمندہ ہوتے تھے۔[۵۱]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ منشی شیونراین سے "دستنبو" کے جتنے نسخے اُمید سنگھ اندور والے کے پچاس نسخوں سے زائد منگائے قیمت دے کر منگائے لیکن جب میاں داد خاں سیاح نے کتابوں کے لئے روپے بھیجے تو بہت ناراض ہوئے فرماتے ہیں:۔

> صاحب تم نے یہ پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ہیں۔ میں نہ کتاب فروش نہ دلاّل یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی تم نے بہت بُرا کیا

**نذر و تبرک** شہزادہ بشیر الدین میسوری نے غالب کی تصانیف طلب کی تھیں نیز ان کی قیمت پوچھی تھی، اس وقت غالب کے پاس فارسی دیوان اور "دستنبو" کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ دونوں کتابیں بھیج دیں اور شہزادہ کو لکھا:۔

> حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت بہنجار نوازش نیازمندان بے نوا نہ این است سرمایہ ام نہ فرومایہ سخنورم نہ سوداگر مونیہ پوشم نہ کتاب فروش، نہ پذیرندہ عطایم نہ گیرندہ بہا۔ ہر چہ آزادگان بہ شہزادگان فرستند نذر است و ہر چہ شہزادگان بہ آزادگان بخشند تبرک بیع و شرا نیست چون و چرا نیست ہر چہ فرستادہ ام ارمغان است و ہر چہ خواہم فرستاد ارمغان خواہد بود۔

**کتابیں مستعار لیتے تھے** غالب نے مطالعہ کے لئے کبھی کتاب نہیں خریدی ہمیشہ کتابیں مستعار لے کر پڑھ لیا کرتے تھے اور واپس کر دیا کرتے تھے وہ خود لکھتے ہیں:۔

> دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں مول نہیں لیتا

**حافظہ** میر مہدی مجروح کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے "مصطلحات الشعراء" مستعار منگائی تھی۔ نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو سے فرہنگ لغات وساتیر منگائی تھی۔ حافظہ بلا کا تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے۔ اس کے تمام اہم اور ضروری حصے ذہن میں محفوظ رہتے

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۔

تھے۔ اساتذہ کا کلام بڑی بے تکلفی کے ساتھ سند میں پیش کیا کرتے تھے۔ "قاطع برہان" انہوں نے محض حافظہ کی بنا پر مرتب کردی تھی۔ اس زمانے میں "برہان قاطع" اور دساتیر کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔

**کتاب فہمی** کتاب فہمی اور مطالب رسی کے متعلق خواجہ حالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک رسالہ دیکھ رہے تھے جو حقائق و معارف کے دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک مقام سمجھ میں نہ آیا۔ اسی اثنا میں غالب آگئے۔ نواب صاحب نے وہ مقام غالب کو دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کی ایسی عمدہ تشریح کردی کہ شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے بہتر بیان نہ فرما سکتے۔

**شعروں کی داد کا طریق** غالب کا عام طریقہ یہ تھا کہ جب تک واقعی اچھا شعر نہ ہوتا وہ تعریف نہ کرتے بلکہ خاموش بیٹھے رہتے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اس بنا پر ان کے بعض معاصرین ان سے آزردہ رہتے تھے۔ اور ضد میں آکر ان کی شاعری پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ غالب اگرچہ طبعاً صلح جو تھے۔ ہر شخص کی دلداری کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ مگر اشعار کی داد دینے میں راہ حق سے بال برابر بھی انحراف گوارا نہیں کرتے تھے۔

**سلامت طبع** وہ نہایت سلیم الطبع تھے۔ خواجہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کی سلامتی طبع ہی کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشق سخن میں جو ناہموار اور ٹیڑھا ہی نہیں بلکہ غلط راستہ اختیار کیا تھا اسے بغیر کسی رہبر اور بغیر کسی اُستاد کے خود بخود ترک کرکے صحیح راستے پر آگئے۔ سلامتی طبع کا اندازہ مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیینؐ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادی میں بڑے رد و کد کا موضوع بن گیا تھا۔ شاہ صاحب اس بات کے قائل تھے کہ خاتم النبیینؐ کا نظیر ممتنع بالغیر ہے بالذات نہیں۔ مولانا فضل حق نظیر کے ممتنع بالذات ہونے کے قائل تھے۔ مولانا غالب کے نہایت گہرے دوست تھے۔ انہوں نے غالب کو بھی اس بحث میں لپیٹ لیا اور ان سے جبراً ایک مثنوی لکھوائی جو غالب کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ غالب کی عمر اس وقت زیادہ

سے زیادہ چھبیس ستائیس برس کی ہو گی۔ اس لئے کہ وہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی ۱۸۲۴ء میں جہاد کے لئے دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔ مولانا فضل حق نے اپنا نقطۂ نگاہ مع دلائل اچھی طرح غالب کے ذہن نشین کر دیا تھا۔ لیکن غالب اس مضمون کو نظم کرنے لگے تو قدرت باری تعالےٰ پر کوئی پابندی عائد کرنے کی صورت ان کے ذہن میں نہ آسکی۔ لہٰذا انہوں نے یہ پہلو اختیار کیا کہ اس عالم میں تو خاتم النبیینؐ کا نظیر پیدا نہیں ہو سکتا ہاں اللہ تعالےٰ دوسرے جہان پیدا کر سکتا ہے۔ اور ان جہانوں میں نئے خاتم بنا سکتا ہے ؎

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است　　قدرت حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے　　ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃً للعالمینے ہم بود
کثرت ابداع عالم خوب تر　　یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

مولانا کو یہ استدلال پسند نہ آیا۔ اور کہا کہ اس حصے کو مثنوی سے نکال دو اور لکھو کہ کتنے ہی عالم پیدا ہو جائیں۔ خاتم ایک ہی رہے گا۔ غالب نے امتثال امر کے طور پر لکھ دیا ؎

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے　　خوردہ ہم بر خویش مے گیرم ہمے
منشائے ایجاد ہر عالم یکے است　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

یہ غالب کی سلامتی طبع کا کرشمہ تھا کہ اصل مضمون میں استدلال کی جو خامیاں تھیں ان پر وہ ٹھہر نہ سکے۔ اگرچہ مثنوی ایک عزیز دوست کی فرمائش پر ایک خاص مقصد کے لئے لکھی گئی تھی۔

**غلطی کا اعتراف**

غالب سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس کے اعتراف میں ہرگز تامل نہیں کرتے تھے۔ مثلاً "قاطع برہان" میں انہوں نے "افسوس" کو عربی الاصل ماخوذ از "اسف" قرار دیا تھا لیکن جب ان پر یہ غلطی واضح ہو گئی تو فوراً اس سے رجوع کر لیا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :۔

"افسوس" کو میں نے عربی جانا۔ عربی نہیں ہے اب مانا کہ یہ ایک سہوِ طبیعت تھا۔

"نامہ غالب" میں میرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں :۔

آویزہ و افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں دیباچۂ نثر میں ساتھ ہے۔

غالب کی مثنوی "درد و داغ" میں ایک شعر تھا ؎

خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد
با سر و رو عربدہ آغاز کرد

گل محمد خاں ناطق مکرانی کے پاس کلیات کا نسخہ پہنچا اور انہوں نے یہ مثنوی دیکھی تو لکھا کہ خوک کے سم ہوتا ہے پنجہ نہیں ہوتا۔ اگر سم و پنجہ کا اطلاق ایک محل پر شعرا کے نزدیک جائز ہے تو ظاہر فرمایا جائے۔ غالب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

> راست می گویم و یزداں نپسندد جز راست، حرف نا راست سرودن روش اہرمن ست بہ تیزی دم ذوالفقار و بہ فروغ گوہر حیدر کرار سوگند کہ ہیئت پائے خوک در نظر نبودہ است۔ اگرچہ این نوع آفرینش را در ویرانہ و خرابہ ہا بسیار دیدہ ام۔ اما شرف نگہی بہ کار نبردہ ام گمان من این بود کہ خوک ہم چو سگ و گربہ پائے دارد۔ اکنوں از روئے نوشتۂ شما در نظر جلوہ کرد کہ خوک سم دارد و پنجہ ندارد کاش نامۂ شما پیش ازاں کہ کلیات نقش انطباع پذیرد بہ من رسیدے[۵۱]۔

کون اس بے تکلفی کے ساتھ اپنی غلطی یا کسی خاص معاملے کے متعلق اپنی بے خبری کا اعتراف کرتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ فارسی مکاتیب غالب نے خود جمع کر کے چھپوائے تھے وہ چاہتے تو آسانی کے ساتھ اس خط کو حذف کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے بجنسہ چھپوایا۔ کلیات کے دوسرے ایڈیشن میں یہ شعر بدل کر یوں بنا دیا گیا ؎

خوک شد و بدنفسی ساز کرد
با سر و رو عربدہ آغاز کرد

اصلاح قبول کرلی

خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ایک قصیدہ کا پہلا مصرعہ یہ تھا ع۔

---

[۵۱] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۴۵۔

عید اضحیٰ بہ سر آغاز زمستاں آمد

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کہنے پر "عید اضحیٰ" کی جگہ "عید قرباں" بنا دیا۔

ایک اور قصیدہ کا ایک شعر یہ تھا

ہم چناں در تتق غیب نمودے دارند
بہ وجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مولانا فضل حق خیرآبادی کے کہنے پر "نمودے" کی جگہ "ثبوتے" بنا دیا۔

اعتراضات کے دیکھنے کا شوق اور ان سے خوف

غالب کو اعتراضات کا خوف بھی بہت تھا۔ اور اعتراضات کے دیکھنے کا شوق بھی بے حد تھا۔ "دستنبو" میں انہوں نے خالص فارسی لکھنے کا التزام کیا تھا اور عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آنے دیا تھا لیکن ایک جگہ "نہیب" کا لفظ لکھ گئے۔ مسودہ چھپنے کے لئے آگرہ بھیج دیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ "نہیب" عربی ہے تو اس کی جگہ "نوا" بنانے کے لئے انہوں نے تفتہ اور منشی شیو نرائن وغیرہ کو متعدد اضطراب آمیز خط لکھے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> نہیب لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے تیز چاقو کی نوک سے نہیب کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ نوا لکھ دیا جائے۔

"اودھ اخبار" میں انہوں نے دیکھا تھا کہ ایک صاحب نے غلام امام شہید کے کلام پر اعتراض کیا ہے۔ اور شہید کے شاگرد وضیع نے اس کا جواب دیا ہے منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو لکھتے ہیں:۔

> آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جواب و اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اخبار بالالتزام پڑھا کرتے تھے۔

مخالفت سے عفو و درگزر

جن اشخاص کی فارسی دانی میں غالب کو کلام تھا۔ ان کے خلاف رقعات میں جا بجا سخت الفاظ ملتے ہیں مثلاً قتیل۔ عبدالواسع ہانسوی، ملا غیاث الدین رامپوری صاحب غیاث اللغات۔ ملا نور العین واقف بٹالوی۔ ان کے خلاف درشت گوئی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے"

کہ اول جن لوگوں نے کلکتہ میں غالب کے کلام پر غلط اعتراضات کر کے ہنگامہ برپا کیا تھا وہ سب انہی اشخاص کے معتقد تھے اور انہی کی سندیں پیش کرتے تھے۔ حالانکہ غالب ان لوگوں کو شایستۂ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے "قاطع برہان" کے سلسلے میں جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس میں بھی غالب کے مخالفین کا مرجع زیادہ تر یہی اشخاص تھے۔ لیکن عام طور پر مخالفین کے باب میں غالب کا مسلک عفو و درگزر تھا۔ سیف الحق سیاح کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بڑودہ نے غالب کے خلاف برے الفاظ استعمال کیے تھے۔ سیاح نے غالب کو اطلاع دی۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

> قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم برا نہ مانو۔ کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا۔ اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔

غالب برا نہ مان جو دشمن برا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

جو لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے ان کی بازدید کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس بات کو گوارا نہیں فرماتے تھے کہ کسی کا "آنا" ان کے ذمے رہ جائے۔

نواب مصطفیٰ خاں نے غالب کی قید کے زمانے میں بڑی مدد کی تھی جس کا اعتراف انہوں نے خود اپنے "حبسیہ" میں کیا ہے۔ غدر میں نواب صاحب پر آفتیں آئیں۔ اور وہ قید ہو گئے۔ غالب کو جب ان کی رہائی کی اطلاع ملی تو ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ پہنچے اور نواب صاحب سے مل کر مطمئن ہوئے۔

**تاریخ کے مادوں سے نفرت**

غالب نظم و نثر کے بادشاہ تھے۔ اصناف نظم و نثر میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں ان کے فکر و تخیل کی بہتر سے بہتر گلکاریاں موجود نہیں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ،

رباعی، قطعہ، نوحہ، نثر میں مکاتیب، علمی مباحث، قدرتی مناظر و تاریخ، تقریظ و تنقید سب کچھ موجود ہے لیکن تاریخ کے مادے تلاش کرنے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے۔ ان کے نہایت عزیز دوست منشی نبی بخش حقیر کا انتقال ہوگیا، تفتہ نے تاریخ وفات کے لئے اصرار کیا جواب میں لکھتے ہیں:

> میں تاریخ کو دوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح میرا یہ بھی عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا، منشی قمرالدین صاحب نے پسند کیا۔ قطعہ یہ ہے ؎
>
> منشی نبی بخش کہ با حسن خلق      داشت مذاق سخن و فہم تیز
> سال وفاتش ز پئے یادگار      با دل نزار و مژۂ دجلہ ریز
> خواستم از غالب آشفتہ سر      گفت بدہ طول و بگو رستخیز

سیاح کو لکھتے ہیں:۔

> بھائی تمہاری جان کی قسم اور اپنے ایمان کی قسم میں فن تاریخ گوئی اور معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اور کا ہے اشعار میرے ہیں تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ ڈھونڈھ دیتے تھے موزوں میں کرتا

اس کے بعد اپنی چند تاریخیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ ان کے تعمیہ اور تخرجہ کس درجہ خندہ آور ہیں۔

نواب علاء الدین خاں کے صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے تاریخ وفات کے لئے لکھا اس کے جواب میں بھی غالب نے یہی عذر پیش کیا کہ میرے مادہ ہائے تاریخ بیشتر لچر ہوا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کلیات میں تاریخ کے متعدد قطعات موجود ہیں اور بعض ایسے قطعات بھی ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہوئے۔

**اُردو میں مرثیہ کی فرمائش**

خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ غالب سے اُردو زبان میں میر انیس وغیرہ کے انداز پر مرثیہ لکھنے کی فرمایش کی گئی تھی۔ غالب نے تین بند لکھے اس کے بعد معذرت کر دی کہ مجھے اس میدان میں مشاقی کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔

**فرمائشی اشعار**

غالب دوستوں کی فرمائش پر بھی شعر کہہ دیا کرتے تھے اور اس قسم کے فرمائشی اشعار فرمائش کنندہ کے حوالے کر دیا کرتے تھے اپنے نام سے منسوب نہیں کرتے تھے تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ اُنیس برس کی عمر، قوم کا کھتری خوبصورت وضعدار نوجوان ۱۲۷۲ھ میں بیمار ہو کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو، تاکہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر کی متروک معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے (تفتہ کا بیٹا مر چکا تھا جس کی وفات پر ڈھائی تین سو شعر کا مرثیہ کہا تھا وہ ان کے مطبوعہ فارسی دیوان میں موجود ہے) جو خونچکاں شعر تم نکالو گے مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بہ طریق مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرعہ آخر میں مادہ تاریخ ڈال دو نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو بابو بابو کہتے تھے چنانچہ میں ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں.... ؎

برہم چوں نام بابو برج موہن
چکد خون دل ریش از لب من

معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے اُستاد کے حکم کی تعمیل میں کچھ اوپر اسّی شعر کا مرثیہ لکھ بھیجا تھا لیکن غالب نے خود ہی بائیس شعر کہہ کر فرمائش پوری کر دی اور تفتہ کو لکھ دیا کہ اپنے اشعار کسی اور کو دے دو تفتہ نے لکھا کہ میرے اشعار میں سے کیوں ایک شعر بھی نہ لیا۔ کیا وہ اشعار سقیم تھے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

> وہ شعر سب دست و گریباں تھے۔ ایک کو ایک سے ربط ایک۔ یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لے جاتے۔ اشعار سب میرے پسند۔ بے سقم۔ بے عیب۔

منشی شیو نرائن اکبرآبادی کی فرمائش کے مطابق ایلن براؤن کے ہاں فرزند پیدا ہونے کی تقریب پر اکیس شعر کا اُردو قصیدہ لکھا تھا۔ غالب خود منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:-

"کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکر شعر میں خون جگر کھایا۔ اکیس شعر کا قصیدہ لکھ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً میرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فن تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدہ میں ایک روش خاص سے اظہار سنہ ۱۸۵۸ء کر دیا ہے۔ خدا کرے تمہارے پسند آئے"

اس کے بعد قصیدہ درج کیا ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

اُمیدوارِ عنایاتِ شیو نرائن ۔۔۔ کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ ۔۔۔ تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

اُس کو "نومولود" کی طرف اشارہ ہے۔

**شجروں سے نفرت** ارباب تصوف و سلوک کے ہاں "شجرہ" ایک خاص چیز ہے یعنی روحانی فیوض کے واسطوں کو مرشد سے لے کر حضور خواجہ دو جہان صلے اللہ علیہ وسلم تک ترتیب وار یاد کرنا اور یاد رکھنا مدت سے یہ چیز صوفیا کے یومیہ اوراد و وظائف کا جزو بنی ہوئی ہے سہولت کی غرض سے شجرہ کو منظوم کرانے کا سلسلہ بھی مدت سے جاری ہے۔ غالب کو شجروں سے بڑی نفرت تھی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ نواب الٰہی بخش معروف بھی جس شخص کو مرید کیا کرتے تھے۔ اپنے سلسلے کا منظوم شجرہ عطا فرمایا کرتے تھے۔ اور اس غرض کے لئے وہ شجرہ کی نقلیں کراتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب سے بھی یہ کام لیا گیا۔ غالب شجرہ نقل کرتے وقت ہر تیسرا شعر حذف کرتے گئے۔ جب یہ نقل نواب الٰہی بخش خاں کے ملاحظہ سے گزری تو وہ بہت خفا ہوئے لیکن غالب نے بلا تکلف کہا:-

"آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ سو زینہ کی ایک ایک سیڑھی اگر درمیان میں سے نکال دی جائے تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔"

اس تدبیر سے غالب آیندہ کے لئے اس ناخوشگوار مشقت سے محفوظ ہو گئے۔

میر ابراہیم علی خاں سورتی نے شجرۂ منظوم اصلاح کے لئے بھیجنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

> میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمایئے گا اس کی اصلاح میری حد وسع سے باہر ہے۔ یہ میرا شیوہ نہیں۔

**مذاق طباعت** غالب کا مذاق طباعت بہت اعلیٰ تھا لیکن اس کا تفصیلی ذکر "دستنبو" اور بعض دوسری تصانیف کی طباعت کے سلسلے میں آ جائے گا یہاں اسے مکرر زیر بحث لانا غیر ضروری ہے۔

**ہجو** خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ نہیں لکھا صرف ایک قطعہ ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے جو مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا تھا۔ اس کا جواب مدت[۵۱] دراز تک نہ ملا تو تقاضے کے طور پر یہ قطعہ بھیجا جس کو مشکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے[۵۲]۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قطعہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ لیکن خواجہ حالی کا یہ دعوے صحیح نہیں کہ غالب نے کبھی کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں لکھا۔ ان کے فارسی کلیات نظم میں کم و بیش چار قطعات ایسے ضرور موجود ہیں جنہیں بہر حال ہجو ہی کے ماتحت لانا پڑے گا[۵۳]۔ البتہ یہ درست ہے۔ ان کی ہجو سودا یا انشا یا فارسی کے بعض ہجو گو شعرا کی طرح سوقیت اور ابتذال سے ملوث نہیں ہوتی تھی۔

**تقریظ نگاری** خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور وہ احباب کی دلداری کی خاطر عموماً ان کی فرمائشوں کو پورا کرتے تھے لیکن تقریظ نگاری میں انھوں نے

---

[۵۱] یہ قطعہ "سبد چین" میں موجود ہے اور "سبد چین" غالب کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔ معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے اسے قلمی کس بنا پر فرمایا۔ [۵۲] یادگار غالب صفحہ ۴۴ [۵۳] کلیات نظم قطعات ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۶۔

ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف نہ ہو، نیز صاحب کتاب خوش ہو جائے۔ مثلاً تقریظ کا زیادہ حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات، اس کے اخلاق، یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کی نسبت صرف چند جملے لکھتے تھے جو علمیت سے خالی نہ ہوں[۵]۔

غالب خود اپنی روش کی نسبت تفتہ کو لکھتے ہیں:-

> وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی۔ کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے۔ مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرہ (گلشن بیخار) کی تقریظ ملاحظہ کرو ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی موجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو۔ کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔

تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے مدحیہ الفاظ کی قلت کا شکوہ کیا تھا۔ محولہ بالا بحث کے بعد غالب فرماتے ہیں:-

> واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا۔ تو اتنی مدح نہ کرتا۔ کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے قصہ مختصر تمہاری خاطر ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک اور فقرہ لکھ دیا ہے اس سے زیادہ لکھنی میری روش نہیں۔

**آئین اکبری کی تقریظ**

سر سید احمد خاں نے آئین اکبری کی تصحیح کی تھی تو دہلی کے دوسرے مشاہیر کے علاوہ غالب نے بھی مثنوی میں اس کے لئے تقریظ لکھی تھی لیکن غالب اول ابوالفضل کے انداز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے ابوالفضل کے پیش کردہ آئین کو انگریزی آئین کے مقابلے فروتر جانتے تھے سر سید کے ساتھ اگرچہ ان کے تعلقات بہت گہرے اور عزیزانہ تھے اور

---

[۵] یادگار غالب صفحہ ۲۰۵ -

ان کی دلداری بھی بدرجہ غایت منظور تھی لیکن تقریظ میں اپنے حقیقی خیالات چھپا نہ سکے اور صاف لکھا کہ سید کی ہمت بلند کے لئے آئین اکبری کی تصحیح قطعاً باعث فخر نہ تھی اور ایسے کام کی ستائش وہی کر سکتا ہے جس کا پیشہ رہا ہو ۔

من کہ آئین ریا را دشمنم — در دغا اندازہ دان خود نیم
گر بدیں کارش نگویم آفریں — جائے آں دارد کہ جویم آفریں

پھر فرماتے ہیں کہ اگر آئین کی بنا پر کتاب ستائش کی مستحق ہے تو آنکھیں کھول کر زمانے کی حالت دیکھو اور انگریزوں ہی کے آئین ملاحظہ کرو کہ انہوں نے کیسی کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں ۔

آتشے کز سنگ بیروں آورند — ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب — دود کشتی را ہمے راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں مے برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں مے برد
غلطک گردوں بگرداند دخاں — نرہ گاو و اسپ ماند از دخاں
از دخاں زورق بہ رفتار آمدہ — باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمے بینی کہ ایں دانا گروہ — در دو دم آرند حرف از صد گروہ
مے زند آتش بباد اندر ہمے — مے درخشد باد چوں اخگر ہمے
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبار مردم ہشیار بیں — در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار — گشتہ آئین دگر تقویم پار

پھر فرماتے ہیں کہ اگر کتاب کو طرز تحریر کے لحاظ سے شایان ستائش قرار دیا جائے تو ۔

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است — گر ہنر ہست از ہنر ہم بودہ است
بیدل فیاض را شمع تخیل — نو زمے ریزد و طرز از تخیل

مردہ پروردن مبارک کار نیست   خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ غالب کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط اور اسے علی الاطلاق درست ماننا چاہیے یا اس میں تراش خراش کرنی چاہیے لیکن ایک حقیقت ظاہر ہے کہ غالب کے فکر و نظر کا اسلوب عام لوگوں سے الگ تھا۔ وہ شخصیت پرست نہ تھے۔ بلند ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہر شے کی افادی حیثیت کا مستقلاً اندازہ کرتے تھے اور اندازہ کے بعد اس کی اچھائی یا برائی کا حکم لگاتے تھے۔ سرسید کے خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ بلکہ رشتہ داری بھی تھی لیکن ان تعلقات کی بنا پر انہوں نے اپنے دل کی بات صاف صاف اور بلا تکلف کہنے میں تامل نہیں کیا۔ سرسید نے اس تلخ تقریظ کو شامل کتاب نہ کیا بلکہ مشہور ہے کہ اسی بنا پر سرسید اور غالب کے دیرینہ تعلقات مکدر ہو گئے تھے جو رام پور کے پہلے سفر سے واپسی پر مراد آباد کی ملاقات میں از سر نو درست ہوئے جہاں سرسید اس زمانے میں بہ طور صدر الصدور مامور تھے۔

سردیوں میں دھوپ
گرمیوں میں ٹٹی۔

ان کی روزانہ زندگی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے تھے ان کے متعدد خطوں میں اس کا ذکر ہے سردیوں میں وہ دھوپ میں بیٹھتے تھے۔ گرمیوں میں خس کی ٹٹی لگا لیتے تھے مثلاً ایک خط میں جو جاڑے کے موسم میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:—

> دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں و لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا۔ اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔

دوسرے خط میں جو گرمیوں کے آغاز کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:—

> کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔

**آگ تاپنا** سردیوں میں آگ بہت تاپتے تھے۔ چنانچہ کسی جگہ اس کا بھی ذکر موجود ہے مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں :۔

> ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

**قصص حکایات کے مطالعہ کا شوق** معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو قصوں کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا صاحب عالم مارہروی نے انہیں مارہرہ بلانے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ ایک مرتبہ آموں کا لالچ دیا۔ ایک مرتبہ لکھا کہ مارہرہ تشریف لائیں گے تو "بوستان خیال" پڑھیں گے جس کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

> حضرت نے میری گرفتاری کا نیا ڈھنگ نکالا۔ "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے دانہ زمین سے اٹھا لاؤں۔

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی ہاتھ آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ؎
>
> کسے کایں مرادش میسر بود
> اگر جم نہ باشد سکندر بود

**غذا** خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ غالب کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی استعمال نہیں کیا۔ آخری عمر میں ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی جب وہ چلنے پھرنے سے بڑی حد تک عاری ہو چکے تھے تو گھر سے ان کے لئے دن کو جو کھانا آتا تھا اس میں خواجہ حالی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی تھیں :۔

(۱) پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا۔

(۲) ایک پیالے میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔

(۳) ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔

(۴) ایک پیالے میں دو تین پیسہ بھر دہی۔

شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔

غالب خود دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اپنی غذا کے متعلق فرماتے ہیں :۔

> صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کے کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

دسمبر ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :۔

> غذا بہ اعتبار آرد و برنج مفقود، محض صبح کو پان سات بادام کا شیرہ۔ بارہ بجے آب گوشت شام کو چار تلے ہوئے کباب، بس آگے خدا کا نام۔

**ناؤ نوش** شراب کے متعلق کچھ عرض کرنا یا کوئی عذر پیش کرنا بالکل فضول ہے۔ یہ علت ابتدائے شباب سے ان کی زندگی کا لاینفک جزو بن چکی تھی اور آخر دم تک نہ چھٹی۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر ولایتی شراب پیتے تھے جس کا نام ان کی اصطلاح میں "فیخ" تھا۔ غدر کے بعد ولایتی شراب بہت گراں ہو گئی تھی چنانچہ وہ بابو گوبند سہائے سے کاس ٹیلن اور اولڈ ٹام کا نرخ پوچھتے ہیں[۱]۔

ایک خط میں فرماتے ہیں :۔

> لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں ہوں تو۔

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۰۵۔

خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ شراب سوتے وقت پیتے تھے۔ جو مقدار مقرر کرلی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں۔ اس کی کنجی داروغہ کے حوالے تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر عالم سرخوشی میں زیادہ پینے کا خیال ہو تو کنجی نہ دینا۔

نواب سر امیر الدین احمد خاں فرمانروائے لوہارو سے معلوم ہوا کہ بوتلیں ان کے پاس دھری رہتی تھیں۔ نواب صاحب ممدوح اس زمانے میں کم سن تھے۔ اور اکثر غالب کے پاس جایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے۔ والدہ محترمہ نے سخت تاکید کر رکھی تھی کہ غالب کی بوتلوں کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ شراب کی بوتلوں کے علاوہ کئی بادام بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے جنہیں گزک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

غالب شراب میں عرق شیر یا گلاب ملا کر پیتے تھے وہ خود ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را

**ے نوشی کا التوا** یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب روزانہ شراب پیتے تھے یا کبھی کبھی بغیر پئے بھی گزارا کر لیتے تھے۔ ممکن ہے غدر کے بعد پنشن کی بندش کے زمانے میں بھی انہیں کسی وقت شراب نہ ملی ہو۔ خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں انہوں نے ۲۲ جون سے لے کر ۱۰ جولائی تک شراب کلیتہً ملتوی رکھی تھی۔[51] اس کی وجہ وہ خود بیان فرماتے ہیں:۔

انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجایش نکالوں۔ قہر درویش بر جان درویش۔ صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا۔ روز مرہ کا خرچ چلایا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو

---

[51] اردوئے معلّٰی صفحہ ۳۳۳۔

کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے روپیہ آ گیا۔ قرض بقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا خیر ہو صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی (نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو) نے وجہ موقوفی و بحالی پوچھی تھی۔ ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیکھا ہم کو یوں پالتے ہیں۔

آموں کا شوق

میووں میں سے وہ آم کو بے حد پسند کرتے تھے۔ آموں کی تعریف میں ان کی مثنوی بھی اردو دیوان میں ہے۔ ان کے دوست دور دور سے انھیں آم بہ طور تحفہ بھیجتے تھے۔ وہ خود بھی دوستوں سے آم منگاتے تھے۔ ان کے فارسی مکاتیب میں سب سے پہلا خط نواب اکبر علی خاں طباطبائی متولی امام باڑہ ہوگلی کے نام ہے اس میں آم طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مخفی نماند کہ بندہ ام و قدرے ناتواں، ہم آرائش خواں جویم و ہم آسائش جان۔ خردوران دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ہست۔ و اہل کلکتہ را آنند کہ قلمی انبہ ہوگلی بندر است۔

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :۔

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد
غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

سیاح نے بمبئی سے آم بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تھا اس کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا ضرورت؟ مالدہ کا آم یہاں ولایتی اور پیوندی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ وہاں بہت اچھا ہو گا سورت سے دلی آم بھیجنا محض تکلف ہے، روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک۔ پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت

پاکیزہ اور لذیذ اور خوش بو افراط سے ہیں پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست (قاضی عبدالجمیل) کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے۔ ہر ٹوکرے میں سو آم کلو داروغہ نے میرے سامنے دونوں ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے ایک سو سترہ بالکل سڑے ہوئے۔

**انبہ خوری کا طریق** صاحب عالم مارہروی نے کسی سے سنا تھا کہ غالب مارہرہ آکر آم کھانے کے آرزو مند ہیں۔ انہوں نے نہ محض دعوت نامہ ہی بھیجا بلکہ لکھا کہ مارہرہ آنے کی تاریخ سے مطلع فرمایئے۔ غالب جواب میں لکھتے ہیں کسی وقت بہ طریق تمنا کہا گیا تھا۔ کہ مارہرہ جاکر آم کھاؤں مگر اب وہ دل اور طاقت کہاں سے لاؤں۔

> نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد بھی آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

اسی طرح میر مہدی مجروح اور قاضی عبدالجمیل بریلوی کے نام کے خطوں میں آموں کے ہدیہ کا ذکر ہے۔[1]

**حقہ کشی** غالب حقہ بھی پیتے تھے۔ چنانچہ دو تین جگہ ان کے خطوں میں حقہ کشی کا ذکر موجود ہے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے سفر میں بھی حقہ ساتھ تھا۔[1]

**سوار ہو کر نکلتے تھے** اگرچہ وہ عموماً تنگ دست رہے اور ان پر کشاکش کا دور کبھی نہ آیا۔ لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ سوار ہو کر نکلتے تھے۔ غدر کے بعد جب ان کی پنشن بند تھی اور بے مقدوری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی تو اس زمانے میں بھی سواری کا سلسلہ بدستور قائم

---

[1] اردوے معلیٰ صفحہ ۱۵۶، ۱۶۷، ۱۷۱۔

تھا۔ مثلاً کمشنر دہلی کی خواہش کے مطابق "دستنبو" کے نسخے ان کے پاس لے کر گئے تھے تو سواری میں گئے تھے۔ چنانچہ خود میر مجروح کے نام کے خط میں صاحب سے ملاقات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> میں نے کہا کتابیں حاضر ہیں۔ کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ (صاحب) ادھر سوار ہو گئے میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

> مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔

اگر ان کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی تو کسی بے تکلف دوست کے ہاں سے منگا لیتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر نواب حسام الدین حیدر خاں کے ہاں سے پینس منگائی تھی۔[1]

**قلعہ میں جانے کا وقت**

قلعہ میں بھی سوار ہو کر جاتے تھے۔ صبح جا کر پہر دن چڑھے واپس آ جاتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد دو چار آدمی مکان پر رہتے تھے۔ ایک صاحب غالباً بریلی سے ملنے آئے تھے لیکن ان کی آمد کے وقت غالب مکان پر موجود نہ تھے۔ بعد میں انہیں معلوم ہوا تو نہ مل سکنے پر افسوس اور معذرت کا خط قاضی عبدالجمیل بریلوی کو بھیجا اس میں فرماتے ہیں :۔

> صبح کو میں ہر روز قلعہ کو جاتا ہوں۔ ظاہرا مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے جب سوار ہو جاتا ہوں جب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے۔ حقہ پیتے۔ اگر قلعہ جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں۔

**لفافے خود بناتے تھے**

غالب خطوں کے لفافے اپنے ہاتھ سے بنایا کرتے تھے۔ منشی شیو نرائن کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے سمجھا کہ شاید ان میں لفافے خریدنے کی استطاعت نہیں

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۷۔

اور لکھا کہ میں لفافے بھجواتا ہوں اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

> لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے بہرحال جب لفافے پہنچ جائیں گے ہم آپ کا شکریہ بجا لائیں گے۔

لفافے پہنچے۔ سعادت مند شاگردوں نے غالب کی سہولت کے لئے لفافوں پر "از مقام" "در مقام" "تاریخ" "ماہ" وغیرہ بھی چھپوا دیئے تھے لیکن غالب اس قسم کی چیزوں کو پسند نہیں فرماتے تھے انہوں نے لفافے دوستوں میں بانٹ دیئے۔ منشی شیو نرائن نے دوبارہ ایک پیکٹ بھیجا۔ غالب نے پیکٹ واپس کر دیا اور لکھا :-

> بھائی میں اپنے مزاج سے لاچار ہوں۔ یہ لفافے از مقام و در مقام و تاریخ و ماہ مجھ کو پسند نہیں آئیں گے۔ جو تم نے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں میں بانٹ دیئے اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کی عوض وہ لفافے جو از مقام اور در مقام سے خالی ہیں جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

**بیرنگ خطوط کا قاعدہ**

غالب اکثر خطوط بیرنگ بھیجا کرتے تھے۔ خصوصاً اہم خطوں پر ٹکٹ لگانا تو منافی احتیاط تصور کرتے تھے۔ اور اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتے تھے کہ بیرنگ خط بھیجا کرو۔ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں کہ بیرنگ خط بھیجو اس لئے کہ ڈاک والے بیرنگ خط کو جلد پہنچاتے ہیں۔ سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں :-

> پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے نظر اس بات پر تم کو بیرنگ خط بھیجتا ہوں تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی ہے۔

چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

> ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا اور رجسٹری کا دردسر جاتا رہے گا آدھ آنا نہ سہی ایک آنا سہی۔ آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجئے اور

> میں بھی بیرنگ بھیجا کروں بیڈ خطوط تلف ہو جاتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں موجد ہوا ہوں بادی (شروع کرنے والا) بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔

**شہرت و ناموری کا احساس**

**غالب تنگ دل اور تنگ حوصلہ نہ تھے لیکن انہیں اپنی شہرت اور ناموری کا بہت احساس تھا۔ اور ان کی یہ حس بہت نازک تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے مکان کا پتہ پوچھتا تھا۔ یا ان کے نام کے خط پر پتہ درج کرنے میں زیادہ تفصیلات بیان کرتا تھا تو ان کے دل میں معاً یہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ انہیں گمنام یا کم مشہور سمجھا گیا ہے۔ ان کے خطوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں :-**

> میں گمنام آدمی ہوں مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے بعض فارسی خطوں پر محلے کا پتہ نہیں ہوتا اور انگریزی خطوں پہ تو ہوتا ہی نہیں صرف شہر کا نام ہوتا ہے۔

**ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-**

> میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلّی کے ڈاکخانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

**نواب علاء الدین احمد خاں نے مکان کا پتہ پوچھا تھا انہیں فرماتے ہیں :-**

> قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے۔ کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و متحقق ہے۔ اور تم جانتے بھی ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو۔ اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تمہیں چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو۔ اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی اہل حرفہ سے بھی

> نہیں ہوں۔ کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دلّی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

**مذہب** غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شیعیت محض تفضیل تک محدود تھی۔ ان کا خاندان جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں سنی تھا۔ ان کے سسرال کا سارا خاندان بھی سنی تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی شیعیت ان کی "ایرانیت" سے پیدا ہوئی۔ فارسی زبان کے متعلق بھی ان کی روش وہی تھی جس پر بعد میں اہل ایران شدت اور غلو کے ساتھ کاربند ہوئے یعنی عربیت سے بعد۔ اسی چیز نے غالب میں ایرانیت کے ساتھ خاص شیفتگی پیدا کر دی تھی۔ اور غالباً اسی شیفتگی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے مذہبی معتقدات بھی ایرانی رنگ میں رنگے گئے۔

**تصوف** تصوف سے انہیں خاص مناسبت تھی وہ بقول خواجہ حالیؒ اہل حال میں سے نہ تھے۔ لیکن عرفا اور صوفیا کے کلام سے پوری طرح واقف تھے۔ اور توحید وجودی یا بہ اصطلاح عام وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> یہاں لا موجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ؎

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر
سوی اللہ واللہ ما فی الوجود

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

> دریبہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ

کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں، انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں منقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود علیہ السلام ع

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آگ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

**مسلمانوں سے محبت** اگرچہ عمل کے اعتبار سے متقی اور پرہیزگار نہ تھے بلکہ خاص اسلامی عبادات کے بھی پابند نہ تھے لیکن اسلام اور مسلمین سے انہیں بدرجہ غایت محبت تھی۔ اور مسلمانوں کی ذرا سی ذلت پر بھی تڑپ اٹھتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ایک مرتبہ خود غالب نے کہا

> مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔

**تعصبات سے بالکل پاک تھے** اس کے باوجود حد درجہ صلح کل اور تعصب و ناروا داری سے بالکل پاک تھے ہندوؤں مسلمانوں سب کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ تفتہ یا منشی بہاری لال یا منشی شیو نرائن یا ہیرا سنگھ و جواہر سنگھ یا ان کے والد رائے چھجمل کے ساتھ انہیں جتنی محبت و الفت تھی۔ ان کا کوئی مسلمان شاگرد نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے ساتھ مذکورہ بالا افراد کے مقابلے میں زیادہ محبت کرتے تھے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔ اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔

**لباس** لباس کے متعلق خطوط و تحریرات سے تحقیقی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھلا پاجامہ، لمبا چغہ اور پوست کی کلاہ پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹوپی خراب ہو گئی تھی تو سر کے لیے پشاوری لنگی بھی منگائی تھی۔ منشی جواہر سنگھ کو لکھتے ہیں:۔

> کلہے از پوست برہ داشتم آں را کرم خوردہ و سرم بے کلاہ ماند اگرچہ کلہے نمے جویم بالنگ ابریشمی چنانکہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان آں قلمرو بر سر پیچند مے خواہم اما لنگی کہ رنگہائے شوخ نہ داشتہ باشد و حاشیہ سرخ نبود۔ معہذا پہناہائے نازک و طرازہائے نغز داشتہ باشد و تارہائے زر و سیم را دراں صرف نہ کردہ باشند۔

پھر ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:۔

> کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔

**جانوروں کا شوق** یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کو جانور پالنے کا شوق تھا یا نہیں لیکن ان کے گھر میں مختلف قسم کے جانور رہتے تھے۔ مثلاً طوطا تھا جس کے متعلق یادگار غالب میں ایک لطیفہ بھی درج ہے کہ "میاں مٹھو تمہارے نہ جورو نہ بچے تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو"۔ رام پور کے سفر کے دوران میں جو خط لکھے گئے ان میں سے ایک میں ذکر ہے کہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں رام پور سے "مرغ" لے کر دہلی روانہ ہوئے۔ ایک مرتبہ نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے برسات کے لئے مکان مستعار مانگا تھا لیکن پھر اس میں منتقل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب موصوف کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں مور، کبوتر، دنبہ، بکری اور گھوڑوں کا ذکر ہے[لہ]۔ کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ بلی کی تعریف میں ہے

---

[لہ] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۴۶۔

دارم به جهاں گربه پاکیزه نهادے    کز بال سپرپاد بود میچ رمیم او
سرمست اداچوں به زمیں باز خرامد    از خاک دمد غنچه نقش قدم او
چوں صورت آئینه اثا خزا لطافت    آید به نظر بچه او از شکم او
هر شیر ژیانے که به بینی به گلستاں    دارد سر دریوزه عنبریش ز دم او
گربا نو رسے مرده را بیند سراہے    از پاکی طینت نخورد غیر غم او
هر بچه که کنجشک بوے باز سپارد    در پرورش او نخورد جز قسم او
آرے بود از غیرت انداز خرامش    بر کبک و تدرو است اگر خود ستم او
رخشنده ادیم تنش از لطف زبانش    گوئی به اثر تاب سهیل است تم او
جوش گل و بالیدگی موجه رنگ است    دُم لابه کناں آمدن دمبدم او
در عربده چو بند ز دم باز کشاید    لرزد شکن طره خوباں ز خم او

تا مهره کش صفحه افلاک بود مهر
بادا کف دست من و پشت شکم او

# تیرھواں باب

## تصانیف

نہ رنجم گر بہ صورت از گدایانم وہم غالب
بہ دارالملکِ معنی مے کنم فرمانروائیہا

**متداول تصانیف** غالب کی تصانیف بہ صورتِ موجودہ حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) کلیاتِ نظم فارسی جس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، نوحہ جات، مثنویاں، قصائد، غزلیات اور رباعیات شامل ہیں۔

(۲) کلیاتِ نثرِ فارسی جو "پنج آہنگ"، "مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔

(۳) دیوانِ اُردو جس کے مختلف ایڈیشن اور مختلف نسخے مروج ہیں۔

(۴) اُردوئے معلّٰی اس کے بھی مختلف ایڈیشن ملتے ہیں۔

(۵) عودِ ہندی جس میں "نامۂ غالب" بھی شامل ہے۔

**کمیاب تصانیف** جو تصانیف آج کل بہت کمیاب ہیں۔ اور غالب کی وفات کے بعد دوبارہ شائع نہیں ہوئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) "قاطعِ برہان" جو غالب کی زندگی ہی میں دوسری بار "درفشِ کاویانی" کے نام سے چھپی تھی۔

(۲) "سبدِ چین" جس میں غالب کا وہ فارسی کلام چھاپا گیا تھا جو کلیاتِ نظمِ فارسی کی اشاعت کے بعد سے لے کر غالب کی وفات سے تھوڑی مدت پیشتر تک کہا گیا یا جو پہلے کہا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے کلیات میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔

(۳) "تیغِ تیز" جس میں "قاطعِ برہان" پر اعتراض کرنے والوں کے جوابات دیے گئے۔

(۴) نکات و رقعات غالب جس میں فارسی زبان کے چند اصولی قواعد سہل اُردو زبان میں بیان کیے گئے تھے اور آخر میں "پنج آہنگ" کے آہنگ پنجم میں سے غالب کے پندرہ فارسی مکاتیب شامل کر دیے گئے تھے۔

(۵) مثنوی ابر گہر بار۔ یہ مثنوی بہ حالت موجودہ کلیات نظم فارسی کے حصہ مثنویات کی آخری مثنوی ہے لیکن ایک الگ نسخہ بھی کلیات نظم کی اشاعت کے بعد ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں غالب کے چند فارسی قصیدے اور قطعات وغیرہ بھی شائع ہوئے تھے جو نہ تو بعد ازاں کلیات نظم فارسی میں شامل ہو سکے اور نہ سبد چین میں آئے۔

(۶) قادر نامہ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جو ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا ہے میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا ہے۔ پبلشر کا دعوئے ہے کہ یہ کتاب غالب کی تصنیف ہے لیکن مجھے اس دعوے کی صحت میں کلام ہے۔ یہ "خالق باری" کے رنگ میں بچوں کے نصاب کی کتاب ہے، جس میں سہولت حفظ کے لیے مترادف الفاظ نظم کیے گئے ہیں اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا،
ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

اس کا نام "قادر نامہ" غالباً اس وجہ سے رکھا گیا کہ پہلے شعر کا پہلا لفظ "قادر" ہے

(۷) گل رعنا غالب نے اپنے عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اُردو اور فارسی کلام کا ایک منتخب مجموعہ اس نام سے مرتب کیا تھا اور اس کے دیباچہ اور خاتمہ کی نثریں فارسی زبان میں لکھی تھیں جو ان کے کلیات نثر فارسی میں موجود ہیں لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا اور نہ اس کا کہیں سے پتہ مل سکا ہے

غالب کی اُردو اور فارسی تحریرات ہیں اُردو دیوان، کلیات نظم فارسی، پنج آہنگ اور مہر نیمروز

کے حالات کم ملتے ہیں"۔ "قاطع برہان" اور "دستنبو" کے حالات زیادہ ملتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ معلوم ہو سکا یہاں درج کیا جاتا ہے۔

**کلام کی فراہمی** معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظم و نثر خود ان کے پاس کبھی جمع نہیں ہوئی ان کے بعض دوستوں اور نیازمندوں نے ان کی تحریرات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا تھا جن میں سے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رئیس لوہارو اور ذوالفقار الدین حیدر حسین مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر سے قبل غالب کی سب تحریرات اہتمام کے ساتھ جمع کر کے ان کی پر تکلف جلدیں بندھوالی تھیں لیکن یہ مجموعے غدر میں لٹ گئے۔ غالب منشی شیو نراین اکبرآبادی کو لکھتے ہیں:-

> ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سبتی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ نظم و نثر میں نے جو کچھ لکھا انہوں نے لے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چوّن چھپّن جزو۔ اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز۔ اور دیوان ریختہ سب مل کر سوا سو جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں کوئی ڈیڑھ سو اور سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ میرا کلام سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادہ نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا کہاں سے یہ فتنہ (غدر) برپا ہوا۔ اور شہر لٹا اور دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات۔ قلمی ہندی کا کلیات۔ قلمی پنج آہنگ۔ قلمی مہر نیمروز اگر ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا نظر آئے تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا میں قیمت بھیج کر منگا لوں گا۔

یہ جنوری ۱۸۵۹ء کا مکتوب ہے۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

> اردو کے دیوان کے چھاپے ناقص ہیں بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آئے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا۔

بہ ہر حال ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ:۔

(۱) غالب کی تحریرات ان کے پاس جمع نہیں ہوتی تھیں۔

(۲) جو چیزیں مختلف دوستوں کے پاس بالخصوص نواب ضیاءالدین احمد خاں کے پاس جمع تھیں۔ وہ تمام تر غدر میں لٹ گئیں۔

غدر کے بعد جو کچھ جمع کر کے چھاپا گیا۔ اس میں بلاشبہ انتہائی اہتمام کیا گیا ہوگا کہ کوئی چیز باہر نہ رہ جائے۔ غالب کی موجودہ شائع شدہ تحریرات میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ بعض چیزیں چھپنے سے رہ گئیں لیکن ان کا جو غیر مطبوعہ کلام "نسخۂ حمیدیہ" کے علاوہ متفرق طور پر ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کا اچھا خاصا حصہ قطعی طور پر غدر سے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ فراہم نہ ہو سکا۔ یا غالب نے اسے خود ناقابل اشاعت سمجھ کر نظر انداز کیا۔

**اُردو دیوان** تصانیف میں سے ہم سب سے پہلے اُردو دیوان کو لیتے ہیں جو غالب کی موجودہ شہرت و عظمت کا حقیقی مدار ہے۔ اگرچہ غالب اسے اپنے کمالات کا صحیح مظہر نہیں جانتے تھے بلکہ اسے باعث ننگ سمجھتے تھے[لہ]۔

اپریل ۱۸۵۹ء کے جس مکتوب کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۹ء سے پیشتر غالب کا اُردو دیوان ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ غالب سید بدرالدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> دیوان اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصہ میں دلی اور کان پور دو جگہ چھاپا گیا۔ اور تیسری جگہ آگرہ میں چھپ رہا ہے۔

---

[لہ] وہ خود ایک قطعہ میں ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

راست مے گویم و لے از راست سر نتواں کشید　　ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است
فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن بعض خطوں سے جن کے اقتباسات آگے چل کر پیش کیے جائیں گے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اردو ۱۱ فروری ۱۸۶۰ء اور ۳۰ جون ۱۸۶۱ء کے مابین آگرہ میں منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق کے پاس چھپنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید بدر الدین والا خط ۳۰ جون ۱۸۶۱ء کے بعد لکھا گیا تھا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ میں دیوان کی طباعت میں تاخیر ہو جانے سے غالب نے یہ سمجھا تھا کہ منشی شیو نرائن دیوان چھاپنا نہیں چاہتے اور اس وجہ سے انہوں نے دلی میں دیوان چھپوا لیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ سید بدر الدین والا خط جون ۱۸۶۱ء سے بعد کا اور ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء سے پہلے کا ہے۔

**مکمل دیوان کی اشاعت**

اپریل ۱۸۵۹ء والے خط سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ دلی اور کانپور دونوں جگہ کے چھپے ہوئے دیوان ناقص تھے۔ ان میں تمام غزلیں نہیں آئی تھیں۔ اور قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ غدر میں لٹ گئے تھے ۱۸۶۱ء میں مکمل اردو دیوان چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی تحریک میرٹھ کے ایک تاجر کتب عظیم الدین صاحب کی طرف سے ہوئی۔

غالب نے ۱۸۵۵ء میں اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں کے لیے رام پور بھیج دیا تھا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں وہ رام پور گئے تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے تاکید کی تھی کہ اس نسخہ کی ایک نقل لے کر بھجوا دی جائے۔ غالب نے یہ فرمایش پوری کر دی تھی رام پور کے قیام ہی کے دوران میں انہیں عظیم الدین میرٹھی کی طرف سے ایک درخواست موصول ہوئی جس میں دیوان کے چھاپنے کی اجازت طلب کی گئی تھی۔ غالب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا جب وہ رام پور سے واپس ہوتے ہوئے میرٹھ پہنچے تو وہاں مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان پر منشی ممتاز علی صاحب میرٹھی عظیم الدین کے سفارشی بنے اور اصرار کیا کہ دیوان چھاپنے کے لیے دے دیا جائے۔ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ مرحوم نے کاپیاں لکھنے کا ذمہ اٹھایا

غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر وہی نسخہ جو نواب ضیاءالدین خاں کے پاس رام پور سے بھیجا تھا نواب صاحب سے لیا اور نواب مصطفےٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپا ابھی شروع نہیں کیا تھا۔ اسی اثنا میں غالب کے عزیز دوست منشی شیو نرائن صاحب نے اصرار شروع کر دیا کہ دیوان انہیں دیا جائے وہ خود اپنے مطبع میں اسے اہتمام کے ساتھ چھاپیں گے۔ غالب نے تقاضا کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا اور آگرہ منشی شیو نرائن کے پاس بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں "تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں صاحب کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوا لیا۔

**میرٹھ میں طباعت کا اہتمام**

غالب منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:-

میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا عرضداشت عظیم الدین احمد بمقام میرٹھ واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور بہ فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا۔ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاءالدین نے مجھ کو تاکید کر دی تھی۔ کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاءالدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔ آمدم بر سر مطلب سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا۔ تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاءالدین احمد خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا [illegible] آکر ضیاءالدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیج دیا

> اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع (یعنی مطبع منشی شیونرائن) چھوڑ کر پرائے چھاپے
> خاں
> خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔ آج اسی وقت میں نے تم کو خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ کو ایک خط بھیجا ہے۔ ان کو لکھا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان جلد بھیجا جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو ناچار ہوں۔

**مسودہ کی واپسی پر اصرار**

بہر حال دیوان اواخر مارچ یا اوائل اپریل ۱۸۶۱ء میں میرٹھ بھیجا گیا ہوگا اس لئے کہ غالب مارچ ۱۸۶۰ء ہی میں رامپور سے واپس آئے تھے۔ منشی شیونرائن کے خط کے بعد غالب نے دیوان کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ ۱۱ر جون ۱۸۶۱ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دیوان واپس نہیں ملا تھا۔ وہ سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں:-

> دیوان کا چھاپا کیسا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے۔ بھوت ہے پلید ہے۔ غول ہے۔ قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے تم بھی دعا مانگو۔

غالب کی تنک مزاجی ملاحظہ ہو۔ کہ دیوان بہر حال اواخر مارچ یا اوائل اپریل میں بھیجا گیا تھا چند ہی روز کے بعد واپسی کا تقاضا شروع کر دیا اور ۱۱ر جون تک وہ اتنے پریشان ہو چکے تھے کہ بیچارے عظیم الدین کو بھوت اور غول اور نامعقول کہتے ہوئے بھی متامل نہ تھے۔

**مسودہ آگرہ بھیجا گیا**

۳۰ر جون ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں سیاح ہی کو لکھتے ہیں:-

> میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان ناصاحب ناانصاف سے ہاتھ آگیا۔ اور میں نے نور چشم منشی شیونرائن کو بھیج دیا یقین کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔

دیوان منشی شیونرائن کے پاس پہنچا تو انہوں نے غالباً لکھا کہ یہ تو مکمل نہیں ہے غالب فرماتے ہیں:

> میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرعہ میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔

**دہلی میں طباعت**

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے منشی شیونراین کی طرف سے بھی دیوان کی طباعت میں تاخیر ہو گئی اور غالب نے دیوان دہلی میں چھپوا لیا۔ وہ ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں منشی شیونراین صاحب کو لکھتے ہیں:۔

> دلی میں ہندی) دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں تمہارا بھیجا ہوا فرمہ مجھے دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم (عظیم الدین) نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری خوشی پر یہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیونراین صاحب بھی طباعت شروع کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے چھاپا مکمل کیا یا نہیں کیا۔

اس باب میں ایک عجیب امر یہ ہے کہ جب اس نسخہ کے سوا جو غالب نے رام پور سے نقل کرا کے نواب ضیاء الدین خاں کے پاس بھیجا تھا۔ دیوان کا اور کوئی نسخہ موجود نہیں تھا (یہی نسخہ نواب صاحب سے مستعار لے کر میرٹھ ارسال کر دیا تھا بعد ازاں اسی کو واپس لوٹا کر آگرہ بھیج دیا تھا) تو دلی والے مطبع میں کون سا نسخہ چھپا؟ یہ معلوم ہے کہ غالب نے منشی شیونراین کو بھیجا ہوا نسخہ واپس نہیں لیا تھا بلکہ اسے منشی صاحب ہی کے پاس رہنے دیا تھا[۵] تو کیا دلی والے مطبع کے لئے رام پور کے نسخہ کی دوبارہ نقل حاصل کی گئی تھی یا نسخہ کو منشی شیونراین کے پاس بھیجنے سے قبل اس کی کوئی نقل رکھ لی گئی تھی یا غدر کے گم شدہ نسخوں میں سے کوئی نسخہ مل گیا تھا؟

---

[۵] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۴۔

غالب کی تحریرات میں مجھے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔

**دیوان کا ناقص چھاپا اور قیمت** دلّی میں جو دیوان چھپا تھا۔ اس کا چھاپا بہت برا تھا۔ نیز اس میں غلطیاں بہت رہ گئی تھیں۔ غالب خود میر مجروح کو لکھتے ہیں:۔

> دیوان چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکا حق التصنیف ایک مجھ کو ملا غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا..... نہ میں خوش ہوا نہ تم خوش ہو گے۔ اور یہ جو کچھ لکھتے ہو یہاں خریدار ہیں قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلّال نہیں مہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان۔ مطبع شاہدرہ میں محمد حسین خاں دلّی شہر رائمان کے کوچے میں۔ مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت کتاب چھ آنے۔ محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔

زمانے کی نیرنگیاں دیکھو کہ جس مجموعہ اشعار کے نسخے ہمارے زمانے میں دو دو سو روپے میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کا حق التصنیف غالب کو صرف ایک نسخہ ملا تھا جس کی قیمت مع منافع ناشر و طابع صرف چھ آنے تھی۔ اور انہیں اپنے دوستوں میں نسخے تقسیم کرنے کے لیے بھی خود خریدنے پڑے تھے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطبع احمدی والے ایڈیشن کی تاریخ "بنائے ریختہ" اور "بیان ریختہ" نکالی تھی۔ یوسف علی خاں عزیز نے لکھا تھا ؎

لکھی عزیزِ خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے "دیوان ریختہ"

**کان پور میں دیوان کی طباعت** مطبع احمدی والا نسخہ ۲ محرم ۱۲۷۸ھ کو چھپا تھا لیکن چونکہ حد درجہ غلط چھپا تھا

Azizul Hasan Siddiqui [illegible] Badauni

اس لئے غالب نے اسے ازسرِنو کان پور میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قلم سے مطبوعہ نسخہ پر تمام غلطیاں درست کیں۔ اور اس کی پشت پر ایک رقعہ محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خاں نے اسے مطبع نظامی کان پور میں بھیجا۔ اور ذی حجہ ۱۲۷۸ھ میں یہ وہاں سے چھپ کر شائع ہوا۔ غالب کا صحیح کیا ہوا نسخہ جس کی پشت پر محمد حسین خان کے نام رقعہ لکھا گیا تھا۔ لکھنؤ کے بازار میں چند پیسے کو بکا[1]۔ رقعہ مذکورہ درج ذیل ہے:-

> جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار ہو گیا ہے[2]۔ خاتمہ کی عبارت، کیا میرا بیان، کیا میر قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے اس کو بھیج دیجیے۔ غالب"

میری معلومات کے مطابق غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا اور کوئی ایڈیشن نہیں چھپا۔

**متفرق اردو اشعار**

غالب کی اردو شاعری کے متعلق مفصل تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا جس میں بتایا جائے گا کہ انہوں نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کئے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی حاصل ہوئی تو وہ اشعار ضائع کر دیئے۔ صرف تھوڑے سے اشعار باقی رکھے ان اشعار کا ایک مجموعہ اعلیٰحضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال کی توجہات عالیہ کی برکت سے "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غالب کے وہ اردو اشعار جو ان کے دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے یا ان کے رقعات میں آ گئے ہیں۔ یا بعض قلمی مسودات سے لے کر شائع کئے جا چکے ہیں مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام نے "الہلال" میں چھاپ دی

---

[1] رسالہ ہندوستانی بابت جنوری ۱۹۳۴ء صفحہ ۹۰

[2] چونکہ مطبع احمدی والے ایڈیشن میں غلطیوں کی کثرت کے باعث غلط نامہ شامل کرنا پڑا تھا۔ غالب کی مراد یہ ہے کہ ساری غلطیاں درست کر دی گئی ہیں لہٰذا اب غلط نامہ کی ضرورت نہیں

تھیں کچھ اشعار دیوان غالب مطبوعہ مطبع نظامی میں چھپے ہیں کچھ اشعار آسی صاحب نے "مکمل شرح کلام غالب" میں چھاپے ہیں لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے۔

**ایک قلمی نسخہ**

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل کا حوالہ دیا تھا جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں نہیں چھپی تھی۔ حضرت مولانا نے اس غزل کی نقل نواب سعیدالدین احمد خاں طالب مرحوم کے مملوکہ نسخہ سے حاصل کی تھی۔ میں نے حضرت ممدوح سے اس غزل کی نقل مانگی تو انہوں نے تحریر فرمایا کہ نقل "الہلال" کے دور اول میں حاصل کی گئی تھی۔ اور بغرض اشاعت دے دی گئی تھی لیکن دفعتہً "الہلال" بند ہو گیا۔ غزل شائع نہ ہو سکی اور دوسرے مسودات کے ساتھ یہ بھی ضائع ہو گئی۔ میں اس کتاب کو مکمل کر کے کاتب کے حوالے کر چکا تھا۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں ایک ضروری کام کے لئے دہلی گیا۔ تو مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی مالک و ایڈیٹر "الامان" و "وحدت" کی وساطت سے میں نے نواب طالب مرحوم کے بعض عزیزوں سے ملاقات کی اور نواب صاحب مرحوم کا مملوکہ نسخہ دیوان غالب دیکھنے کے لئے مانگا لیکن افسوس کہ اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا لیکن ایک صاحب نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم کی بیگم صاحبہ کے پاس سے ایک قلمی نسخہ دیوان غالب لے آئے۔ جو بظاہر رامپور والے قلمی نسخہ کی نقل معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی لکھی ہوئی فارسی تقریظ بھی شامل ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ سارے دیوان میں ایک ہزار چھ سو نوے اور کچھ اشعار ہیں۔ اس کے حاشیہ پر جا بجا وہ اشعار مرقوم تھے جو غالب کے غیر مطبوعہ اشعار سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے ان تمام اشعار کی نقل لے لی۔ ان میں سے بعض چیزیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً ؎

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟[1]

---

[1] مروجہ دیوان میں موجود ہے۔

یا ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے[1]

یا ؎

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی[2]

بعض چیزیں "الہلال" سے یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخہ نظامی میں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً والی رام پور کے غسل صحت والا[3] اردو قصیدہ، دو تین قطعات[4] اور "سخن بخیہ کہن بخیہ" والی غزل[5]۔

غیر مطبوعہ کلام

محولہ بالا قلمی نسخہ کے بقیہ غیر مطبوعہ اشعار میں ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

آپ نے مسّنی الضّر کہا ہے تو سہی     یہ بھی اے حضرت ایوبؑ گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں سر     ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر     نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری     نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے     نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں     کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آ جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ     شہرۂ تیزیٔ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

……………………

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

---

[1] پوری غزل اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۱ پر موجود ہے [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۷ [3] دیوان غالب مع شرح نظامی طبع ششم صفحہ ۲۶۱ یا ۲۶۷

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

……

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخیٔ غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ — میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہو مجھ کو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ — ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زمرہ میں میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ — ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں[1]

حاشیے اور متن کے علاوہ اس قلمی نسخہ کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے، مثلاً یہ اشعار جو غالب لوہارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے ہے

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں

---

[1] یہ غزل ایک مرتبہ "ہمدرد" میں بھی شائع ہوئی تھی جبکہ جریدہ مذکورہ شروع شروع میں ٹائپ میں دہلی سے نکلا تھا۔ اس زمین میں غالب نے ابتدائی دور میں دو غزلیں کہی تھیں جو "نسخہ حمیدیہ" میں موجود ہیں، اور جن میں سے دو شعر نسخہ نظامی میں بھی بسلسلۂ اشعار غیر مطبوعہ چھپے ہیں۔ یہ دو شعر اس قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی موجود ہیں جس سے میں نے مندرجہ بالا اشعار نقل کیے۔ غالباً دو غزلوں میں سے غالب نے صرف یہی دو شعر قابل اندراج سمجھ کر محفوظ رکھے تھے۔

سوا نلج ہے جو کہ مطلوب جاں      نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں      ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول      وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

……

خوانی بہ سوئے خویش و ندانی کہ مردہ ام      دانی کہ مردہ ام و رہم خرام نیست
نے شیخ سدوام نہ "الٰہ بخش" مرگ من      از عالم جنابت و مرگ حرام نیست

……

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے ؎

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں      بزم شادی ہے فلک کا کہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو      ہے تو کشتی ہیں ولے بحر رواں ہے سہرا

مہاراجہ الور نے گلستاں کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنجہ کش سے لکھوایا تھا اور بہت روپیہ اس کی تزئین پر صرف کیا تھا۔ ایک فارسی قطعہ تاریخ اس نسخہ کی تکمیل کے متعلق ہے۔

**ایک غلط فہمی کا ازالہ** نسخہ نظامی کے صفحہ ۲۷۱ پر ایک غیر مطبوعہ غزل درج ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

جناب نظامی فرماتے ہیں کہ "نواب" سے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی طرف اشارہ ہے۔

یہ وہ غزل ہے جو رامپور سے رخصت ہوتے وقت لکھی تھی۔ چونکہ دیوان اس وقت مرتب

ہو کر چھپ چکا تھا۔ اس لئے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔

غالب نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تھے اور مارچ ۱۸۶۰ء میں واپس آئے تھے۔ دیوان کی طباعت کے جو حالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں مانا جا سکتا کہ مارچ ۱۸۶۰ء میں دیوان تب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ غزل شامل دیوان نہ ہو سکی۔ بلکہ دیوان اس سے کم و بیش ڈیڑھ برس بعد شائع ہوا۔ دوبارہ مزید دس ماہ بعد چھپا۔ میرا خیال ہے کہ "نواب" سے نواب یوسف علی خاں کی طرف نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ غزل ۱۸۶۰ء میں نہیں بلکہ ۱۸۶۵ء میں طباعت دیوان سے دو تین برس بعد لکھی گئی۔

بہر حال غالب کا اُردو کلام ابھی تک بہت متفرق حالت میں ہے۔ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ تمام چیزوں کو یکجا کر کے بہ صورت کلیات چھاپا جائے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سارا کلام سامنے رکھ کر اس کا ایسا انتخاب مرتب کیا جائے جو غالب کے رنگ کا صحیح مرقع ہو۔

**اُردو مکاتیب** خواجہ حالی مرحوم نے لکھا ہے:۔

> مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن "مہر نیم روز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت بہ ضرورت ان کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی ..... قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس لئے کہ اول "مہر نیم روز" کوئی بڑی کتاب نہیں جس کی ترتیب میں غالب کے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب انہوں نے کم و بیش پانچ برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ باعتبار اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچیس صفحات لکھتے رہے اور یہ غالب جیسے

قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کے لئے کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے جس کی تکمیل کی خاطر انہیں فارسی خط وکتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ دوسرے خط وکتابت میں ان کا عام انداز پیچیدہ اور اُلجھا ہوا نہ تھا بلکہ جو کچھ لکھتے تھے عموماً بلا تکلف لکھتے تھے اُردو خطوط کی طرح فارسی خطوط میں بھی تکلفات سے آزادگی ہر مقام پر ظاہر ہے۔ انہوں نے خود پنج آہنگ کے آغاز میں نثر نگاری کے جو خصائص بیان کئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدا ہی سے صحیح راستہ پر گامزن تھے۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر فارسی خط کے لفظ لفظ پر گھنٹوں مصروف فکر رہتے تھے۔ تیسرے ان کے فارسی مکاتیب میں ایک خط منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں سر کے لئے لنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس خط کے آخر میں مطبوعہ "پنج آہنگ" میں یکم دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق چہارم محرم ۱۲۵۱ھ ثبت ہے۔ ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت نہیں ہوتی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ایک تاریخ ضرور غلط ہے۔ اگر تاریخ ہجری کو ۱۲۵۱ھ کے بجائے ۱۲۶۱ھ رکھا جائے تو عیسوی تاریخ ۱۸۴۵ء ہونی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ان کے اُردوئے معلّٰی کے ایک خط میں بھی منشی جواہر سنگھ سے لنگی کا تقاضا موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

> کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔

یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں گے میرا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو خط وکتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اُردو نثر کو اہل علم زیادہ بلند پایہ نہیں دیتے تھے۔ اس لئے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا۔ غالب کی خط وکتابت فارسی کے بجائے اُردو میں زیادہ ہوتی گئی۔

**اُردو مکاتیب کی اشاعت سے گریز** معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء تک اُردو مکاتیب کا اچھا ذخیرہ مختلف دوستوں کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ اور وہ انہیں چھاپنے کا قصد کر رہے تھے سب سے پہلے

# سندِ جانشینی بنام نواب علاءالدین احمد خان علائی

بے سنہ ۱۸۶۳ء

دانشهای بسزا و اندیشه های رسا را به فرگاه تنگبار و الا یزدان باز نداده اند و
جز اینمایه آگهی که همه ازوست یا همه اوست در دید و دانست هر روی هیچ دانشمند
دیده ور نکشاده اند خرد که آفریدهٔ نخستین است سزد که همه دان و همه بین باشد
هر آئینه هرچه پس از وی به پیشگاه پیدائی شتابد این توانا سروش چگونگی آن
را پدیدار تواند ساخت سخن در آنست که آن هست و بود را که پیش از وی بوده است
چگونه تواند شناخت چون خرد فرو مانده تر از ماست ما که جز اندک بخششی از خرد نیابیم
در دانستن خرد آفرین چون فرو نمانیم همانا این نه بس باشد که خدا را آفریدگار و
خرد را در آفرینش با سخن که پرتوی از شبستان خرد تواند بود همدم و همراز دانیم گوهر
خرد را به ترازوی سخن سنجیم و نوای سخن را هنجار خرد آهنجیم اگر گفتار است و ار
دانش است همه ایزدی فره و امیغی ارزانش است با اینهمه در بایستهای این کار
آموختن فرهنگ است از آموزگار و به پیروی راهدان پیمودن راه گفتار می نگری که
برادرزادهٔ نامور روشندل روشن گهر میرزا علاءالدین خان در به فرتاب خرد خداداد
راه سخن به رهنمائی من رفت و در پیری من و برنائی خویشتن به بزمستان سخن گستری جای
من از من گرفت اینک چنانکه در خویشی و پیوند و یگانگی مردم چشم جهان بین
منست به جای بالش مهر مسند و فرزانگی جانشین منست آئین گفتار به تنومند
اندیشه آن نوجوان نو و گرویدگان مرا بمهر وی دل در گرو باد

منشی شیونرائن اکبرآبادی نے غالب کو لکھا کہ اردو مکاتیب شائع کرنے کی اجازت دیجیے غالب ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں منشی صاحب کو لکھتے ہیں:-

> اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔

غالب اپنے فارسی رقعات کو چھاپنے کے خلاف نہ تھے حالانکہ وہ بھی زیادہ تر ایسے معاملات سے متعلق تھے جنہیں ان کے اور ان کے دوستوں کے "آپس کے معاملات" کہنا چاہیے۔ اردو مکاتیب کی اشاعت سے گریز کی حقیقی وجہ یہی تھی کہ اس زمانے میں اردو نثر کو سخنوری کی شہرت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ "آپس کے معاملات" والا عذر، عذر زائد تھا۔

**مجموعہ مکاتیب کی ترتیب**

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوستوں کے پیہم اصرار کے باعث ان کی رائے بدل گئی تھی۔ چنانچہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی نے غالب کے تمام رقعات "مہر غالب" کے نام سے جمع کر لئے۔ اور ان کا دیباچہ لکھ کر غالب کے پاس بھیج دیا۔ غالب نے اس دیباچہ کی داد دی[1]۔ یہ مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کی تحریک پر مرتب ہوا تھا۔ منشی غلام غوث خاں بیخبر نے مزید رقعات کی ترتیب شروع کر دی۔ غالب ایک خط میں منشی صاحب لکھتے ہیں:-

> کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں۔ مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام نساخ ان کا تخلص ہے، میری ان کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ "دفتر بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعہ نثر اردو کے لائق ہے۔ آپ کے پاس

---

[1] عود ہندی صفحہ ۴۴ ـ

ارسال کرتا ہوں۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہی منشی ممتاز علی خاں صاحب جو چودھری عبدالغفو خاں کے پاس مارہرہ پہنچے تھے۔ اور مجموعہ خطوط کی ترتیب کی تحریک فرما چکے تھے۔ اس مجمو کو چھاپ رہے تھے اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کتاب کی ترتیب و تکمیل میں منشی صاحـ معاون تھے۔ غالب خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں :۔

> ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم، چھپ چکا ہے تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت تقاضا کرے فقیر کو بھیجیں۔

ایک اور خط میں خواجہ غلام غوث خاں کو لکھتے ہیں :۔

> اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے یقین جانتا ہوں ایسی نثروں کو آپ خود درج نہ کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ جناب کیس صاحب بہادر افسر مدارس غربی شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا اس کا جواب لکھ بھیجا نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔

**عود ہندی کی کیفیت**

بہرحال منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے سرور نے اپنا مجموعہ خود مقدمہ لکھ کر منشی صاحب کے حوالے کیا خواجہ غلام غوث خاں صاحب بیخبر نے بعض اور خطوط جمع کر دیے۔ اس وقت تک یہی خیال تھا کہ تمام خطوط شائع نہ کئے جائیں بلکہ صرف وہ خطوط شائع کئے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اس لئے غالب خواجہ غلام غوث خاں کو لکھتے ہیں :۔

> اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے۔

لیکن بعد ازاں جتنے خطوط مل سکے بجنسہ شامل مجموعہ کر دیے گئے اور "عود ہندی"

میں ایسے خطوط بھی موجود ہیں۔ جن میں نہ عبارت کی کوئی خاص خوبی ہے اور نہ کوئی علمی نکتہ ہے

**غالب سے دیباچہ کا مطالبہ**

ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ غلام غوث خاں "عود ہندی" کا دیباچہ غالب ہی سے لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

> مجموعہ نثر اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے۔ تو اس مجموعہ کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎
>
> رسم است کہ مالکان تحریر
> آزاد کنند بندہ پیر
>
> آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔

**منشی ممتاز علی خاں کا بیان**

منشی ممتاز علی خاں "عود ہندی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غالب کی فارسی تصانیف تو بہت چھپ چکی ہیں۔ مگر کلام اُردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی حالانکہ غالب کی اُردو نثر دوسروں کی فارسی سے بہتر ہے۔ مدت سے میرا خیال تھا کہ اُردو نثر بھی مرتب کی جائے :-

> میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے سب کو ایک جا کر کے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ جابجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی تب تمنا بر آئی ..... خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر تخلص جو جناب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص بااختصاص ہیں اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خاتمہ میں چند نثریں ہیں جو جناب غالب نے

اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں ۔

"عود ہندی" کے اختتام کی عبارت بہ طرز تقریظ حکیم غلام مولا صاحب قلق ساکن میرٹھ نے لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں رؤسا میرٹھ میں سے تھے۔ غالباً یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے سفارشی بن کر اردو کا دیوان منشی عظیم الدین صاحب کتب فروش کو بغرض طباعت دلایا تھا ۔

**عود ہندی کی طباعت کب ہوئی**

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عود ہندی کب چھپی؟ میرزا محمد عسکری صاحب مؤلف "ادبی خطوط غالب" فرماتے ہیں کہ "عود ہندی" سب سے پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ میں غالباً سنہ ۱۲۷۸ھ میں یعنی غالب کی وفات سے سات برس قبل چھپی تھی[۵۱]۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ میرزا محمد عسکری صاحب نے اس دعوے کی بنا کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ دعوے ناقابل تسلیم ہے۔ اس کے وجوہ درج ذیل ہیں:

(۱) "عود ہندی" میں "نامہ غالب" بھی شامل ہے۔ اور "نامہ غالب" سنہ ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا[۵۲]۔ اس سے ظاہر ہے کہ "عود ہندی" سنہ ۱۸۶۵ء تک نہیں چھپی تھی ۔

(۲) غالب نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے دیوان "دفتر بیمثال" کی تقریظ بھی عود ہندی میں شامل کرنے کے لئے بھیجی تھی اور اس میں لکھتے ہیں کہ مجموعہ نثر اردو جس کا نام اس وقت تک تجویز نہیں ہوا تھا چھپے گا یا چھپ چکا یعنی اس تقریظ کی ترتیب تک "عود ہندی" نہیں چھپی تھی۔ اور تقریظ میں غالب اپنی عمر ایک کم ستر بتاتے ہیں[۵۳]۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تقریظ سنہ ۱۲۸۱ھ (مطابق سنہ ۱۸۶۴ء) میں لکھی گئی تھی ۔

(۳) "عود ہندی" میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو یقینی طور پر سنہ ۱۲۷۸ھ کے بعد لکھے گئے مثلاً خواجہ غلام غوث خاں صاحب بیخبر کے نام کا وہ مکتوب جو "عود ہندی" کے صفحہ ۱۱۹

---

[۵۱] ادبی خطوط غالب صفحہ ۴ [۵۲] اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۰ و ۲۱ [۵۳] عود ہندی صفحہ ۱۲۰ ۔

پر درج ہے اس میں غالب مجموعۂ نثر اردو کے نہ چھپنے کی شکایت کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ لارڈ کیننگ کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ وہ سکریٹری صاحب نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تم ایام غدر میں بادشاہ کے مصاحب تھے پھر لارڈ ایلجن کی مدح میں قصیدہ بھیجا آخر میں فرماتے ہیں کہ جب لارڈ لارنس وائسرائے بنے تو ۱۳ فروری ۱۸۶۴ء کو ان کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔ "آج تک کہ ۷ مارچ ہے اس کا جواب نہیں آیا"

اس سے ظاہر ہے کہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء تک "عود ہندی" نہیں چھپی تھی۔

(۴) خواجہ غلام غوث خاں کے نام کے ایک خط میں جو ۷ جولائی ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں ایک قصیدہ درج ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نواب کلب علی خاں اپریل ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جولائی ۱۸۶۵ء تک "عود" شائع نہیں ہوئی تھی۔

**عود کا پہلا ایڈیشن**

غالب کی تحریرات کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عود ہندی ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ اس کی اشاعت کا کہیں ذکر نہیں لیکن میں لاہور واپس آیا تو میرے محترم اور فاضل دوست مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے بعض دوسری ضروری چیزوں کے علاوہ مجھے اکتوبر ۱۹۳۵ء کا رسالہ "ہندوستانی" بھی مرحمت فرمایا جس میں "عود" کی ترتیب کے متعلق منشی مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل بنارس یونیورسٹی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "عود" ۲ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے ٹھیک چار ماہ قبل شائع ہوئی تھی لیکن اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور غالب نے اسے "مہمل" قرار دیا تھا اس مضمون سے "عود" کے متعلق جو مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ انہیں خلاصۃً یہاں پیش کرتا ہوں۔

(۱) چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کے مجموعہ کے علاوہ خواجہ غلام غوث خاں بیخبر نے مختلف خطوط کے جمع و ترتیب میں سخت محنت اٹھائی تھی لیکن انہیں

زیادہ تر خطوط صرف ان دوستوں سے ملے جو صوبجات متحدہ میں رہتے تھے مثلاً کالپی کے نواب انور الدولہ، گورکھ پور کے عبدالرزاق خاں شاکر، آگرہ کے حاتم علی بیگ مہر، بریلی کے قاضی عبدالجمیل۔

(۲) خواجہ صاحب نے پورا مجموعہ مرتب کرلیا اصل اپنے پاس رکھا اور اس کی نقل ۱۸۶۶ء میں بغرض طباعت منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دی یہ بھی لکھا کہ طباعت سے قبل مسودہ غالب کو دکھا لیا جائے۔

(۳) پوری کتاب چھپ گئی لیکن طابع صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں آخری صفحہ روک رکھا اور کتاب بہ دستور ناتمام پڑی رہی۔ اخبار "جلوہ طور" مراد آباد کے مہتمم نے اسی حالت میں پچیس جلدیں لیں۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انہوں نے منشی ممتاز علی صاحب کو لکھا کہ قطعہ تاریخ فرض نہیں اس کا انتظار نہ کیجیے اور کتاب مکمل کر کے شائع کر دیجیے۔

(۴) یہ نسخہ میرٹھ میں چھپا تھا اگرچہ غالب سمجھ رہے تھے کہ یہ مطبع الہ آباد میں چھپ رہا ہے۔[1]

(۵) اس کی تقطیع ۹½ × ۶ انچ تھی کاغذ سفید تھا اور حجم ۱۸۸ صفحہ تھا۔

**عود کا مختلف ایڈیشن**

منشی مہیش پرشاد نے "عود ہندی" کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل بھی بیان فرمادی ہے۔ جسے میں یہاں درج کرتا ہوں:۔

(۱) مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء (۲ رجب ۱۲۸۵ھ)

(۲) مطبع نارائنی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۷۸ء (۲۰ صفر ۱۲۹۵ھ)

(۳) مطبع نولکشور کانپور ستمبر ۱۸۷۸ء (رمضان ۱۸۹۵ء)

(۴) مطبع مفید عام آگرہ مئی ۱۹۱۰ء

(۵) مطبع نولکشور کانپور ۱۹۱۳ء (بار چہارم)

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۶۷۔

(۶) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ء

(۷) نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ء

(۸) مطبع انوار احمدی الہ آباد

(۹) مطبع کریمی لاہور

(۱۰) مطبع گلزار ہند سٹیم پریس لاہور

منشی صاحب کا اندازہ ہے کہ اس وقت تک مختلف مطابع میں "عودِ ہندی" کے بارہ ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

**اُردوئے معلّٰی کی ترتیب**

مارچ ۱۹۳۶ء میں مجھے دہلی کے ایک کہنہ فروش سے "عودِ ہندی" کا ایک نسخہ ملا جس کے اول و آخر کے چند صفحات غائب تھے۔ منشی مہیش داس نے "عود" کے پہلے ایڈیشن کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ یہ "عود" کا پہلا ایڈیشن ہے۔ اس میں دو جگہ حاشیہ پر بعض عبارتیں موجود ہیں جو خطوط کے بعض حصوں کی تشریح سے متعلق ہیں۔ عود کی طباعت میں تاخیر ہو گئی تو غالب کے بعض عزیز شاگردوں نے دہلی میں اُردو مکاتیب کے چھاپنے کا ارادہ کر لیا۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

> مطبع اکمل المطابع میں چند اصحاب میرے مسوداتِ اُردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بذریعہ ڈاک بھیج دو گے۔ یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ دہلی میں ترتیب مجموعہ مکاتیب کا کام کب شروع ہوا۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے غالباً خطوط کے بھیجنے میں تامل کیا انہیں پھر لکھتے ہیں:۔

سنو بھائی۔ اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو اور شہرت منافی طبع ہو تو ہرگز نہ بھیجو قصہ تمام ہوا اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ چاہو بہ سبیل پارسل ارسال کرو۔

**نواب صاحب نے خطوط بھیج دیئے تو انہیں لکھتے ہیں :-**

خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا تھا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوانے کا تین رقعہ ایک جگہ سے لے کر ان کو بھیجے، اس کی رسید میں تقریباً انہوں نے طلب قعات بہ تکلف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لے کر کہیں گیا ہو گا..... یہ تیئیس ۲۳ لفافے اور چونتیس ۳۴ خطوط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے اگر متوسط بہ تقاضا طلب کرے گا ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

اس خط پر ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں مجموعہ خطوط کی طباعت کا ارادہ ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا۔

**اردوئے معلّٰی کی طباعت**

دہلی والے مجموعہ کا نام "اردوئے معلّٰی" قرار پایا۔ میر مہدی مجروح نے اس کا دیباچہ لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ جوہر کی کوششوں سے فراہم ہوا تھا۔ غالب کی زندگی میں اس کی طباعت اکمل المطابع میں فخرالدین کے زیر اہتمام شروع ہو چکی تھی۔ خاتمہ کی عبارت قربان علی بیگ سالک نے لکھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب مجموعہ کی طباعت مکمل ہونے سے قبل وفات پا چکے تھے۔ سالک نے جو تاریخ طبع کہی اس کا آخری شعر یہ تھا ؎

ہے یہی سال طبع سال وفات آج ان کا سخن تمام ہوا

**غالب کی اپنی تحریر**

غالب نے اُردوے معلّٰی کا حق ملکیت حکیم غلام رضا خاں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کی اصلی تحریر جو صرف پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپی تھی یہ ہے :-

> پیکر بے روح ورد واں فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص ہیچ مداں کہتا ہے۔ اور لکھ دیتا ہے کہ یہ اُردوے معلّٰی تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا سو میں نے از راہ فرط محبت اپنا حق تالیف نور چشم اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے۔ اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا ہے اور کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اُردوے معلّٰی کے چھاپنے کا قصد کریں تو مواخذہ سے محفوظ نہ رہیں گے اور فوراً حسب منشاء قانون بستم ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔

"عودِ ہندی" کی طرح "اُردوے معلّٰی" کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بعض ایڈیشنوں میں غالب کے مزید رقعات شامل کیے گئے ہیں لیکن میں سارے ایڈیشن جمع نہیں کر سکا اس لیے ان کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔

**نکات و رقعات**

اُردو کی بقیہ تصانیف میں سے "تیغ تیز" کا ذکر "قاطع برہان" کے ضمن میں آئے گا۔ اس لیے کہ وہ "قاطع برہان" کے سلسلے کی ایک کڑی ہے البتہ "نکات و رقعات" کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اگرچہ یہ کتاب فارسی زبان کے بعض اصول و قواعد سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں رقعات بھی سب کے سب فارسی ہیں لیکن اصل کتاب اُردو میں ہے۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ یہ پنج آہنگ کا اُردو ترجمہ ہے :-

> اکہتر برس کا ناتوان آدمی دنیا میں عزت اور عقبےٰ میں نجات کا طالب ترک سلجوقی اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے تیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں۔ اور اس کا نام پنج آہنگ رکھا چالیس برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھا۔ اب اکتیس برس کے بعد یہ ارادہ کیا ہے۔ کہ پنج آہنگ کی چوتھی[1] آہنگ جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے اس کا اُردو ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق

---

[1] یہ ترتیب موجودہ آہنگ چہارم تقریظوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اور مصادر وغیرہ کا بیان پنج آہنگ کی آہنگ سوم میں ہے۔

> حضور پرنور قبلہ حاجات خلق اور کعبۂ آمال انام نائب مسیح علیہ السلام جامع دانش و داد امرا کے مربی اور علما کے اُستاد جناب معلّے القاب میکلوڈ صاحب بہادر فرمانروائے وسیع ملک پنجاب بہ نظام نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ان کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک رخش ہلال رکاب کی نذر کئے جائیں۔ خدا کرے مجھ ننگ جاہل کا بیان حضرت کو پسند آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان سے "نکات غالب" کا نام پائے۔

لیکن میری رائے میں اسے "ترجمہ" قرار دینا صحیح نہیں۔ بہ ہر حال یہ کتاب فروری ۱۸۶۷ء میں پیارے لال صاحب اسسٹنٹ ماسٹر مدرسہ دہلی نے چھپوائی تھی۔ اس کے بیس صفحات نکات کے لئے وقف ہیں سولہ صفحوں میں پندرہ خطوط چھپے ہوئے ہیں ایک ورق غلط نامہ کا تھا۔ اس کے صرف پانسو نسخے چھپے تھے۔ دوبارہ یہ کتاب نہیں چھپی۔

**اُردو کی کتاب**

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے غالباً منشی شیو نرائن کی وساطت سے فرمائش کی تھی کہ غالب اُردو کی ایک کتاب لکھ دیں۔ غالب منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:۔

> جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو بھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اُردو کی نثر کی۔ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں۔ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ

پھر لکھتے ہیں:۔

> جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں اس میں گنجائش عبارت کی کہاں ہے۔ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اُردو بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہ ہر حال کچھ کروں گا اور اُردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا۔

یہ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کی تحریر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اُردو نثر کی کوئ

مستقل کتاب نہیں لکھی۔ البتہ یوپی کے انگریز انسپکٹر مدارس نے اردو زبان کی ابتدا کے متعلق ان سے جو تحریر حاصل کی تھی۔ وہ خدا جانے کیا ہوئی۔ کاش اس تحریر کا سراغ کہیں سے مل سکے۔

**فارسی دیوان**

فارسی تصانیف میں سے ہم سب سے پہلے نظم کو لیتے ہیں غالب ۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب میں سید بدرالدین کو لکھتے ہیں:۔

> فارسی کا دیوان میں پچیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا پھر نہیں چھپا۔

۱۸۶۳ء سے پچیس برس نکال دیے جائیں تو ۱۸۳۸ء باقی رہتے ہیں اگر غالب کے بتائے ہوئے تخمینہ کو صحیح سمجھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فارسی کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔

غالب کے نسبتی بھائی میرزا علی بخش خاں رنجور "پنج آہنگ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۱ھ میں نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ پر قضائے آسمانی سے وہ آفت نازل ہوئی کہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔

> بعد آں ہنگامہ ہم دراں ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم و بہ کاشانہ برادر والا شان و آمرزگار مہربان مولانا غالب زاد افضالہ فرود آمدم چوں دراں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمّٰی بہ "میخانہ آرزو" است تازہ فراہم آمدہ و پیرایہ اتمام پوشیدہ آنچہ از نثر دراں ہمایوں صحیفہ صورت ارقام داشت ہمہ را بہ خدمت والائے آں خسرو اقلیم سخنوری خواندم۔

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں غالب کا فارسی دیوان مکمل ہو چکا تھا اور اس کا نام "میخانہ آرزو" رکھا گیا "پیرایہ اتمام پوشیدہ" سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ دیوان چھپ چکا تھا اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ چھپنے کے لیے مکمل ہو چکا تھا۔ بہ ہر حال اس سے ظاہر ہے کہ غالب کا فارسی دیوان سب سے پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان شائع ہوا۔

غالب نے فارسی دیوان کے خاتمہ کی نثر میں سال تحریر نثر ۱۲۵۳ھ لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں چھپا۔

**کلیات نظم کی طباعت**

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کلام غالب کے جو مجموعے اہتمام کے ساتھ مرتب کئے تھے وہ سب غدر میں لٹ گئے۔ غدر کے بعد نواب صاحب مرحوم نے پھر بڑی محنت سے یہ نادر ذخیرہ فراہم کیا۔ اور ۱۸۶۱ء میں منشی نولکشور نے مسودہ منگا کر چھاپنا شروع کیا۔ غالب لکھتے ہیں:—

> منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں (فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں) کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ منشی نولکشور کے مطبع نے تکمیل طباعت میں کافی دیر کر دی تھی۔ غالب میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:—

> کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ سات صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نویس رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔

ایک اور خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:—

> کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔

ستمبر ۱۸۶۱ء میں منشی نولکشور دہلی آئے اور غالب سے بھی ملے۔ اس سے قبل وہ غالباً اودھ اخبار میں غالب کے کلیات نظم فارسی کی طباعت کا اعلان کر چکے تھے۔ اور اس کی قیمت سوا تین سو روپے مقرر کی گئی تھی لیکن بعد میں پانچ روپے کی قیمت کا اعلان کر دیا۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:—

> شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے مجھ سے، اور تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین احمد خاں) اور تمہارے بھائی شہاب الدین احمد خاں سے ملے۔ خالق سے

۴ جہاں حسینی

ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے ... تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لئے تھے۔ اب ان سے (منشی نولکشور سے) جوڑ کر آیا۔ تو انہوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار یعنی قبول کی یعنی سوا تین روپے فی جلد۔ اس حساب میں دس مجلد کے ساڑھے بتیس روپے میں دوں اور ساڑھے بتیس روپے تم دو گے۔ پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے ہیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہونگا کہو ساڑھے بتیس روپے علی حسین کو دے دوں کہو لکھنؤ بھیج دوں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلیات ۱۸۶۳ء میں جا کر مکمل ہوا۔ غالب سید بدرالدین کو ۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :—

اب سنا ہے کہ وہ (کلیات) چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں ہاتھ آ جائے تو پینسٹھ بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ جب آ جائیں گی ایک آپ کو بھی بھیج دوں گا۔

۱۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کو ایک مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :—

بہ توسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیات فارسی پہنچی۔ حیرت ہے کہ چار روپے چار آنے قیمت کتاب قالب انطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے خیر جہاں سو وہاں سوا۔ میرا حال تمہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید دے سکوں۔ نومبر سنہ حال (۱۸۶۳ء) میں پچاس روپے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ انشاء اللہ العظیم۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ شروع میں کلیات کی قیمت تین روپے اور محصول ڈاک چار آنے قرار پایا تھا لیکن بعد ازاں چار روپے کی قیمت کا اعلان ہو گیا۔ اور کتاب چھپی تو اس کی قیمت پانچ روپے اور محصول ڈاک پانچ آنے قرار پایا۔ غالب کے ساتھ وعدہ یہ تھا کہ انہیں سوا تین ہی روپے میں کتاب ملے گی لیکن بعد ازاں انہیں بھی پانچ روپے

دینے پڑے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ستمبر ۱۸۶۳ء میں غالب کے پاس کلیات کا پہلا مطبوعہ نسخہ آیا تھا۔ اسی مہینے میں انہوں نے ایک نسخہ مولوی معید الدین خاں کی وساطت سے نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول وزیر اعظم حیدر آباد کے پاس بھیجا وہ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام کے ایک مکتوب (مرقومہ ۲۵ ر ستمبر ۱۸۶۳ء) میں مولوی معید الدین خاں کے بزرگوں اور اپنے بزرگوں کے گھر سے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> اب آپ (ذکا) سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس پہنچنا ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس گزرنے کے بعد واقع ہو دریافت کرکے مجھے مطلع فرمائیں۔

کلیات کے انطباع کی جتنی تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں سے میر مہدی مجروح کی تاریخ ۱۲۷۸ھ کی ہے بقیہ سب تاریخیں ۱۲۷۹ھ کی ہیں۔ ایک تاریخ عیسوی ہے جس سے ۱۸۶۳ء نکلتے ہیں۔

**مثنوی "ابرِ گہربار"** غالب نے شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بحر میں غزوات نبوی کو نظم کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ صرف تمہیدات و مقدمات ہی مکمل کر سکے "ابر گہربار" انہی تمہیدات و مقدمات کا نام ہے۔ مجھے کلیات کا پہلا ایڈیشن نہیں مل سکا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کلیات کی طباعت کے وقت مثنوی مکمل ہو چکی تھی یا نہیں اور کلیات کے پہلے ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا یا نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مثنوی کلیات میں شامل ہوتی تو اسے علحدہ چھاپنے کی ضرورت نہ تھی۔ مثنوی کا جو علحدہ نسخہ میرے پاس ہے۔ اور ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) کا چھپا ہوا ہے یہ بھی "اکمل المطابع" میں چھپا تھا۔ اس میں مثنوی کے علاوہ غالب کے دو قصیدے۔ تین قطعے اور دس رباعیات بھی ہیں۔ اس نسخہ کے متعلق غالب کی متداول تحریرات میں مجھے ایک حرف بھی نہیں مل سکا۔

**"سبد چین"** یہ غالب کے ان فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جو کلیات اور مثنوی "ابر گہربار" کی طباعت کے بعد کہے گئے یا نواب ضیاء الدین احمد خاں کے فراہم کئے ہوئے اس مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے تھے جو منشی نولکشور کے مطبع میں بغرض طباعت بھیجا گیا تھا۔ غالب خود اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

> "سبد چین" میوہ را گویند کہ پایان موسم بر شاخسارے ماند و چوں آں را برچینند شاخسار بے بار ماند۔ ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شدہ و آنچہ یاران از دریں مسودات داشتند و من ازاں بے خبر بودہ و ازاں داشتم و اینک بہ من رسانند در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و آں را "سبد چین" نام نہادہ ام -

آخر میں لکھتے ہیں :-

> اکنوں کہ ناسور کہن را تازہ دش نماند کلک از کف فرو گزاشتہ ام پس اگر سخنے در اندیشہ خواہد گذشت رو شناس صفحہ نخواہد گشت ۔

باقر علی خاں کامل کے نام کے ایک خط مرقومہ ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ الور کی خدمت میں "سبد چین" کا ایک نسخہ نومبر ۱۸۶۷ء میں بھجوایا گیا تھا۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "سبد چین" سنہ ۱۸۶۷ء میں چھپی تھی۔ میں نے "سبد چین" کا جو نسخہ اپنے محترم دوست جناب شیر علی صاحب سرخوش (لاہور) کی عنایت سے دیکھا تھا۔ اس کا سرورق غائب تھا۔ اس لئے مطبع وغیرہ کے متعلق میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

**پنج آہنگ** "پنج آہنگ" غالب کے کلیات نثر کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔ اس لئے اس کا نام "پنج آہنگ" رکھا گیا۔ حصہ اول میں آداب و القاب وغیرہ ہیں حصہ دوم میں فارسی لغات کی مصطلحات و مصادر ہیں حصہ سوم میں دیوان غالب کے منتخب اشعار ہیں جو خط لکھتے وقت مختلف مطالب کے اظہار کے لئے مطلوب ہو سکتے ہیں۔ حصہ چہارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور مختلف نثریں ہیں۔ حصہ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۸ -

"پنج آہنگ" کے دیباچہ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں جب انگریزی لشکر بھرت پور پر حملہ آور تھا تو نواب احمد بخش خاں مرحوم کے دستے کے ساتھ غالب اور میرزا علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ میرزا علی بخش خاں نے غالب سے درخواست کی کہ

> آداب و القاب متعارفہ رسمیہ بروئے ہم ریختہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم آمیختہ
>
> برائے نامہ نگاران دستور العمل گونہ ساختہ آید۔

غالب اپنے انداز تحریر کے متعلق فرماتے ہیں:۔

> چوں کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را پنداشتہ کہ خود حاضر است و در سر آغاز صفحہ
>
> آوردہ ہم و نہ مژدہ سنج دعا گردم القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زوائد است
>
> و نیچگان حشو را در فع نہند۔ ۔ ۔ ۔ لیکن خاطر نازک پژوہندہ (میرزا علی بخش خاں) عزیز بود و فرمایش
>
> از سادہ گوش بہ دل دریافت۔

گویا اس کتاب کا پہلا اور دوسرا حصہ میرزا علی بخش خاں کی فرمائش پر مرتب ہوئے تیسرا اور چوتھا حصہ خود میرزا علی بخش خاں نے مرتب کئے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نثریں جمع کرلی تھیں۔ اور سب کو مدون کرنا چاہتا تھا لیکن فرصت نہ مل سکی۔ حکیم رضی الدین حسن خاں بھی ان کی ترتیب پر مصر تھے نیز مجھے خیال آیا کہ اگر یہ تمام چیزیں یکجا ہو جائیں گی تو میرا بیٹا غلام فخر الدین ان سے فائدہ اٹھا سکے گا۔[1]

غدر سے پیشتر "پنج آہنگ" دو مرتبہ چھپ چکی تھی ایک مرتبہ بادشاہی چھاپہ خانہ میں دوسری مرتبہ منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ میں۔ غالب منشی شیو نراین کو لکھتے ہیں:۔

> پنج آہنگ تم نے مول لے لی اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا ایک
>
> منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:۔

---

[1] پنج آہنگ صفحہ سو و نہ

> چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد از انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

موجودہ "پنج آہنگ" کے خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی نولکشور دہلی آئے تھے تو وہ مجموعہ نثر بغرض طباعت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

### "مہر نیمروز"

بہادر شاہ ثانی نے تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کرانے کا ارادہ کیا تھا حکیم احسن اللہ خاں واقعات جمع کرتے تھے اور غالب اس خدمت پر مامور ہوئے تھے کہ حکیم صاحب کے فراہم کردہ واقعات کو اپنی بہار آفریں عبارت کا لباس پہنا دیں۔ قلعہ کے ساتھ غالب کے تعلقات ملازمت کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔ پوری کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا گیا تھا۔ اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا حصہ اول میں ابتدا سے لے کر ہمایوں پادشاہ کے انتقال تک کے حالات لکھے تھے۔ حصہ دوم میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات لکھنے کی تجویز تھی لیکن دوسرے حصے کی تسوید ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ خاندان مغلیہ کی بساط لپیٹی گئی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے "مہر نیمروز" کی جو تاریخ لکھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

چونکہ "مہر نیمروز" میں "ماہ نیم ماہ" کا بھی ذکر تھا۔ اس لئے شائقین "ماہ نیم ماہ" طلب کرتے رہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:-

> اکثر صاحب اطراف و جوانب "ماہ نیم ماہ" کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیمروز" کی عبارت نہیں سمجھے تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! "مہر نیمروز" کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کے

دو مجلدیں ہیں پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام "مہر نیمروز" دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ" پہلا حصہ چھپا آگیا جا بجا بھیجا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا

**دستنبو** "دستنبو" کے متعلق غالب کے مکاتیب میں سب سے زیادہ ذکر ہے۔ بالخصوص تفتہ، مہر، شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق آگرہ اور منشی نبی بخش حقیر کے نام کے خطوں میں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ کتاب غدر کے دنوں میں غدر کے حالات کے متعلق لکھی گئی تھی اور اس میں التزام کیا تھا کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آئے۔ اسے غدر کی مستقل تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس میں صرف وہ واقعات درج ہیں جو غالب کو اور ان سے علاقہ رکھنے والوں کو پیش آئے یا غالب نے سنے وہ خود لکھتے ہیں

> ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد ہوا میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند کیا اور آنا جانا موقوف کر دیا بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی جو سنا گیا وہ بھی ضمیمہ سرگزشت کرتا گیا

غدر کے بعد دلی میں کوئی مطبع باقی نہیں رہا تھا اس لئے غالب نے "دستنبو" کو آگرہ میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ وہ منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں:۔

> میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے۔ اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی ہندی جو ہیں لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام ہرگوپال ہے۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا اس کی جگہ شیوا زبان لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعہ کا ہے یعنی نہ چھدرا نہ گنجان اوراق بے سطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں بیس سطر کسی میں بائیس سطر کسی میں انیس سطر آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو

شاید دو جزو میں آ جائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں ایک ہے۔ اس میں کاپی نگار خوشنویس نہیں۔ اگر آگرہ میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع دو۔ اس تمہید سے اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع اتنے پر کیوں ماننے لگا۔ اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پانسو سات سو چھاپنے کی صورت میں سوا تین آنے چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہوگی رہا کاغذ وہ بھی بہت نہ لگے گا لکھائی کتن کی تو آپ کو معلوم ہوگئی حاشیہ پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہرحال اگر ممکن ہو تو اس کا تخمینہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔

**کتاب کا حجم**

نواب انوار الدولہ کو بھی ایک خط میں قریباً اسی مضمون کی اطلاع دی ہے اور لکھتے ہیں کہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب بنے گی۔ اور مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپنے کو گئی ہے[1] غالب نے ابتدائی خط میں تفتہ کو لکھا تھا کہ اگر کوئی گنجان لکھے گا تو کتاب دو جزو میں آ جائے گی۔ لیکن آرزو یہ تھی کہ حجم زیادہ ہو وہ تفتہ کو رقم فرماتے ہیں:۔

> میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آ جائے میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت
>
> اس قدر ہے کہ دو جزو میں آ جائے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔

**طباعت میں اہتمام**

غالب چاہتے تھے کہ کتاب اچھی چھپے۔ اور اس باب میں تفتہ کے علاوہ منشی نبی بخش صاحب حقیر اور میرزا حاتم علی بیگ مہر کو بھی طباعت کے اہتمام میں شریک کر دیا تھا ان کے اپنے الفاظ میں گویا کونسل[2] بنا دی تھی منشی نبی بخش صاحب کے ذمہ کاپی دیکھنے کا کام لگایا گیا تھا۔ حکام کے لئے چند عمدہ مجلد نسخے مطلوب تھے اس لئے جلدوں کے باب میں بھی تفصیلی ہدایات بھیج دی تھیں اور یہ کام منشی حقیر کے صاحبزادے منشی عبد اللطیف صاحب کے سپرد کیا تھا۔ اہتمام کا یہ عالم تھا کہ اگر تفتہ کو ایک

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴۸ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۷۔

بات لکھتے تھے تو وہی بات تفتہ اور حقیر اور منشی شیو نرائن مالک مطبع کو بھی لکھتے تھے ایک خط میں تفتہ کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیا جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے۔ اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو۔ اور بہ دل توجہ فرماؤ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی منشی حقیر کا ہو گیا ہے۔ جلد کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں تصحیح بھائی اور تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا تزئین کیوں کر کی جائے سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھینچ جاتی ہے پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہشیاری میرے کس دن کام آئے گی۔

**صحافی اور نقاشی**

تفتہ نے غالباً لکھا تھا کہ صحافی اور نقاشی اپنے سامنے دہلی میں کرا لیجیے اس کے جواب میں غالب نے لکھا:۔

میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں۔ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔

جلدوں کے متعلق پھر فرماتے ہیں:۔

یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دو روپے فی جلد اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا چھ روپے آٹھ روپے دس روپے حد بارہ روپے۔ میاں کو سمجھا دینا کسی کی طرف نہ گریں چیز اچھی ہو۔

**تہیب کا نہیب**

غالب نے جو مسودہ بھیجا تھا۔ اس کی حمدیہ عبارت میں یہ فقرہ تھا:

> آں خداوند چنانکہ نیست را ہستی دہ است، ہستی پذیرفتہ را نیست ساز نیز تواند بود۔ آنانکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید "بشو" (کن) پدید آورد، اگر دو دم دیگر بہ "تہیب" "نباش" (نیست ہو جا) بہم زند، زہرہ کراست کہ از چون و چرا دم زند۔

"تہیب" عربی لفظ تھا۔ غالب مسودہ بھیجنے کے بعد اس پر مطلع ہوئے تو ان کے دل میں اس غلطی پر بڑا اضطراب پیدا ہوا انہوں نے فوراً "تہیب" کی جگہ "نوا" کا لفظ بنایا اور لکھا کہ کاپی میں اسی طرح درستی کردی جائے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

> میں منشی شیو نراین کو آج صبح لکھ چکا ہوں۔ تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے۔ "اگر دو دم دیگر نہیب نباش زند" "تہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دیا جائے "تہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "تہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ نوائے لکھ دیا جائے۔

تفتہ نے غالباً لکھا تھا یا غالب نے تفتہ کی تحریر سے سمجھا تھا کہ "تہیب" والے ورق چھپ چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> نہیب والے دو ورقے چار سو ہوں پانسو ہوں سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے سے ساری کتاب نکمی ہو جائے گی۔ اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودہ میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

پھر فرماتے ہیں:۔

> "تہیب" کے سبب مرا جاتا ہوں اس کی درستی کی خبر بھیجو۔

**مزید ہدایات**

مزید ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً

اصل نسخہ میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔۔۔۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم، یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلا جائے۔ جدول مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنچ کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو شیو رام پوری اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو۔ اور یہ بات کہ وہ جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیو رام پوری یا نیلے کاغذ پر، تکلف محض ہے۔ وہاں کے حاکموں نے کہا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر ہوں۔ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر وہ جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیو رام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا ور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔

**جلدوں کی آرائش** معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مہر نے جلدوں کی آرائش کا نقشہ غالب کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

سبحان اللہ جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی ایسی باتیں تھیں یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائے گی اور مہرہ اگر ہو جائے تو حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں ہے یہی بارہ روپے کی ہنڈوی، پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

**ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ** غالب نے اس دوران میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا پہلے ان کا خیال تھا کہ قصیدہ علیحدہ ملکہ کی خدمت میں بھیجا جائے اور کتاب علیحدہ جائے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ قصیدہ بھی کتاب کے ساتھ چھپنا چاہئے۔ میرزا مہر کو لکھتے ہیں:-

میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے مشتمل بر تہنیت فتح و عملداری شاہی ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ

ایک اور کاغذ تب پر لکھ کر بھیجوں پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے یعنی چھاپا ہوئی ہے یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے آپ اور منشی نبی بخش اور میرزا تفتہ منشی شیو نرائن سے کہہ کر اس کا طور درست کریں پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں یہ دو ورق آپ کے پاس بھیج دوں

میرزا تفتہ نے غالب کو لکھا تھا کہ کیا اسے نثر کا دیباچہ بنا دیا جائے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

> قصیدہ کا نثر سے پہلے لگانا از راہ اکرام و اعزاز ہے ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم میں اور انداز ہے یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سر رشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدہ اور دستنبو کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

**مسئلہ سرورق**

منشی شیو نرائن مالک مطبع نے اسی زمانے میں غالب کو خط لکھا تھا جس کے لفافہ پر نام کی جگہ میرزا نوشہ صاحب غالب مرقوم تھا۔ غالب اس پر بہت پریشان ہوئے اور ڈرے کہ کہیں کتاب کے سرورق پر بھی نہ چھاپ دیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

> آیا "پنج آہنگ" یا "مہر نیمروز" چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر یا آگرہ میں نہیں پہنچی۔ جو وہ (منشی شیو نرائن) میرا نام دیکھ لیتے؟ صرف اپنی نفرت عرف وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک وزرا کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا اگر صاحب مطبع نے "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا۔ کھویا گیا میری محنت رائگاں گئی۔ کتاب اور کی ہو گئی۔

**کتاب کا اشتہار**

غالب کو کتاب کے اشتہار کا بھی خاص خیال تھا لکھتے ہیں :۔

> ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کا اشتہار کیوں

نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداری کی فراہم ہو جائیں؟

**کتاب کے مصارف** اندور کے ایک رائے امید سنگھ تھے جنہوں نے "دستنبو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا، اور فرمایا تھا کہ صرف پچیس جلدیں انہیں دی جائیں بقیہ جلدیں غالب اپنی خوشی کے مطابق اپنے دوستوں میں تقسیم فرمائیں یہی خریداری حقیقت میں "دستنبو" کی طباعت کا ذریعہ بنی تھی۔ غالب کے مکاتیب میں "دستنبو" کے سلسلے میں رائے امید سنگھ کا نام بار بار آیا ہے مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

> میاں کیا باتیں کرتے ہو میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں شراب پینے کو نہیں.... منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھی ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا آگرہ میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا مسودہ بھیجا گیا آٹھ آنے قیمت ٹھہری پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بہ شمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرہ کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہتے ہے۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں سے پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے میں عزیزوں میں بانٹ دوں گا۔

**ممانعت طبع کا اعلان** غالب کو کتاب کے حقوق محفوظ کرنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں خاتمہ کتاب پر ممانعت طبع کا اعلان لکھ دیا جائے۔ پھر تفتہ اور شیو نرائن کی فرمائش پر انہوں نے خود یہ عبارت تجویز کر بھیجی۔

> نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوا لیا ہے اور میری رائے میں اس کا قاعدہ یہ قرار پایا ہے کہ اور صاحب مطبع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں اپنے مطبع میں چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ راے امید سنگھ نے شروع میں غالب کو پچیس جلدیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں کہا کہ غالب چالیس جلدیں لے لیں۔ چنانچہ غالب تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

کل جمعہ کے دن ۱۲ر نومبر ۱۸۵۸ء کو ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں سات کتابیں جو میرزا حاتم علی بیگ صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔

**منقش و مجلد نسخے** میرزا مہر نے صحافی اور نقاشی کے لئے جو کتابیں رکھ لی تھیں وہ پہنچیں تو غالب بہت خوش ہوئے۔ فرماتے ہیں :۔

بھائی جان کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا۔ گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ وقت شام سے

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب یہ محسل پہنچا

...... میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بتاؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی دو کی لوحیں ہیں یا اور پانچ لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس قسم کی ہوں گی۔

**"دستنبو" کہاں بکی** بہرحال غالب نے "دستنبو" کی جلدیں حکام میں اور دوستوں میں تقسیم کیں۔ ایک مکتوب سے جو اپریل ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک "دستنبو" کا پورا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ غالب نے منشی شیو نرائن سے یہ بھی پوچھا کہ "دستنبو" زیادہ تر کن لوگوں نے خریدی اور خود ہی رائے ظاہر کی تھی کہ یا تو انگریزوں نے خریدی ہو گی یا پنجاب کے رہنے والوں نے۔ منشی شیو نرائن نے جب اطلاع دی کہ لاہور کے ضلع میں زیادہ بکی۔ تو غالب نے لکھا۔

میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔

"پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" تینوں کا مجموعہ اس وقت کلیات نثر فارسی ہے۔ جس کا تیسرا ایڈیشن نولکشور کے مطبع نے ۱۸۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ غالباً اس کے بعد کوئی

[illegible]

ایڈیشن نہیں چھپا۔

### "قاطع برہان"

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے دنوں میں غالب خانہ نشین ہو گئے تھے۔ اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد شہر والوں بالخصوص مسلمانوں پر مدت تک جو مصیبتیں اور آفتیں مسلط رہیں ان کا نقشہ بھی غدر کے باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں غالب دوستوں سے عموماً منقطع تھے۔ اور زیادہ وقت تنہائی میں گزارتے تھے۔ وہ کچھ مدت تک "دستنبو" کی ترتیب میں مصروف رہے۔ اس سے فراغت پائی تو مطالعہ کے سوا وقت گزاری کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے پاس صرف "برہان قاطع" تھی جو فارسی لغات کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے مؤلف محمد حسین ہیں۔ جو تبریزی مشہور ہیں۔ اس لئے کہ ان کے آبا و اجداد تبریز سے ہندوستان آئے تھے لیکن وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور دکن میں ان کی ساری عمر گزری۔ اسی وجہ سے غالب ان کو جابجا "دکنی" لکھتے ہیں:—

> ہرگاہ غم تنہائی زور آوردے "برہان قاطع" را نگریستمے چوں آں سفینہ گفتارہائے نادرست
> داشت رہروم را از راہ مے برد و من آئین آموزگاری داشتم بر پیرواں خودم دل سوخت
> جادہ نمایاں ساختم تا بے راہہ نپویند۔

غالب نے اپنی کتاب کا نام "قاطع برہان" رکھا اور یہ سنہ ۱۲۷۶ھ (مطابق سنہ ۱۸۶۰ء) میں مکمل ہوئی۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

یافت چوں گوشمال زیں تحریر　　آنکہ "برہان قاطعش" نام است
شد مسمّٰی بہ "قاطع برہان"　　ور ز الفاظ سال اتمام است

اردو کے ایک خط میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

> اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہان قاطع" میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط۔ ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادر ہوا، میں نے سو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے چھپوانے

کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں تم اور چودھری صاحب اور جواد سخن شناس و منصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

**قاطع کی طباعت**

"قاطع برہان" ۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔ لیکن ۱۲۷۸ھ میں چھپی ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور نے "قاطع" کی طباعت کے لئے دو سو روپے مرحمت فرمائے تھے۔[1] لیکن "قاطع برہان" کے خاتمہ پر خود غالب نے بطور تقریظ جو عبارت لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب منشی نولکشور کی توجہ اور مہربانی سے چھپی تھی:۔

> اگر ایں جوانمرد بیدار دل بہ بستن شیرازہ اوراق پریشان نہ پرداختے۔ کاغذ مسودات "قاطع برہان" را کاغذ گر بردے و در آب آغشتہ فرد کوفتے یا سرمہ فروش خریدے تا چکسہ ہا ساختے۔

بہر حال "قاطع برہان" ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۲ء) میں نولکشور کے مطبع میں چھپی اور ایک روپیہ قیمت قرار پائی۔ غالب مجروح کو لکھتے ہیں:۔

> "قاطع برہان" کا چھاپہ ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق نمونہ آ گئی میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو پچاس جلدیں منگاؤں۔ دیکھئے نو من تیل کب میسر آئے اور رادھا کب ناچے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے جو دو سو روپے بسلسلہ طباعت "قاطع برہان" بھیجے تھے وہ دوسری ضروریات میں صرف ہو چکے تھے۔ کتاب منشی نولکشور نے چھاپ دی اور غالب کو پچاس جلدیں خریدنے کے لئے روپیہ کے متعلق تشویش ہوئی۔

**قاطع کی مخالفت کا طوفان**

ہندوستان کے عام فارسی دانوں کے متعلق غالب کی رائے نے ان کے خلاف کلکتہ میں جو ہنگامہ برپا کیا تھا۔ وہ "قاطع برہان" کی اشاعت پر زیادہ شدت، زیادہ تندی اور زیادہ وسعت کے ساتھ دوبارہ ابل پڑا۔ اور غالب کو تا دم زیست

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۳۔

اس سے بھی نجات نہ ملی۔ خواجہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ تقلید نہ محض مذہب میں بلکہ ہر فن، ہر کام اور ہر چیز میں اس درجہ ضروری ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے[۵]" چنانچہ "قاطع برہان" کے شائع ہوتے ہی جامد خیال مقلدوں کے لشکر جا بجا غالب کے خلاف جوش میں آ گئے۔ کسی کے سامنے یہ بات نہ تھی کہ غالب نے کیا لکھا ہے اور تحقیق کرنا چاہیے کہ اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ سب کے جوش مخالفت کا محرک محض یہ امر تھا کہ غالب کو صاحب "برہان قاطع" کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اس سلسلے میں غریب غالب کو چھوٹے پیمانے پر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کرنی پڑیں جو تقلید و جمود کے عام راستے سے الگ ہو کر ہر چلنے والے کو ہر دور، ہر عہد اور ہر دائرے میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں۔

**"قاطع" کی داد کے لئے پانچ اوصاف کی ضرورت**

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس شخص میں پانچ باتیں ہوں گی۔ وہ "قاطع برہان" کی داد دے گا۔ ورنہ عام آدمی محض "برہان قاطع" کے نام پہ جانیں قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ پانچ باتیں یہ ہیں:-

(۱) وہ عالم ہو۔

(۲) فن لغت کو جانتا ہو۔

(۳) فارسی زبان کا کافی علم رکھتا ہو اور اس زبان سے اسے لگاؤ ہو۔ اساتذہ سلف کا کافی کلام دیکھ چکا ہو اور اسے کچھ یاد بھی ہو

(۴) منصف مزاج ہو، ہٹ دھرم نہ ہو

(۵) طبع سلیم اور ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔

**مخالفین کے ایرادات**

"قاطع برہان" کے چھپتے ہی مخالفت کا جو ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اس کا نقشہ

---

[۵] یادگار غالب صفحہ ۴۰۔

غالب ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں :-

"معتقدان "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط ہے، یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے "برہان قاطع" نہیں ہو سکتی۔ تو صاحب "برہان قاطع" صحیح اور "قاطع برہان" غلط۔ برہان قطع کی فاعل ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ قبول نہیں کرتی۔ "قاطع برہان" میں جو برہان کا لفظ ہے مخفف "برہان قاطع" ہے۔ "برہان قاطع" کے رد کو قطع سمجھ کر "قاطع برہان" نام رکھا تو کیا گناہ ہوا۔ دوسرا ایراد یہ ہے کہ "با انگلشیان ستیز بے جا"[۵]۔ انگلش کا نون تلفظ میں نہیں آتا، میں پوچھتا ہوں خدا کے واسطے انگلش اور انگریز کا نون بیاعلان کہاں ہے۔ اگر ہے بھی تو ضرورت شعر کے واسطے لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل ڈالتے ہیں، اگر انگلش کے نون کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"قاطع برہان" کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں ابال آیا ہے۔ لکھا گیا ہے کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا کہ یہ تنک مایہ معارض اکابر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "قاطع برہان" کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت "برہان قاطع" اور "قاطع برہان" کی ایک غلط ہے "برہان قاطع" نے کیا لٹھا، نینو، چین سکھ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے۔ برہان جب تک غیر کے کسی برہان کو قطع نہ کرے کیوں کر "برہان قاطع" کا نام پائے گی۔ "برہان قاطع" کی صحت میں جتنی تقریریں کیجئے گا وہ "قاطع برہان" کی صحت ہونے کے کام آئے گی۔

---

[۵] غالب نے "قاطع برہان" کے آغاز میں ترتیب کتاب کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے غدر کے ذکر میں ایک قطعہ لکھا تھا جس کے ایک مصرعہ پر محولہ بالا اعتراض ہوا۔ قطعہ یہ ہے :-

چوں کرد سیاہ ہند در ہند　　با انگلشیان ستیز بے جا
تاریخ وقوع ایں وقائع　　"واقع شدہ رستخیز بے جا"

**مخالف و موافق کتابیں** "قاطع برہان" کی مخالفت میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی فہرست میری تحقیقات کے مطابق یہ ہے:-

(۱) "ساطع برہان" مولفہ میرزا رحیم بیگ

(۲) "قاطع القاطع" مولفہ مولوی امین الدین پٹیالوی۔

(۳) "محرق قاطع" مولفہ سعادت علی

(۴) "موید برہان" مولفہ مولوی آغا احمد علی

(۵) "شمشیر تیز تر" مولفہ مولوی عبدالصمد سلہٹی۔

غالب نے اور غالب کے دوستوں اور مریدوں نے جواب میں جو رسالے لکھے ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) "لطائف غیبی" مولفہ میاں داد خاں سیاح جس پر غالب نے سیاح کو "سیف الحق" کا خطاب دیا تھا۔

(۲) "دافع ہذیان" مولفہ مولوی نجف علی صاحب۔

(۳) "سوالات عبدالکریم" جس کے مولف غالباً عبدالکریم صاحب نامی کوئی شخص تھے۔

(۴) "نامۂ غالب" مولفہ غالب

(۵) "تیغ تیز" مولفہ غالب

ان میں سے "ساطع برہان"، "محرق قاطع"، "دافع ہذیان" اور "سوالات عبدالکریم" کا کوئی نسخہ مجھے کہیں سے نہیں مل سکا مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور سے ایک مرتبہ سنا تھا کہ لندن میں پرانی کتابوں کے ایک تاجر کے پاس یہ سارا مجموعہ موجود تھا۔

غالب کے مکاتیب میں ان کتابوں کا جہاں جہاں ذکر ہے اسے ذیل میں قسمت باسآ پیش کرتا ہوں جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان کی مختصر سی کیفیت بھی عرض کرتا جاؤں گا "تیغ تیز" میں جو کچھ لکھا ہے اسے الگ بیان کروں گا۔

**محرق قاطع** "محرق قاطع" کے متعلق منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:-

الا! "محرق قاطع" کا تمہارے پاس پہنچنا ع

کاسے کہ خواستم ز قضا شد نصیبم

میں اس لام خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کیے دو طالب علموں نے اردو میں دو رسالے جدا جدا لکھے دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ "دافع ہذیان"۔ "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا۔ اور "محرق" کو دھو ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ "دافع ہذیان"، "سوالات"، "لطائف غیبی" تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں یقین ہے کہ بہ تقدیم و تاخیر دو روز نظر افروز سے گزریں

یہ خط ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "محرق قاطع" اور اس کے جوابی رسائل ۱۸۶۴ء میں لکھے گئے تھے۔

**مؤلف دافع ہذیان** ذکا نے غالب کے خط میں ایک خط مولوی نجف علی صاحب مؤلف "دافع ہذیان" کے نام ملفوف کیا تھا۔ اس پر ذکا کو لکھتے ہیں:۔

ہاں صاحب خط وغیرہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام کا مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب پاس پہنچاؤں میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضا سے دافع ہذیان لکھ کر انھوں نے فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو یہ خط بجنسہ بھیج دیا یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھجوا دیں گے انھی کے اظہار سے دریافت ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالہ میں ہیں۔ نواب ناظم نے نوکر رکھا ہے

**مؤلف ساطع برہان** میرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

رحیم بیگ کا اصل وطن سردھنہ ہے اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے وہ آٹھ دس برس سے اندھا ہے نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

سیاح کو لکھتے ہیں:

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے۔ وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خبط ہے... رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھجواؤں گا مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو "لطائف غیبی" میں رد کر چکے ہو۔ بہرحال اب اس کے جواب میں فکر نہ کرنا۔

یہ خط ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ساطع برہان"۔ "لطائف غیبی" اور "دافع ہذیان" وغیرہ کے بعد چھپی تھی۔ اور اغلب یہی ہے کہ ۱۸۶۵ء کے ابتدائی حصہ میں طبع ہوئی ہو۔

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:-

"نامۂ غالب" کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واسطے اس ہیچ پوچ کے جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و فخر ہو۔

**"قاطع القاطع"** "قاطع القاطع" مولوی امین الدین پٹیالوی نے لکھی تھی اور ۱۲۸۳ء (۱۸۶۶ء) میں چھپی تھی۔ اس کی طباعت کا مصرعہ تاریخ یہ ہے ع

شمشیر آبدار زبان امین دین

اوپر جو اقتباسات پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ "دافع ہذیان" مولوی نجف علی صاحب نے فارسی میں لکھی تھی۔ اور "لطائف غیبی" سیاح نے اردو میں مرتب کی تھی۔

**لطائف غیبی** "لطائف غیبی" غالب نے خود نہیں چھپوائی تھی۔ بلکہ صاحب مطبع نے چھاپی تھی۔ غالب فرماتے ہیں :-

> میں نے اپنے زر سے "لطائف غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔

یہ خط پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ کا ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ "لطائف غیبی" ۱۸۶۴ء میں چھپی تھی۔ اس کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ ایک خط میں غالب فرماتے ہیں :-

> "لطائف غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں ..... یہ جو میں نے تیغ الحق کا خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ "لطائف غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اڑادیں۔

**کتاب غالب کی تصنیف تھی** "لطائف غیبی" چالیس صفحے کا ایک رسالہ تھا جو اکمل المطابع میں چھپا تھا۔ سر ورق پر یہ عبارت مرقوم ہے :-

> این نسخہ کہ ہست رشک ارژنگ ۔ بر خصم بود بہ سانِ خرچنگ
>
> منت ایزد را کہ نتیجۂ افکار محقق مدقق میاں داد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق یعنی این نسخۂ شگرف مسمّٰی بہ لطائف غیبی بجواب محرق قاطع برہان بہ صحت تمام وسعی مالا کلام نخستین بار بہ اہتمام میر فخر الدین در اکمل المطابع دہلی طراز انطباع پذیرفت۔

رسالہ اردو میں ہے۔ اور اس میں مختلف اعتراضات کا جواب بیس لطیفوں کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اصل رسالہ یا تو کاملاً غالب کا اپنا تصنیف کردہ ہے یا سیاح کی عبارت میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ اسے غالب ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ عبارت کی روانی اور اعتراضات کی شوخی میں غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح اس انداز کی عبارت نہیں لکھ سکتے تھے اور ان کی سیر

سیلح" جو غالباً ۱۸۶۲ء میں چھپی تھی اس امر کی گواہ ہے کہ ان کا انداز تحریر "لطائف غیبی" سے بالکل مختلف تھا۔

مثلاً منشی سعادت علی صاحب جامع "محرق" کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:۔

کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا۔ اور اب خانہ نشین ہے۔ موسوم بہ منشی سعادت علی نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ۔ نہ عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ کسی گاؤں میں کسی بستی میں کسی گھاٹ کسی باٹ پر اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سنا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

اہل نظر "قاطع" و "محرق" کو باہم دیکھیں گے تو "قاطع" کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی اور "محرق" کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں جیسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گینڈا لال

لطیفۂ دوم میں فرماتے ہیں:۔۔۔

اے صاحبان فہم و انصاف عبارت "محرق قاطع برہان" کو دیکھا چاہیے غلط بحث اطناب ممل، سوء ترکیب، تباہی روزمرہ، غلطی فہم۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا عامیان معوج الذہن کی نثر اور کیسی ہو گی۔ خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پھکڑ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک بھٹیارا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک شہدے کو کسی نے چھیڑ دیا ہے وہ فحش بک رہا ہے۔

کتاب میں بعض مطالب ایسے آئے ہیں جن کے متعلق صحیح واقفیت صرف غالب ہی کو ہو سکتی تھی۔ مثلاً منشی سعادت علی نے ایک موقع پر لکھا تھا جو "محرق" میں چھپ گیا تھا۔ "من این قدر قلم را چرا سود" اس کے جواب میں "لطائف غیبی" مظہر ہے کہ قلم کے واسطے فرسودن ہوتا ہے۔ نہ کہ سودن۔ ایک دوست نے کہا۔

منشی جی نے خفا ہو کر قلم کو سرمہ کی مانند پیس ڈالا ہوگا۔ میں نے کہا کہ "من" کی خبر "سود" بھلا

اس کی کوئی وجہ؟ ورنہ تاویل کرو "سود دم" کی جگہ "سود" کے کیا معنی؟ اس ظریف نے کہا کہ سود دم میں "دم" کی صورت پائی جاتی ہے اور منشی جی "بے دم" ہیں یعنی جو حرف متکلم کا ہے۔ یہ دم کے ساتھ آتا تو خدانخواستہ منشی جی دمدار بن جاتے۔

اس کے بعد لطیفہ لکھتے ہیں کہ

شاہ عباس ثانی پادشاہ ایران کے عہد میں حکیم شفائی اصفہانی بڑا شیوہ بیان اور ہمہ دان شاعر تھا۔ مومن خان ایوزباشی میں اور اس میں عداوت پیدا ہوئی۔ حکیم شفائی نے اس کی ہجویں لکھیں۔ از انجملہ ایک ترکیب بند نے بڑی شہرت پائی اور قبول طبع خاص و عام ہوا۔ پہلے بند کے دو شعر یہ ہیں ؎

مومن ملعم بازی جہلاں بہ کجا رفت — یا کاری صد در صد کرماں بہ کجا رفت
آں گادُم از سینہ بر دل سنہ کہ مے بُرد — جدت بہ در خانہ یاراں بہ کجا رفت

الواط و اوباش اصفہان ہر رہ گزر میں دف و چنگ کے ساتھ اس ترکیب بند کو گاتے پھرتے تھے۔ مومن خان اس پر خفا ہوتا تھا۔ مگر اس طائفۂ بے نام و ننگ سے کیا کہہ سکتا تھا۔ ناچار اپنے گھر بیٹھ رہا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس جماعت نے اس کے در دولت پر شد و مد سے گانا بجانا شروع کیا۔ پایان کار مومن خاں اپنے پیٹ میں چھری مار کر مر گیا۔ میں ڈرتا ہوں منشی جی بھی ان لطائف کو دیکھ کر کہیں اپنے کو ہلاک نہ کریں۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ میاں داد خاں یہ کام ہے۔ غیرت والوں کا۔ منشی جی کی طرف یہ احتمال بیجا ہے

غرض میری رائے میں یہ کتاب غالب کی اپنی تصنیف کردہ ہے۔ اگرچہ میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی۔

**نامہ غالب**

"نامۂ غالب" غالب نے خود چھپوایا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"نامۂ غالب" صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپے جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے ان کی قیمت مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلد چھپوائی دوستوں کو

دور و نزدیک بانٹ دی۔ آج یک شنبہ ہے پارسل روانہ نہ ہوگا۔ جتنے یہ نسخے میرے پاس ہیں کل تمہیں بھجوا دوں گا۔

یہ خط ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے۔ ظاہر ہے کہ نامہ غالب ۱۸۶۵ء ہی میں چھپا یا گیا ہوگا۔ رسالہ "ہندوستانی" بابت جنوری ۱۹۳۴ء (صفحہ ۱۰۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ "نامہ غالب" اودھ اخبار کے دو نمبروں (۱۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء) میں بھی شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر نے اس پر جو تمہیدی عبارت لکھی تھی وہ ذیل میں درج ہے:۔

> جناب ممدوح (غالب) نے ایک کتاب "قاطع برہان" میں اکثر لغات و محاورات کے مورد استعمال کی تصحیح اور اغلاط کتاب "برہان" کی بہ عبارت دلچسپ اصلاح فرمائی۔ اس پر بعض حسود کوتہ اندیش نے بہ تقتضائے کور باطنی جبلی اور نیز بہ امید اس کے کہ ایسے کامل الفن طوطی ہند کے مقابلے میں کچھ تھوڑی بہت چھپ چھپا کر کے عوام کالانعام کی نظروں میں کسی طرح سرخروئی حاصل کریں بجائے داد کے بیداد کیا کہ زد بکلام بلاغت نظام میں محنت بیجا اٹھائی مگر لطیف الطبع میاں داد خاں صاحب سیاح رفیق سید غلام بابا صاحب رئیس سورت نے ان تشکیلات کو بہ براہین شائستہ رفع کیا۔ اسی طرح میرزا رحیم بیگ نامی کو بھی خلل دماغ ہوا تھا ان کی اصلاح مزاج کے واسطے حضرت (غالب) نے خود توجہ فرمائی چنانچہ وہ نامہ بلاغت آگین میں بجنسہ درج ذیل ہے۔

**دوستوں سے استعانت**

غالب مخالفوں کے جواب کے لئے خود بھی دوستوں میں تحریک کرتے تھے مثلاً نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شہاب الدین نے "محرق قاطع" کا ایک نسخہ میرے کہنے پر بھیجا ہے اگر فرصت مساعدت کرے تو اس کی غلطیاں جمع کر کے مجھے بھیج دو۔

> میرا ایک دوست ہے کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے ان حضرات کا خاکہ اڑا رہا ہے نیر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے تم بھی بھائی مدد دو۔

**خواجہ غلام غوث بیخبر کا معاملہ**

غالب اس زمانے میں بہت مشوش تھے اور بے حد ذکی الحس ہو گئے

تھے کسی نے کہہ دیا کہ آپ کے عزیز شاگرد خواجہ غلام غوث خاں بیخبر "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ غالب نے بے تاب ہو کر فوراً خواجہ صاحب کو لکھا۔ کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ اصل خبر بالکل غلط تھی۔ خواجہ صاحب نے اس پر غالب سے شکوہ کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

> پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں مورد نہیں ہو سکتا جگہ استعجاب پر ہے محل استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیا کا یہ حال ہے تو "وائے برحال ہم اشقیا کے" یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیا داری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں لیکن فقیر آزاد ہوں: نہ شیّاد و کیّاد۔

**"قاطع برہان" کی دوبارہ طباعت**

غالب نے "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپوانے کا ارادہ کیا نواب یوسف علی خاں نے لکھ بھیجا کہ اپریل ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کے ساتھ دو سو روپے مزید پہنچیں گے لیکن اپریل کے آخری عشرہ میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا[1] سیف الحق سیاح کی وساطت سے نواب میر غلام بابا خاں سے امداد کی درخواست کی گئی نواب صاحب نے گھڑی بھیج دی[2]۔ غالب نے دوبارہ لکھا تو ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو نواب میر غلام بابا خاں نے سو روپیہ کی رقم بھیج دی[3]۔ غالب نے کاغذ منگا کر کتاب چھپنے کے لئے دے دی وہ خود اکتوبر ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں بہادر کی تخت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رام پور چلے گئے۔ کتاب دہلی میں اکمل المطابع میں چھپ رہی تھی۔ مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کو ۳ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے لکھتے ہیں:۔

> "قاطع برہان" کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈی (سو روپے کی باقی) حکیم جی (حکیم غلام نجف خاں) کو بھیج دی ہے حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ ان سے رسید لکھوا بھیجو۔ اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دیجیو

---

[1] اردوئے معلّٰی صفحہ ۱۳ [2] اردوئے معلّٰی صفحہ ۱، [3] اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۲۔

بھیج دوں گا یا آ کر دوں گا۔

طبع ثانی میں غالب نے کچھ فوائد بڑھا دیئے تھے اور اس کا نام ”قاطع برہان“ کے بجائے ”درفش کاویانی“ رکھا تھا۔ اس کا کوئی نسخہ مجھے نہیں مل سکا۔ عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :۔

”قاطع برہان“ میں اور مطالب بڑھائے ہیں اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے ”درفش کاویانی“ اس کا نام رکھا ہے۔

غالب ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو رامپور سے واپس آئے تو ”درفش کاویانی“ تیار ہو چکی تھی سیاح کو لکھتے ہیں :۔

اجی ہاں میاں سیف الحق ! رامپور سے آ کر تین سو جلدیں ”درفش کاویانی“ کی تیار پائیں۔ تو میر غلام بابا خاں کے حصہ برادرانہ کو ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنایا۔ اس پر ٹاٹ لپٹوایا۔ ڈاک گھر بھجوایا سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے مفلٹ والے ریل والے بلفظ متفق اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں تم یہ رقعہ حضرت (نواب میر غلام بابا خاں) کو پڑھوا دو۔ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں مجھ کو لکھو۔

”مؤید برہان“ غالب کے پاس ۱۸۶۷ء میں پہنچی تھی۔ وہ خود ذکا کو ۱۴ مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

”مؤید برہان“ میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بہ قید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں وہ تمہارے پاس بھیجوں گا بشرط مودت بہ شرط آنکہ جانی نہ رہی ہو اور باقی ہو یہ کہیں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب ضرور دو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب سمجھو درج کر دو۔

**تیغ تیز** ”مؤید برہان“ کے بعد غالب نے اردو زبان میں ”تیغ تیز“ لکھی یہ تیس صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جو ”اکمل المطابع“ میں چھپا۔ اس کی تمہیدی عبارت میں غالب نے ”محرق قاطع“ ”لطائف غیبی“ ”ساطع برہان“ ”نامہ غالب“ اور ”قاطع القاطع“ کا ذکر کیا ہے مؤلف ”محرق“ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

ایک مرد بے مغز سیح الذہن نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش (قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی اور "محرق قاطع" اس کا نام رکھا۔

## مؤلف "ساطع برہان" کے متعلق فرماتے ہیں:-

ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک تحریر مسمّیٰ بہ "ساطع برہان" نکال لائے۔ مطالب مندرجہ لغو بہ نسبتہ "محرق قاطع" کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تضییع اوقات جانا۔

مؤلف قاطع القاطع

## مولف "قاطع القاطع" کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:-

میاں امین الدین کہ اب پٹیالہ میں ملقب بہ مدرس ہیں انہوں نے "قاطع القاطع" چھپوایا۔ بتعداد غلطی ہائے علمی سے بعد صرف مقاعد النحو و صرف فارسیت کی اس قدر رعائت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں باقی سوائے عربی و نثری اور فارسی سروتہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے اور بھٹیارے استعمال کرتے رہے ہیں..... یارب میاں امین الدین کس بری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلاکے رنڈیں نے تمام الفاظ مستعملہ ترمہ نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت عرفی کی نالش ہو جاتی تو میاں پہ کیسی بنتی مگر میرے کبر نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا[1] ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سجل ہے۔

مؤلف "مؤید برہان"

## مولوی احمد علی صاحب مؤلف "مؤید برہان" کی نسبت فرماتے ہیں:-

عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں بے ابجق و ناسزاگوئی میں کمتر جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کئے، اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں شاعر نہیں۔ آخر شرافت امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے صاحب عز و شان ہے۔ عالی خاندان ہے امرائے ہند، رؤسائے ہند، مہاراجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگان سرکار

---

[1] خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے "قاطع برہان" کی مخالفت میں رسالے لکھنے والوں میں سے ایک کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کی تھی لیکن جب کامیابی کی امید نہ رہی تو راضی نامہ داخل کر دیا (ملاحظہ ہو "یادگار غالب" صفحہ ۴۶)

انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب ہے، جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سٹری اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں فی الحقیقت یہ بدلیل بفحوائے "ضرب الغلام اہانت المولیٰ" گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا۔ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا میں نے "معلم امین بے دین" کو شیطان کے حوالے کیا۔ اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا۔ اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو سترہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان فصلوں میں مختلف اعتراضات پر تبصرہ کیا ہے۔ اور ان کے جوابات دیے ہیں آخر میں مختلف، اعتراضات کو استفتا کی شکل دے کر سولہ سوالات مرتب کیے ہیں اور ہر سوال کے ساتھ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی طرف سے جواب درج ہے۔ تمام جوابات میں غالب کی تائید کی گئی ہے۔ آخر میں خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم۔ مولوی محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ اسکول دہلی۔ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مجیب یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے جوابات کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

**منظومات کی جنگ** "مؤید برہان" کے متعلق غالب نے فارسی میں اکتیس شعر کا ایک قطعہ بھی کہا تھا جس کے چند شعر خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں درج کیے ہیں۔ اس قطعہ پر منظومات کی جنگ شروع ہو گئی۔ مولوی احمد علی صاحب مؤلف "مؤید برہان" کے ایک شاگرد عبدالصمد صاحب فدا سہی نے غالب کی "تیغ تیز" کے جواب میں ایک رسالہ "شمشیر تیز تر" کے نام سے مرتب کیا تھا جو ۱۸۶۸ء میں مولوی غلام نبی خاں کے مطبع نبوی میں عبداللہ خاں کے زیر اہتمام چھپا۔ اس رسالہ میں منظومات کی جنگ بھی موجود ہے اس میں سب سے پہلے غالب کا قطعہ درج ہے۔ پھر اس کے جواب میں اسی زمین میں مولوی عبدالصمد فدا کا ایک قطعہ ہے اس کے بعد عبدالصمد کے جواب میں غالب کے دو شاگردوں باقر علی خاں باقر اور فخر الدین حسین خاں سخن کے دو قطعات ہیں جو اسی زمین میں کہے گئے۔ آخر میں عبدالصمد نے

ان دونوں قطعوں کا جو جواب دیا تھا وہ درج ہے۔ اس طرح غالبؔ کے قطعہ سمیت اس میں بیس جواب اور جواب الجواب کے طور پر دو سو دو شعر کہے گئے یہ چیزیں اب بالکل ناپید ہیں میری آرزو تھی کہ انہیں یہاں تمام درج کردوں لیکن گنجایش اجازت نہیں دیتی البتہ غالبؔ کے قطعہ کا اندراج ضروری ہے یہ "سبد چین" میں چھپا تھا دوبارہ کہیں شائع نہ ہوا۔

## قطعہ

در سپاسگزاری و یادآوری بہ عالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری از جانب
پوزش خواہ بے راہ روی اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ — در خصوص گفتگوے پارسی انشا کردہ است
ہیچ دیگراں را کہ در سند است از ایراں جدا — شامل اقلیم ایراں بے محابا کردہ است
قوم بر ہیچ را بہ ایرانی نژاداں دادہ خلط — ترک ترکان سمرقند و بخارا کردہ است
در جہاں تو ام پیرو دے وشت قتیل — پیشوائے خویش ہندو زادہ را کردہ است
ہندیاں را در زباں دانی مسلّم داشتہ — تا چہ اندر خاطر والاے او جا کردہ است
خوش بر آمد با ہمہ ہندوستانیاں ہیچ خوش — تکیہ آرے بر ولادت گاہ آبا کردہ است
ہر کہ بینی با زبان مولد خود آشنا است — ساز نطق موطن اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود — غالبش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامع[۱] "برہان" و لالہ ٹیک[۲] چند — لابہ و سوگری و لطف و مدارا کردہ است
طرفداری
داوری گاہے بنا فرمودہ در وے ہر سہ را — منصف صدر امین و صدر اعلیٰ کردہ است
گر چنیں با ہندیاں دارد تولا در سخن — من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است
میل او با ہر کسے از ہند و حیفش خاص من — حیف و میلے با دو عالم شور و غوغا کردہ است
کردہ است از خوبی گفتار من قطع نظر — ظلم زیں قطع نظر بر چشم بینا کردہ است

---

[۱] محمد حسین تبریزی ثم دکنی مؤلف برہان قاطع [۲] لالہ ٹیک چند بہار مؤلف بہار عجم ۱۲

مطلب از بدگفتن من چیست گویا نیک مرد
مزد ایں کار از حق آمرزش تمنا کردہ است

ورچنیں نبود چناں باشد کہ در عرض کمال
تا بر آرد نام ازیں ہنگامہ پیدا کردہ است

صاحب علم و ادب وانگہ ز افراط غضب
چوں سفیہاں دفتر نفرین و ذم وا کردہ است

در جدل دشنام کار سوقیاں باشد ولے
ننگ دارد علم زاں کارے کہ آغا کردہ است

انتقام جامع "برہان قاطع" مے کشد
آنچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است

من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت
وائے بر وے گر بہ تقلید من اینہا کردہ است

زشت گفتم لیک داد بذلہ سنجی دادہ ام
شوخی طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

مے کند تائید "برہاں" لیک برہاں ناپدید
نیست جز تسلیم قولش ہرچہ انشا کردہ است

سستی طرز خرام خامۂ "برہاں" نگار
یا نمے دانست یا دانستہ اخفا کردہ است

ہر سخن توہین و بہر خویش تحسین جابجا
ہم مرا ہم خویش را در دہر رسوا کردہ است

آید و بیند ہمہ اندر بہ کتاب مولوی
ہرچہ از ہنگامہ گیراں کس تماشا کردہ است

لغو و حشو و ادعائے محض و اطناب مُمِل
مار و موش و سوسمار و گربہ یکجا کردہ است

بگذر از معنے ہمیں الفاظ را بر بستہ بیں
بادہ بنود شیشہ و ساغر مہیا کردہ است

یافتم از دیدن "تاریخہائے آں کتاب"
خود بدم گفت و بہ احباب خود ایما کردہ است

غازیاں ہمراہ خویش آوردہ از بہر جہاد
تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

جوش زد از غایت قہر و غضب خوں در دلش
تا زبانش را بدیں کلپترا گویا کردہ است

آتش خشمے کہ سوزد صاحب خود را نخست
در دلش ہم چوں شرر در سنگ ماوا کردہ است

چوں نباشد باعث تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خستہ تر گر خستہ پروا کردہ است

# چودھواں باب

## کلام، طریق اصلاح اور مشاعرے

ہندرا رند سخن پیشہ گمنامے ہست
اندریں دیر کہن مے کدہ آشامے ہست

غالب نے اپنے دوست سراج الدین احمد خاں کی فرمائش پر اپنے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا جو مجموعہ "گل رعنا" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ ابتدا میں اردو شعر کہنے شروع کئے تھے[51]۔ فارسی دیوان کے خاتمہ کی عبارت میں جو ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) میں لکھی گئی تھی۔ فرماتے ہیں گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے[52]۔ خواجہ حالی نے لالہ بہاری لال مشتاق (شاگرد غالب) کے بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ آگرہ کے ایک صاحب لالہ کنہیا لال جو غالب کے ہم عمر تھے ایک مرتبہ دہلی آئے اور اثنائے گفتگو میں غالب کو یاد دلایا کہ آپ نے پتنگ بازی کے متعلق ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اس کے آخر میں فارسی کا یہ شعر لاحق کر دیا تھا

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

لالہ کنہیا لال صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ مثنوی آٹھ نو برس کی عمر ہی میں کہی گئی تھی[53]۔

معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شعر بھی کہنے شروع کر دیتے تھے خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں انہوں نے ایک فارسی غزل کہی تھی جس کی ردیف "کہ چہ" تھی۔ یہ غزل ان کے استاد شیخ معظم کے پاس پیش ہوئی تو شیخ نے ردیف کو مہمل بتایا۔ لیکن ایک روز

---

[51] کلیات نثر فارسی صفحہ ۹۵ [52] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۶ [53] یادگار غالب صفحہ ۹۷۔

غالب کو ظہوری کے کلام میں "کہ چہ" بہ معنی "چہ" کی سند مل گئی۔ انہوں نے شیخ معظم کو یہ سند دکھائی تو وہ حیران رہ گئے۔ اور فرمانے لگے کہ فارسی زبان کے ساتھ تمہیں خداداد مناسبت ہے تم ضرور فارسی شعر کہا کرو۔[۵۱]

**اردو شاعری اور فارسی شاعری**

غالب ایک اردو مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

> خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط[۵۲] عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چندے روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔

نواب انور الدولہ کو فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

> از دیرباز دستان سرائی اردو ندانم ہمانا از رضا جوئی شہریار سلیمان حشمت (بہادر شاہ مرحوم) گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن دیدہ بہ فرمان بانوئے بلقیس دستگاہ (نواب زینت محل بیگم والدۂ شہزادۂ جواں بخت) در ریختہ بدیں ردیف ناروا دل آویختن[۵۳] اگر در مقطع غزل سرمستانہ ہوئے زدہ باشم[۵۴] آں[۵۵] یکے گمان کمالے (کہ نہ داشت) داشت پنداشت کہ روئے سخن سوئے اوست در مقطع غزلے کہ مرد بہ ہنجار ستیزہ گام[۵۶] زد و دانست کہ گفتار مرا پاسخ سازد۔

اسی مکتوب میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

> آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند بہ آئین نیاکان خویش سلطان سنجر ناز کلاہ و کمر

---

[۵۱] یادگار غالب صفحہ ۶۹ [۵۲] وہ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) میں شاہی ملازم ہوئے تھے۔ اور اس وقت بہ حساب سنین قمری ان کی عمر ۵۵ برس کی تھی۔ ملاحظہ ہو کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۲۷۔

[۵۳] یہ "سہرے" کا قصہ ہے۔ جو غالب کے بیان کے مطابق نواب زینت محل کی خاص فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

[۵۴] ؎ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں — دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

[۵۵] ذوق

[۵۶] ؎ جن کو دعوے ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ورنہ بہ فرہنگ فرزانگان پیش "پیرکی" آسا علم و ہنرے نیستم درویش باشم و آزادانہ راہ سپرم ذوقِ سخن کہ از ازل آوردہ بود رہبری کرد و مرا بہ آں ز ریقیت الٰہی کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایان است بہ لشکری و دانشوری خوش نیست صوفی گری بگزارد بہ سخن گستری پیوستے آں لیا کز پیہم چناں کردم دسفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم قلم علم شد و تیرہائے شکستہ نیاگان قلم ہا زد بہ روزگار دیدہ ورسے نہ بود یا پردہ بہن نہ پرداخت۔

نواب شمس الامرا حیدرآبادی کے نام سے فارسی خط میں لکھتے ہیں:۔

شعر و سخن را پایہ والا و لکہ ترین پیوند روحانی است و خامہ را بدو فطرت در گہر افشانی۔ در آغاز ریختہ گفتمے و بہ آرد و زبان غزل سرا بودمے۔ تا بہ پارسی زبان ذوق سخن یافت و ازاں وادی عناں اندیشہ برتافت دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آمدہ و آں را گلدستہ طاق نسیان کرد کہ امیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی نگار است۔

نواب علی بہادر خاں والی باندہ کو لکھتے ہیں:۔

از دیر باز بہ گفتن ریختہ نگرایم و بہ پارسی سخن سے سرایم لیکن چوں رضائے خاطر حضرت ظل الٰہی دراں است کہ ایں گونہ گفتار برائے حضرت فلک رفعت ارمغان بردہ باشم ناچار گاہ گاہ ریختہ سے گویم۔

بہ ہر حال غالب کی تمام تحریرات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں انہوں نے اُردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ پھر فارسی میں کہنے لگے۔ چند سال کے بعد کلیتہً فارسی کے لئے وقف ہو گئے۔ جب قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہوا تو بادشاہ کی خوشنودی کے لئے پھر اُردو میں شعر کہنے لگے۔ ان کا موجودہ اُردو دیوان زیادہ تر اسی دور کا ہے۔

**ملا عبدالصمد کی صحبت کا اثر**

میرا خیال ہے کہ فارسی پر غالب کی خاص توجہ ملا عبدالصمد کی صحبت کی وجہ سے ہوئی جو ۱۲۲۶ھ میں آگرہ آئے اور دو برس غالب کے پاس رہے۔ اس وقت غالب کی عمر صرف چودہ برس کی تھی۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ غالب کے ابتدائی کلام میں فارسیت بہت

زیادہ ہے۔ بلکہ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے فارسی شعر کہہ لیتے تھے اس کے بعد کہیں کہیں اس میں فارسی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ داخل کر دیتے تھے یا کہنا چاہیے کہ ان کا تخیل فارسی میں شعر کہتا تھا اور وہ کا نذر تکلفاً اسے اردو بنا لیتے تھے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ابتدائی اردو کلام میں فارسیت اس وجہ سے بہت نمایاں تھی کہ انہیں اردو آتی نہ تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ آگرہ کی رہنے والی تھیں لہٰذا ان کی مادری زبان لازماً اردو تھی۔ ابتدائی کلام میں فارسیت کے غلبہ کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی میں زیادہ تر فارسی کلام دیکھنے لگے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ پر بیدل کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اور اردو میں بیدل کے انداز کی پیروی فارسیت کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے بغیر ممکن نہ تھی۔

**فارسی پر ناز اور اردو سے نفرت**

غالب کو اپنے اردو اشعار کے متعلق بہت زیادہ حسن ظن نہ تھا۔ اور وہ فارسی شاعری ہی کو خداداد کمالات کی حقیقی نمائش گاہ سمجھتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کے فارسی کلام کو بلا تکلف فارسی زبان کے مشاہیر اساتذۂ فن کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔ پھر عام اساتذہ میں سے کسی کی ایک چیز اچھی ہو گی کسی کی دو چیزیں اچھی ہوں گی لیکن غالب کے ذوق کی جامعیت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ ان کی ہر چیز اچھی ہے۔ مثنوی، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی۔ نثر میں واقعات نگاری، علمی بحثیں، انتقاد و غرض ہر دائرے میں وہ یکساں قابل قدر ہیں لیکن ہندوستان میں غالب کی شہرت کا مدار صرف ان کے اردو کلام پر ہے۔ سہرے کے باب میں ذوق کی غلط فہمی اور غلط اندیشی کے باعث جو صورت حالات پیدا ہوئی تھی۔ اس پر غالب نے ایک فارسی قطعہ بھی ذوق کو مخاطب کر کے لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں:۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ      کے بہ پرگوئی فلاں در شعر ہمسنگ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن      کم تراز بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است از سواد ریختہ      کاں دو سہ برگے ز گلستان فرہنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ      بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

فارسی بیں تا بہ بینی کاندر اقلیم خیال  مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است

……

دلنشیں اہم فنی شرط است و آں دانی کہ نیست  از تو بود نغمہ در سازے کہ در چنگ من است
در سخن چوں ہم زبان و ہم نوائے من نہ  چوں لست پا پیچ و تاب از رشک آہنگ من است
راستی می گویم و مے از راست سر نتواں کشید  ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

غالب کی یہ رائے اپنے اردو اشعار کے متعلق ہے۔ اردو کے مکاتیب کے متعلق معلوم ہے کہ غالب ان کی ترتیب و اشاعت کو اپنی شہرت سخنوری کے منافی سمجھتے تھے لیکن یہی یک دو جزو "دیوان ریختہ" اور یہی منافی شہرت سخنوری مکاتیب آج غالب کی شہرت کے علم کو اردو زبان کے تمام ندرت کار شاعروں اور نثر نگاروں سے بدرجہا بلند تر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ارباب ذوق اندازہ فرمائیں کہ جس شاعر کے "گلستان فرہنگ" کے "برگ و ثمر" کی جاذبیت اور حسن و خوبی کا یہ عالم ہے۔ اس کے "نقشہائے رنگ رنگ"۔ اور اس کے "نسخہ ارژنگ" کا کیا رنگ ہوگا لیکن افسوس کہ فارسی کا ذوق ہندوستان میں بہت کم ہو گیا ہے۔ اور فطرت غالب کے کمالات کی اس حقیقی جولانگاہ سے عام طور پر بہت کم روشناسی حاصل ہے۔

**"نسخہ حمیدیہ"** غالب نے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء تک جب کہ ان کی عمر چوبیس پچیس برس کی تھی۔ اردو کا ایک اچھا خاصا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ جو اسی زمانے میں نواب غوث محمد خاں رئیس بھوپال کے فرزند ارجمند نواب فوجدار محمد خاں کے پاس نقل ہو کر پہنچ گیا تھا۔ یہ نسخہ چند سال ہوئے ہیں اعلیٰحضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ و حفظ بقاءہ) کی خسروانہ توجہات گرامی کی برکت سے "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو گیا ہے "نسخہ حمیدیہ" کی تمہید میں مرقوم ہے کہ یہ نسخہ ۱۵ صفر المظفر ۱۲۳۷ھ کو حافظ معین الدین صاحب نے لکھا تھا[1]۔ اس کے غائر مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر کلام بالکل ابتدائی دور کا

---

[1] تمہید "نسخہ حمیدیہ" صفحہ د

ہے جبکہ غالب کی دقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت مسحور تھی اور وہ بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نہ ماغی قوت نے بلوغ حاصل کیا تھا۔ نہ انداز بیان پر پوری قدرت و دستگاہ حاصل ہوئی تھی نتیجہ یہ تھا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ و ترکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے جس طرح آج کل کے بعض فرومایہ اور کور ذوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے اور صاف بات کو پیچیدہ، مبہم اور عسیر الفہم بنا دینا ان کے نزدیک غالب کا رنگ ہے۔

**بیدل کی پیروی** اس زمانے میں غالب پر بیدل کا رنگ اتنا غالب تھا کہ انہوں نے متعدد غزلوں کے مقطعوں میں مختلف طریقوں پر بیدل کا ذکر کیا ہے مثلاً؎

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہو
مجھے رنگ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

..........................

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نسخۂ بیدل باندھا

..........................

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

..........................

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اس زمانے کے کلام میں محض ردیفیں ہی فارسی نہیں ہیں بلکہ پورے مصرعے فارسی

کے چلے آتے ہیں مثلاً ؎

بسان جوہر آئینہ از ویرانی دلہا
غبار کوچہ ہائے موج ہے خاشاک ساحلہا

……

نفس اے خندہ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا

……

بہ شغل انتظار مہوشاں در خلوت شبہا
سر تار نظر ہے رشتہ تسبیح کوکبہا

غالب اپنے شاگرد عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :-

ابتداء فکر سخن میں بیدل و اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا ، چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دئیے۔

یہی وہ دیوان ہے جو "نسخہ حمیدیہ" کے نام شائع ہوا

**نسخہ حمیدیہ کی تصحیح و ترمیم کا مسئلہ**

مفتی انوار الحق صاحب اصل نسخہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس پر جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں کی مہریں ثبت ہیں بعض سنہ ۱۲۴۸ھ کی اور بعض سنہ ۱۲۶۲ھ کی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے۔ اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انہوں نے خود اس میں جا بجا

اصلاحیں کی ہیں کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرزِ تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے۔ کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے۔ یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں۔ جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے۔ اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے۔

**نسخۂ حمیدیہ کبھی غالب کے پاس نہیں گیا**

لیکن میرے خیال میں مفتی صاحب کی یہ رائے محلِ نظر ہے۔ اس کے وجوہ اختصاراً درج ذیل ہیں:-

(۱) غالب ۱۸۲۷ء میں کلکتہ گئے۔ اور جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے "د" کی تختی میں ان کی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

واں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

اس کے آخر میں ایک قطعہ ہے جس میں لکھنؤ کا ذکر ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

قطعہ سے ظاہر ہے کہ یہ غزل یقینی طور پر لکھنؤ میں کہی گئی تھی اور آخری شعر صاف بتا رہا ہے یہ کلکتہ جاتے وقت کہی گئی تھی لیکن مطبوعہ "نسخۂ حمیدیہ" میں یہ غزل غالب کے اس کلام میں

---

لہ تمہید نسخۂ حمیدیہ صفحہ ۶

شامل ہے جس کا کوئی ہم طرح شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں[1] پس اگر یہ نسخہ غالب کے کلکتہ سے واپس آنے کے بعد بغرض تصحیح و ترمیم ان کے پاس گیا اور انہوں نے غزلیں حاشیہ پر بڑھائیں تو اس غزل کو کیوں حاشیہ پر نہ لکھا۔ درآنحالیکہ یہ یقینی طور پر سنہ ۱۸۲۷ء میں کہی گئی تھی اور مفتی صاحب کے دعوے کو صحیح سمجھا جائے تو نسخہ حمیدیہ سنہ ۱۲۴۸ھ (سنہ ۱۸۳۲ء) اور سنہ ۱۲۶۱ھ (سنہ ۱۸۴۴ء) میں باہر گیا ہے ظاہر ہے کہ کلکتہ جانے کے بعد اس نسخہ کا غالب کے پاس پہنچنا قابل تسلیم نہیں۔

(۲) غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو اپنے ایک خط مرقومہ ۲۷ جولائی سنہ ۱۸۶۴ء میں لکھتے ہیں :-

بیس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

نواب الٰہی بخش خاں معروف کا انتقال سنہ ۱۲۴۲ھ (مطابق سنہ ۱۸۲۶ء) میں ہوا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ غزل سنہ ۱۸۲۶ء سے پہلے کہی گئی لیکن مطبوعہ "نسخہ حمیدیہ" میں اسے بھی اس کلام میں شامل کیا گیا ہے جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں[2] اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بھوپال والا نسخہ سنہ ۱۸۲۵ء کے بعد کبھی بھی غالب کے پاس نہیں گیا

(۳) یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ خود غالب نے کہیں اس نسخہ کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں غدر کے بعد اپنے کلام کے مختلف نسخے جمع کرنے کی سخت ضرورت پیش آئی تھی۔ اگر "نسخہ حمیدیہ" غالب کے پاس بغرض تصحیح و ترمیم آتا رہا تھا تو کیا سبب ہے کہ انہوں نے ضرورت کے وقت اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کی؟ میرا خیال ہے کہ غالب کو اس نسخہ کا سرے سے علم ہی نہ تھا۔

---

[1] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۱۵۱ [2] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۲۶۸ ۔

**اُردو اشعار تعداد** سرسری اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قلمی "نسخہ حمیدیہ" میں قصاید اور گیارہ رباعیات کے علاوہ کل ۱۸۹۰ اشعار ہیں۔ ان میں سے غالب نے یا شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد کی روایت کے مطابق مولانا فضل حق خیرآبادی اور مرزا خاں کوتوال[1] دہلی نے انتخاب کے وقت کل ۱۰۷۳ اشعار لیے۔ ۱۸۲۵ء کے بعد آخر عمر تک چالیس برس میں غالب نے اردو غزلیات میں ۹۹۰ اشعار کہے۔ بعد کے قصائد، قطعات اور مثنوی انبہ کے اشعار کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ رباعیات گیارہ ہیں یعنی اگر سب اشعار کو شامل کر لیا جائے تو ان کے چالیس برس کے کل اردو اشعار تیرہ سو سے کسی قدر کم بنتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جو ان کے مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہوئے لیکن رقعات میں چھپ گئے۔ ایسے اشعار بھی ہیں جو نہ رقعات میں چھپے نہ دیوان میں شامل ہوئے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور ۱۸۲۵ء کے بعد سے ان کے کل اردو اشعار تیرہ ساڑھے تیرہ سو سے متجاوز نہیں ہوتے اس دوران میں انہوں نے فارسی کے کئی ہزار اشعار کہے۔ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کے اردو اشعار زیادہ تر اس زمانے کے ہیں جبکہ قلعہ کے ساتھ ان کا رابطہ براہ راست قایم ہو چکا تھا اور بادشاہ کی خاطر سے انہیں اردو میں شعر کہنے پڑتے تھے۔

**انتخاب اشعار نادرست ہے** نسخہ حمیدیہ والے اشعار کا کوئی مجموعہ اگر انتخاب کے وقت غالب یا ان کے دوستوں کے پیش نظر تھا۔ تو سمجھنا چاہئے کہ انتخاب درست نہ تھا اس لئے کہ نسخہ میں بعض ایسی غزلیں موجود ہیں جو تماماً یا جزواً انتخاب میں آنی چاہئیں تھیں مگر نہیں آئیں۔ مثلاً "کھینچیے" والی غزل ؎

دامان دل بہ وہم تماشا نہ کھینچیے — اے مدعی خجالت بے جا نہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر — دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس — کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کھینچیے

---

[1] آب حیات صفحہ ۵۱۷

یا

تماشائے گلشن تمنائے چیدن    بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم
اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی    ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

یا

خود پرستی سے رہے باہمدگر نا آشنا    بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار    سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل نا آشنا

یا

شکوۂ یاران غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

یا

سر پہ مرے وبال ہزار آرزو رہا
یا رب میں کس غریب کا بخت رسیدہ ہوں

یا

اے نوا ساز تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

یا

ہوئی ہیں آب شرم کوشش بیجا سے تدبیریں
عرق ریز تپش ہیں موج کی مانند زنجیریں

بہ ہرحال ان میں سے کوئی شعر "شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا" کے مقابلے میں قابل حذف ورنہ تھا۔

نئے انتخاب کی ضرورت

میرا خیال ہے کہ پورا مجموعہ بغرض انتخاب اشعار غالبؔ یا ان کے دوستوں

کے سامنے نہ تھا۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور صحت نے اجازت دی تو میرا ارادہ ہے کہ غالب کے اچھے اشعار کا ایک نیا مجموعہ مرتب کروں۔ ایسا مجموعہ اس وجہ سے بہ طور خاص ضروری ہے کہ غالب کے بعض ان اشعار کی وجہ سے جن میں فارسیت کا رنگ بہت غالب ہے اور معانی زیادہ قابل ذکر نہیں۔ ان کی عظمت اور ان کے کمال کا مدار حقیقی عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اور "غالبیت" کے غلط تصور نے جو مروجہ اردو دیوان کے عام مطالعہ کا لازمی نتیجہ تھا بہت سے لوگوں کو اس راستے پر لگا دیا ہے جو کم از کم غالب کا مطمح نظر نہ تھا۔

"نسخہ حمیدیہ" کے علاوہ بھی غالب کے بعض اچھے اشعار ملے ہیں جو اب تک ان کے دیوان میں شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً ؎

درد ہو دل میں تو دوا کیجے — دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے — آپ سنتے نہیں تو کیا کیجے
عرض شوخی نشاط عالم ہے — حسن کو اور خود نما کیجے

یا ؎

اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے

یا ؎

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ — لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی — ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ
نہ ہو بہ ہرزہ بدادا رسعی بے ہودہ — کہ دور عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ
ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب — جو جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

---

[1] یہ آٹھوں غیر مطبوعہ اشعار آسی صاحب کی مکمل شرح کلام غالب سے ماخوذ ہیں ۱۲

**اردو مکاتیب کی تعداد**

اردو نثر کے سلسلے میں تمام ضروری تفصیلات باب تصانیف میں پیش کی جا چکی ہیں یہاں صرف ان مکاتیب کی تعداد عرض کر دینا مناسب ہے، مطبع فاروقی کے چھپے ہوئے "اردوے معلّٰی" اور مطبع نولکشور کی چھپی ہوئی عود ہندی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں میں تقریظوں اور نامہ غالب کے علاوہ کل رقعات کی تعداد ۶۱۵ ہے:-

| | |
|---|---|
| اردوے معلّٰی | ۴۷۰ |
| عود ہندی | ۱۴۵ |

ان میں سے کم و بیش ۱۱۷ رقعات مشترک ہیں۔ اردوے معلّٰی کے بعض دوسرے مجموعوں میں چند اور رقعات کا اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں چند نئے رقعات ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کے رسالہ "ہندوستانی" میں چھپے ہیں، چند مزید رقعات بعض رسائل میں طبع ہوئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک صاحب رامپور والے تمام مکاتیب کو جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ ایڈٹ کرکے چھاپنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے معلوم ہوا کہ انہوں نے غالب کے شاگرد فخر الدین حسین سخن کے کسی عزیز کے پاس غالب کے رقعات موسومہ سخن کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جو اب تک شائع نہیں ہوا میں نے اس مجموعہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ اب تک اس کا پتہ نہیں مل سکا۔ مطبوعہ رقعات میں سے زیادہ تر میرزا تفتہ، نواب علاء الدین احمد خاں، منشی شیونرائن، میر مجروح، سرور مارہروی، خواجہ غلام غوث خاں بیخبر، نواب انور الدولہ بہادر شفق، حکیم غلام نجف خاں اور میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہیں۔

مکاتیب اردو کے انداز و اسلوب کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے۔ کہ ایسی سادہ سلیس اور بہار آفریں تحریر کا اردو زبان میں اور کوئی نمونہ موجود نہیں۔ بالخصوص مکاتیب میں تو ایسا انداز آج تک بڑے سے بڑے ادیب بھی پیش نہیں کر سکے۔ کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مباحث اسی ایک انداز میں تمام بر داشتہ لکھتے جاتے ہیں۔ یہ انداز نہ ان سے پہلے کسی کو میسر تھا اور نہ

ان کے بعد کوئی شخص اس کی پوری پیروی کر سکا۔ غالب کے اُردو اشعار کی کافی قدر ہوئی ہے لیکن ان کے اُردو مکاتیب کی اعلیٰ اور بلند حیثیت سے اس وقت تک عام اہل علم پوری طرح آگاہ نہیں۔ میری قطعی رائے ہے کہ غالب کے ان اُردو مکاتیب کی مزاولت نثر نگاری کا جو اچھا اور عمدہ ملکہ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ کسی دوسرے مصنف کی تصانیف کی مزاولت سے پیدا نہیں ہو سکتا لیکن مجموعہ مکاتیب کو بھی از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے جس میں جابجا تشریحات موجود ہوں۔ میں نے اس باب میں بہت سا مواد جمع کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ اس مجموعہ کی ترتیب کے لئے فرصت میسر آ جائے غالب کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے ہیں میں نے قریباً سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دورِ حاضر کے اکثر اکابر اہل علم سے بھی مجھے شرف خط و کتابت حاصل رہا ہے۔ لیکن ایک حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے سوا مجھے کسی بزرگ کے انداز تحریر میں غالب کی دلکش خصوصیات جامعیت کے ساتھ نظر نہیں آئیں۔ حضرت مولانا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرہ علم و فضل غالب کے مقابلے میں بہت وسیع ہے۔

**اچھوتا انداز** غالب کو خود بھی اپنے مکاتیب کے نادر اور اچھوتے انداز و اسلوب کا احساس تھا۔ وہ فرماتے ہیں:-

> میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

یہ چیز صرف اُردو کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ غالب کا عام انداز تحریر یہی تھا۔ وہ پنج آہنگ کے آغاز میں لکھتے ہیں:-

> ہنجار من در نگارش این است کہ چوں کلک و ورق بکف گیرم مکتوب الیہ را بلفظے کہ در خورِ حالت اوست در سر آغاز صفحہ آواز دہم و ہم در سر سخن دعا گردم القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است و پختگان حشو را وقع نہند

**فارسی نثر** فارسی کے کلام نظم و نثر کی نسبت زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

"قاطع برہان"، "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز"، "دستنبو" کا مفصل ذکر باب تصانیف میں آچکا ہے "پنج آہنگ" کے آخری دو حصوں (آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم) کی نسبت اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ آہنگ چہارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور متفرق نثریں ہیں۔ آہنگ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں۔ آہنگ چہارم کی نثروں کی فہرست درج ذیل ہے

(۱) دیباچہ دیوان فارسی۔

(۲) دیباچہ گل رعنا۔

(۳) خاتمہ گل رعنا۔

(۴) مولانا فضل خیرآبادی کے نام خط صنعت تعطیل میں۔

(۵) معتمد الدولہ آغا میر وزیر شاہ اودھ کے نام عرضداشت صنعت تعطیل میں۔

(۶) خاتمہ دیوان فارسی۔

(۷) دیباچہ دیوان اردو

(۸) تقریظ گلشن بیخار مرتبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔

(۹) طلوع صبح اور ہجوم ظلمت شب کے متعلق دو نثریں۔

(۱۰) تقریظ دیوان حافظ۔

(۱۱) دیباچہ دیوان میرزا رحیم الدین بہادر جس کا آخری حصہ صنعت مقطع الحروف میں ہے۔

(۱۲) موارد الکلم فیضی کی تقریظ صنعت تعطیل میں۔

(۱۳) دیباچہ دیوان منشی ہرگوپال تفتہ۔

(۱۴) تقریظ آثار الصنادید سرسید مرحوم۔

(۱۵) دیباچہ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں۔

(۱۶) دیباچہ تذکرہ طلسم زار مجروح۔

(۱۷) تہنیت عطائے خلعت بہ فرمانروائے رام پور۔

(۱۸) تقریظ مجموعہ آثار مرتبہ مولوی مظہر الحق۔

اس فہرست سے ظاہر ہے کہ غالب نے زیادہ تر کتابوں کے دیباچہ، خاتمہ اور تقریظیں لکھی ہیں لیکن سب کا انداز جداگانہ ہے۔ اور کوئی نثر ایسی نہیں ہے جس میں ظہوری کی سہ نثر کی طرح محض خیال آرائی کی گئی ہو۔ اس زمانے میں غیر منقوط یا مقطع الحروف عبارتیں لکھنا کمال نگارش سمجھا جاتا تھا۔ غالب کی نثروں میں اس نگارش کے نمونے بھی موجود ہیں۔

**فارسی مکاتیب** لیکن ان کی نثر فارسی کا صد درجہ دل کش مجموعہ ان کے مکاتیب ہیں جن پر آہنگ پنجم مشتمل ہے۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو چالیس ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے مکاتیب کی طرح فارسی کے مکاتیب کی بھی ایک بڑی تعداد ضائع ہو گئی یا چھپ نہیں سکی۔ اردو کے مکاتیب زیادہ تر غالب کی زندگی کے آخری بیس سال کے ہیں۔ اس سے پہلے وہ عموماً فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ چونکہ کثیر الاحباب اور کثیر الاقارب تھے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ انہوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر سے لے کر پچاس پچپن برس کی عمر تک پینتیس چالیس برس میں محض ایک سو چالیس مکاتیب لکھے۔

**کلیات نظم** کلیات نظم کے آغاز میں قطعات، نوحے اور تاریخیں ہیں۔ پھر ایک مخمس ہے۔ اس کے بعد ترکیب بند، بعد ازاں مثنویاں، قصیدے اور غزلیات اور آخر میں رباعیات ہیں۔ ان کا سرسری اندازہ یہ ہے:-

| قسم نظم | تعداد | اشعار |
|---|---|---|
| قطعات | ۶۷ | ۸۳۴ |
| مخمس | ۱ | دس بند |
| ترکیب بند | ۳ | ۲۳۰ |
| ترجیع بند | ۱ | ۵۶ |
| مثنویاں | ۱۱ | ۲۰۳۲ |

| | | |
|---|---|---|
| غزلیات | ۳۲۸ | ۴۳۸۷ |
| رباعیات | ۱۰۰ | ۲۰۰ |

گویا کلیات فارسی کے کل اشعار کا اندازہ سوا دس ہزار کے قریب ہے۔ "سبد چیں" کے کل اشعار قریباً ساڑھے چھ سو ہیں مثنوی "ابر گہربار" کے ساتھ جو اشعار چھپے اور وہ کسی دوسرے مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے قریباً ایک سو ہیں۔ اس طرح غالب کے فارسی اشعار کا مجموعہ گیارہ ہزار کے قریب ہے لیکن بعض چیزیں ناپید ہیں مثلاً نواب شمس الامرا حیدرآبادی کا قصیدہ بعض اشعار و قطعات و رباعیات نثروں میں آئے ہیں اور کسی مجموعہ نظم میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان سب کو جمع کرنا وقت طلب ہے۔

**قطعات اور ترکیب بند** قطعات متفرق مضامین کے متعلق ہیں مثلاً اپنے اور معاصرین کے درمیان فرق کے متعلق، اوامر الٰہی کی پیروی نہ کرنے کے متعلق، ایک بخیل کے متعلق، ذوق کے متعلق بعض قطعات امرا و حکام کی مدح و تہنیت میں ہیں۔ چند نوحے ہیں۔ ترکیب بند دو ہیں ایک حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے ائمہ رضی اللہ عنہم کی منقبت میں اور دوسرا بہادر شاہ کے صاحبزادے کے مرثیہ میں ترجیع بند بہادر شاہ کی مدح میں ہے اور مخمس حضرت علی کی منقبت میں۔

**مثنویاں** مثنویوں کی کیفیت یہ ہے:-

(۱) بہادر شاہ کی مدح میں موسوم بہ "سرمۂ بینش"

(۲) ایک قصہ موسوم بہ "درد و داغ"

(۳) بنارس کی تعریف میں موسوم بہ "چراغ دیر"۔

(۴) ایک قصہ موسوم بہ "رنگ و بو"

(۵) کلکتہ میں جن لوگوں نے غالب کے خلاف اعتراضات کا ہنگامہ بپا کیا تھا ان کے جواب میں موسوم بہ "باد مخالف"

(۶) تبرکات اور مسئلہ امکان و امتناع نظیر حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مولانا فضل حق

خیرآبادی کی تحریک پر لکھی اور یہ اس سلسلۂ بحث کی ایک کڑی ہے جو مولانا فضل حق خیرآبادی اور شاہ اسماعیل شہید کے درمیان شروع ہوئی تھی۔

(۷) تہنیت نامۂ عید بخدمت بہادر شاہ ثانی

(۸) تہنیت نامۂ عید بخدمت شہزادہ فتح الملک ولی عہد بہادر شاہ

(۹) واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کی نثر موسوم بہ بست و ہفت افسر کا دیباچہ

(۱۰) آئین اکبری مصححہ سرسید احمد خاں کی تقریظ۔

(۱۱) مثنوی "ابر گہربار"

**ابر گہربار**

ان میں سے بعض مثنویوں کی کیفیت اور بعض اشعار کتاب کے مختلف حصوں میں جابجا پیش کیے جا چکے ہیں لیکن آخری مثنوی کے متعلق تھوڑی سی تفصیل ضروری ہے۔ غالب کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے جس کے اشعار گیارہ سو سے زائد ہیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ شاہنامہ کے رنگ میں غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نظم کریں لیکن افسوس کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا وہ اس مثنوی کے صرف مقدمات یعنی حمد و نعت و منقبت، غرض تالیف وغیرہ ہی ختم کر سکے اصل مضمون شروع نہ ہو سکا۔ اس میں صرف معراج کا واقعہ ۲۸۰ اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کے آخر میں غرض تالیف کے متعلق فرماتے ہیں ؎

زباں تازہ سازم زنیروے بخت      بہ ذکر شہنشاہ بے تاج و تخت
گزشت آنکہ دستان سرائے کہن      ز کیخسرو و رستم آرد سخن
منم کم بود در سرا از کلام      شہنشہ پیمبر سپہبد امام
ز فر و سیم بخت انگیز تر      ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر
فرو مردن شمع ساسانیاں      بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج منشور یزدانیم      ز ایمانیاں گویم ایمانیم
کسے را کہ نازد بہ بیگانگاں      خرد در شمارد ز دیوانگاں

بہ اقبال ایمان زنیروئے دیں		سخن راندم از سید المرسلیں

فردوسی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی صحت و درستی میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔
غالب اس مثنوی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

در ضمیرم دوا افتاد پذیرش چناں فرود آمد کہ نعت ذات خداوند دنیا و دیں حضرت امام المرسلین
سلام علیہ من رب العالمین، بہ نگارش اندر آرم۔ توحید و مناجات و منقبت و ساقی نامہ و
مغنی نامہ پیدائی پذیرفت۔ با چنانی و خنیاگر بیا سخنہائے دل آویز و مہر انگیز گفتہ آمد۔ وبشرح
ساقی مطرب خصوصاً
در مناجات بہ شیوہ ابداع بداں ساں رندانہ و قلندرانہ سخن سرودہ شد کہ سروشان بہشتی را لب
از شور ہا یا ہوئے بنجا اندرد۔ و درباره معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ مے رفت ترہم
بدانجا رسید گفتار ناشناساں کہ بہ ترہات فارسی گویان ہند خو گرفتہ اند داں را بہ صلائے گراں
ہمے فروشند وہمے خرند حسن خداداد نطق مرا چوں بینند۔[1]

قصائد

قصائد کی تفصیل یہ ہے:۔

| ممدوح | تعداد قصائد |
|---|---|
| (۱) حمد و نعت و مناقب ائمہ رض | ۱۲ |
| (۲) اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی | ۱ |
| (۳) بہادر شاہ ثانی بادشاہ دہلی | ۱۵ |
| (۴) ملکہ وکٹوریہ | ۳ |
| (۵) لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل | ۱ |
| (۶) لارڈ ایلن برا گورنر جنرل | ۲ |
| (۷) سر چارلس مٹکاف | ۱ |
| (۸) جیمس ٹامسن لفٹننٹ گورنر یو پی | ۱ |

---

[1] مثنوی ابر گہر بار مطبوعہ سنہ ۱۲۸۰ھ صفحہ ۳

| | |
|---|---|
| (۹) پرنسپ صاحب | ۱ |
| (۱۰) ٹامس ماڈک | ۱ |
| (۱۱) ولیم فریزر | ۱ |
| (۱۲) کالون صاحب | ۱ |
| (۱۳) لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل | ۱ |
| (۱۴) ایڈمنسٹن بہادر | ۱ |
| (۱۵) لارڈ کیننگ گورنر جنرل | ۱ |
| (۱۶) سر رابرٹ منٹگمری لفٹننٹ گورنر پنجاب | ۱ |
| (۱۷) شہزادہ فتح الملک | ۲ |
| (۱۸) ابوالفتح | ۱ |
| (۱۹) نصیر الدین حیدر شاہ اودھ | ۱ |
| (۲۰) امجد علی شاہ اودھ | ۱ |
| (۲۱) واجد علی شاہ اودھ | ۳ |
| (۲۲) نواب یوسف علی خاں والی رام پور | ۲ |
| (۲۳) نواب وزیر الدولہ والی ٹونک | ۲ |
| (۲۴) راجہ شیودھیان سنگھ والی الور | ۱ |
| (۲۵) مہاراجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ | ۱ |
| (۲۶) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم | ۱ |
| (۲۷) مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم | ۱ |
| (۲۸) نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر مرحوم | ۱ |
| (۲۹) سر سالار جنگ اول | ۱ |

(۳۰) ایک عام قصیدہ یا نظم جس کا کوئی ممدوح نہیں۔

مثنوی "ابر گہربار" کے ساتھ دو قصیدے ہیں ایک لارڈ ایلجن کی مدح میں اور دوسرا لارڈ لارنس کی مدح میں "سبد چیں" میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور کی مدح میں ہے۔

**قصیدوں کا انداز** غالب نے خود ایک جگہ اپنے قصیدوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بحرف درست ہے فرماتے ہیں:۔

> کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردیں میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ ان کے تمام قصیدوں میں یا تو تشبیبیں بہت اعلیٰ ہیں یا وہ حصے شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے خاص طور پر قابل قدر ہیں جن میں انھوں نے اپنی حالت بیان کی ہے تشبیبوں میں غالب نے اپنی شاعری کے ہر کمال کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اکثر قصائد عرفی اور دوسرے مشاہیر اساتذہ فن کے قصیدوں پر لکھے ہیں اور غالب اگر ان سے آگے نہیں نکلے تو پیچھے بھی نہیں رہے لیکن افسوس کہ نہ غالب کو عرفی اور دوسرے شعرا جیسے قدردان ملے اور نہ زبان فارسی کا وہ ذوق باقی رہا جس سے عرفی اور دوسرے اساتذہ کا کلام صدیوں متمتع ہوتا رہا۔ بلکہ غالب کی وفات کے ساتھ ہی فارسی زبان کا تداول بڑی حد تک ختم ہو گیا۔

**اصلاح اشعار** مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غالب کے طریق اصلاح اشعار کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے۔ وہ اپنے شاگردوں سے صاف لکھا ہوا کلام منگاتے تھے اشعار کا بین السطور اتنا ہوتا تھا کہ اس میں حسب ضرورت اصلاح دی جا سکے عموماً مقصد اصلاح بھی واضح فرما دیتے تھے اور اصل مسودہ مرسل کو واپس کر دیتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کو لکھتے ہیں:۔

دو عنایت نامہ آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیہ پر اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی ہے۔ اور میں عینک کا محتاج نہیں لیکن با ایں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں۔ تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو معلوم ہو جائے۔ آپ خود دیکھیں۔ اس میں اصلاح کہاں دی جائے۔ واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے۔ اس میں بین الافراد و بین المصرعین کا فاصلہ زیادہ چھوڑیئے۔ آپ کے دوسرے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے حروف اس کے روشن ہیں۔ مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھاتا ہوں اور دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا اس سے مقابلہ کرکے معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔

تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

دوسرا پارسل جس کو تم نے بے تکلف خط بنا کر بھیجا نہ اصلاح کی جگہ۔ نہ تحریر سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقوں پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا ایک آدھ ورق زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہرحال اب مجھے تنکے چننے پڑے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:۔

اشعار جناب رند[1] کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔

**سب کے ساتھ یکساں سلوک** ان کے پاس اطراف ملک سے نظمیں اور نثریں (اردو اور فارسی کی) اصلاح کے لیے آتی تھیں سب کو انتہائی توجہ سے دیکھتے تھے سخت تکالیف کے عالم میں

---

[1] جانی بانکی لال رند وکیل مہاراجہ بھرت پور

بھی یہ خدمت انجام دیتے رہتے تھے [illegible]
سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے [illegible]
ہو چکا ہے جس میں فرماتے ہیں کہ [illegible]
نہیں پڑا یا، والی رام پور کی غزلیں بھی [illegible]

**اصلاح سے معذوری** آخری عمر میں بہت معذور [illegible]
تھا کہ اب کوئی صاحب اپنا کلام اصلاح کے لئے [illegible]
میں بھی تبرکاً اصلاح کے لئے [illegible]
کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> بھائی اب میں [illegible]
> اکمل الاخبار اور [illegible]
> اور مجھ [illegible] ملتے ہیں [illegible]
> میں نے چند خطوں کے جواب [illegible]
> کیا۔ اب ہر طرف [illegible]
> آتے ہیں۔ اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

**اصلاح میں دستگاہ** خواجہ حالی حسین مرزا [illegible]
میں (حسین مرزا) اور غالب دیوان خانہ میں بیٹھے تھے [illegible]
غزلیں مانگی ہیں۔ غالب نے چند بار کو ٹھہر لینے [illegible]
میں بندھے ہوئے رکھے ہیں [illegible]
ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے۔ غالب نے [illegible]
پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے [illegible]

---

لہ یادگار غالب صفحہ ۲۳

**انداز شعر خوانی** خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ شعر خوانی کا انداز بڑا دلکش اور موثر تھا۔ خواجہ صاحب نے صرف ایک مرتبہ غالب کو مشاعرہ میں غزل پڑھتے سنا۔ ان کی باری سب کے بعد آئی صبح ہوگئی تھی انہوں نے کہا "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پردرد آواز سے پڑھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے[1]

خواجہ حالی نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے:

> آج حضور نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے خوب ہو"

اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شعر پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

**طریق فکر شعر** فکر شعر کا طریقہ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ

> اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا۔ تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے[2]

ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:-

> کیا ہنسی آتی ہے تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں صرف بحر اور ردیف قافیہ تو دیکھ لیا اور اس

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۵۴ ، [2] یادگار غالب صفحہ ۵۵

زمین میں غزل اور قصیدہ لکھنے لگا...... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔

**مشاعرے** غالب کے فارسی مکاتیب میں چند مشاعروں کا بھی ذکر ہے جن میں انہوں نے شرکت کی۔ اردو مکاتیب میں میری تحقیق کے مطابق صرف ایک جگہ قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر آیا ہے قاضی عبدالجمیل بریلوی نے مشاعرہ قلعہ کا مصرعہ طرح مانگا تھا جواب میں انہیں لکھتے ہیں:۔

> قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع طرحی کر کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے کہ اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔

اس مکتوب پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن بہرحال یہ غدر سے پہلے کا مکتوب ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان تیموریہ کے اوضاع و اطوار اس زمانے میں ایسے ہو گئے تھے۔ کہ ارباب بصیرت کو یقین ہو چکا تھا۔ یہ محفل اب ختم ہونے والی ہے اور اس شمع کی جھلملاہٹ صرف چند دم کی مہمان ہے۔

فارسی مکاتیب میں سے جن میں مشاعروں کا ذکر ہے۔ چار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ہیں اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔

**پہلا مشاعرہ** نواب مصطفیٰ خاں کو لکھتے کہ جمعہ کی شب کو (۲۳ مارچ سنہ درج نہیں[۵]) بزم سخن آراستہ ہوئی میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لیے مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں

---

[۵] میرا خیال ہے کہ یہ ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کا مکتوب ہے اس لیے کہ انہی دنوں میں جیسا کہ آیندہ اقتباسات سے معلوم ہوگا۔ غالب نے "گرستن" والا قصیدہ کہا تھا جو "سید الاخبار" کی ۱۸۴۳ء کی ایک اشاعت میں چھپا تھا۔ "سید الاخبار" کا یہ پرچہ میرے محترم دوست مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی مالک و ایڈیٹر "الامان" و "وحدت" کے پاس ہے اس کا کچھ حصہ "الامان" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

مجھ کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ دونوں شام کو ہاتھی لے کر میرے مکان پر آئے۔ اور مجھے سوار کرا کے لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دل نشین تھے۔ عارف اور جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

صبح شد خیز کہ رو داد اثر بنمائیم
چہرہ آغشتہ بہ خوناب جگر بنمائیم

یہ غزل سنائی۔ آئندہ مشاعرے کے لئے "گریبانم نمے آید" "دامانم نمے آید" طرح ہوئی ہے۔[1]

**دوسرا مشاعرہ** دوسرے مشاعرہ میں بھی غالب شریک ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ اردو کے بہت سے شاعر شریک تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے :-

چوں نوبت بہ من رسید نخست "مالک نخواست" و "فلک نخواست" سرودم۔ آنگاہ غزل طرحی خواندم ؎

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمے آید
بہ نوعے گفت مے آیم کہ مے دانم نمے آید

مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرفی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا ع

صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن ،

غالب لکھتے ہیں :-

دریں زمین طالب آملی۔ قصیدہ دارد و عرفی دو غزل "تا غالب بے نوا را بکدام زمزمہ در خروش آرند[2]

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔

[2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

**تیسرا مشاعرہ** تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آ کر مجھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آئے، حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لے آئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس قصیدہ کو "برات نامقبول" کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور آزردہ کے شعرا کو دردسر نہ دوں لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مشاعرہ میں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالبؔ صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔ اس وقت تک قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے غالبؔ اردو کہتے ہی نہ تھے صرف فارسی کہتے تھے۔

**چوتھا مشاعرہ** چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں میری خاک زمیں گیر ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ اور حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دی تھی۔[2]

**پانچواں مشاعرہ** میر مہدی مجروح والے خط میں قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی شب ۲۵؍فروری (سنہ درج نہیں[3]) کو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں چنانچہ خاندان بابری کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشستگاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے "سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ" نے بادشاہ کی غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان نے اپنی غزل سنائی۔ ان کے بعد میرزا حیدر شکوہ، میرزا

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲ [2] کلیات نثر فارسی ۲۰۲ [3] مشاعرہ غالبؔ قلعہ کے ساتھ تعلق ملازمت پیدا ہو جانے کے بعد ہوا جبکہ ذوقؔ بقید حیات موجود تھے گویا سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۵۴ء کے درمیان کا کوئی مشاعرہ سمجھنا چاہیے

نورالدینؔ و میرزا عالی بخت عالیؔ نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ عالیؔ کے پاس ہی میں (غالب) بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔ صہبائی کے شاگردوں میں سے محویؔ نام ایک نوجوان نے "نشید مستانہ" لگائی۔ میرزا حاجی شہرتؔ نے کم و بیش ستر شعر زمین طرحی میں سنائے میں پیشاب کے بہانے سے وہاں سے اٹھا۔ اور اپنے گھر چلا آیا۔ دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی اور سو رہا۔ صبح قلعہ میں گیا تو وہ چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں جمع تھے انہوں نے رات والی غزلیں پھر سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی۔ وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں سلطان الشعراؔ (ذوق) نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں[1]۔

غالبؔ کی شاعری کے متعلق محولہ بالا بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) انہوں نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ ابتدا اردو سے ہوئی تھی۔ دس بارہ برس میں خیالی مضامین کا ایک دیوان تیار کر لیا تھا جب اچھائی برائی کی تمیز پیدا ہوئی تو اکثر اشعار حذف کر ڈالے۔ صرف چند اشعار بطور نمونہ موجود رہے۔

(۲) فارسی بھی اردو کے بعد ہی شروع کر دی تھی اور کم و بیش بیس برس کی عمر تک دونوں کی مشق بیک وقت جاری رہی۔

(۳) اس کے بعد فارسی کی طرف زیادہ توجہ ہوتی گئی اور اردو کی طرف سے دل ہٹتا گیا تا آنکہ وہ سنہ ۱۸۲۵ء سے لے کر سنہ ۱۸۵۰ء تک اردو کے بجائے حقیقۃً فارسی کے شاعر سمجھے جاتے رہے۔

(۴) قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے کے بعد بہ پاس خاطر شاہ انہوں نے پھر اردو پر توجہ مبذول کی ان کے مروجہ دیوان کی زیادہ تر اچھی غزلیں اسی

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۳۸

دور کی کہی ہوتی ہیں ۔

(۵) نظم ونثر کا سلسلہ یوں تو ان کے آخری دم تک قایم رہا لیکن ان کی اردو و فارسی نظم ونثر کی بہترین چیزیں وہ ہیں جو سنہ ۱۸۲۵ء سے لے کر قریباً سنہ ۱۸۶۵ء تک لکھی یا کہی گئیں ۔ سنہ ۱۸۲۵ عیسوی سے قبل وہ ناپختہ تھے اور سنہ ۱۸۶۵ء کے بعد ان کے دماغی قویٰ شدید انحطاط کی زد میں آگئے تھے ۔